دیوی کی حکومت
ایم۔ اے راحت

دیوی کی حکومت

پہاڑی ریاست ازبورا کا حکمران اپنی عادات و خصائل کے لحاظ سے عجیب انسان تھا کوئی شخص یہ دعوی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ تیمور کو مکمل طور سے جانتا ہے۔ ازبورا کا ازلی دشمن بالوش قوت میں ہاتھی اور سیاست میں لومڑی کہلاتا تھا۔ اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ اس نے اپنے سے کئی گنا زیادہ طاقتور ازبورا کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی اور اس کے حکمران نقیل کو پہاڑوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ نقیل پہاڑوں میں بھٹکتا رہا۔ البتہ اس نے شروع ہی میں ایک عقلمندی کی تھی وہ یہ کہ اس نے اپنے بیٹے تیمور کو مہذب دنیا کے رہنے والے کسی دوست کے سپرد کر دیا تھا اور اس سے درخواست کی تھی کہ وہ اسے تیمور کی حیثیت سے پرورش کرے اور اس کے ذہن میں اس کے وطن کی یاد تازہ رکھے۔ اس کے عوض نقیل نے اپنے دوست کو قیمتی ہیروں کی اتنی تعداد دی تھی کہ اس کی پشتیں بھی عیش کریں۔

اور اس مہذب دوست نے بھی عہد نبھایا تھا۔ بیس سال تک اس نے تیمور کو اپنے پاس رکھا اور پھر اسے پہاڑیوں میں لے آیا جہاں نقیل زندگی اور موت کی کشمکش کے آخری ایام گزار رہا تھا۔ بیٹے کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ اس کی صفات جان کر اور خوش ہوا اور مرتے وقت اپنی آخری خواہش کا اظہار کیا۔ "میں چاہتا ہوں تیمور کہ تو بالوش کو شکست دے کر ازبورا کو واپس لے لے۔

"ایسا ہی ہو گا باپ۔ ایسا ہی ہو گا۔" تیمور نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ لیکن اس کے ہاتھ کے لمس نے جو اسکے باپ کے بازو پر تھا نقیل کو کوئی ایسا پیغام دیا کہ وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔

جس شخص کے ہاں نقیل زندگی کے آخری ایام گزار رہا تھا وہ ایک چرواہا تھا۔ جس کی اپنی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا کہ تیمور نے کس طرح بالوش کو زچ کر دیا۔ وہ بے سرو سامانی کی حالت میں جنگ کی تیاریاں کرتا رہا لیکن یہ جنگ انوکھی تھی۔ تیمور نے بالوش کی نوکری اختیار کر لی تھی۔ وہ مہم جو تھا اور خطرناک سے خطرناک کام اس طرح انجام دیتا تھا کہ بالوش کی سمجھ میں ہی نہ آتے۔ یہاں تک کہ بالوش اس سے اپنی بیٹی کی شادی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ داماد بن کر تیمور نے سب سے پہلے بالوش کے دل سے یہ غلط فہمی دور کی کہ وہ اس کا دوست ہے اس نے بالوش کو اس طرح شکنجے میں کسا کہ بالوش بے بس ہو کر رہ گیا حکومت اس کی تھی لیکن احکامات تیمور کے اپنے تھے اور بالوش ان احکامات کے سامنے خود کو بے بس پاتا تھا۔ تیمور نے اپنی سازش سے بالوش کو اس قدر زچ کر دیا کہ بالوش دنیا سے بڑا ہی بیزار ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس کی آخری کوشش بھی بار آور ہوئی یعنی اس کی بیوی سولا بھی اپنے باپ کے سخت خلاف ہو گئی۔

تب ایک دن تیمور نے اسے پیش کش کی کہ جنگل میں چل کر گفتگو کی جائے اور آخری فیصلہ کر لیا جائے۔

"مرتے ہوئے میرے باپ نے ایک ہدایت کی تھی۔ بالوش"

"یہ کہ بالوش کو شکست دے کر ازبوارا کی حکومت واپس لی جائے۔" "کیا"؟

"میں نہیں سمجھا تیمور۔"

"تم نے آج تک میرے باپ کا نام نہیں پوچھا بالوش۔ آخر کیوں۔" تیمور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔"

"بعض اوقات انسان کوئی ایسی غلطی کر جاتا ہے جو بظاہر کوئی اہمیت نہیں رکھتی لیکن اس کے نتائج اتنے سنگین نکلتے ہیں کہ وہی غلطی اس کی گردن میں پھندا

بن جاتی ہے۔"

"آج تیری باتیں عجیب ہیں تیمور۔"

"ہاں اس کی وجہ ہے۔"

"اس موقع کی تلاش مجھے طویل عرصہ سے تھی بالوش۔ جب تو اور میں کسی تنہا مقام پر ہوں اور دور دور تک کوئی نہ ہو۔ بڑی آرزو تھی بالوش"

"تیمور۔ تیمور۔ تو کیا کہنا چاہتا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔"

"ہاں بالوش۔ میں اس بنیادی غلطی کا تذکرہ کر رہا تھا جو تو نے مجھ سے میرے باپ کا نام نہ پوچھ کر کی۔" تیمور نے شکاری کے انداز میں کہا۔

"تو نے اس وقت بہت سی باتیں کہی ہیں ایسی باتیں جو کسی طور میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ مثلاً تو نے کہا کہ تیرے باپ نے تجھے ہدایت کی تھی کہ ازبورا کی حکومت بالوش سے جنگ کر کے حاصل کر لی جائے۔ بلکہ واپس حاصل کر لی جائے۔"

"ہاں میں نے کہا تھا۔؟"

"اس کے علاوہ بھی تو نے۔"

"تیرے تمام سوالات کا جواب ازبورا کا حکمران نقیل ہے۔ نقیل جو میرا باپ تھا۔ ہاں بالوش میں نقیل کا بیٹا تیمور ہوں جسے اس نے تیرے ظلم سے محفوظ رکھنے کے لئے مہذب دنیا میں بھجوا دیا تھا اور وہاں پر بیس سال رہنے کے بعد اس وقت واپس پہنچا جب میرا باپ دم توڑ رہا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا اور دیکھ لے آج تیری حکومت پر میرا قبضہ ہے۔ بالوش جنگیں مختلف نوعیت کی ہوتی ہیں۔ میرے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ میں جنگی سامان اور آدمی حاصل کر کے تجھ پر حملہ کرتا اور تجھے شکست دیتا چنانچہ یہ جنگ میں نے اپنی عقل کے ذریعہ کی۔ اور آج آخری دن ہے۔ میں چاہتا ہوں بالوش تو کھلے دل سے مجھ سے جنگ کر اور اس کے بعد فتح و شکست کا فیصلہ ہو۔"

اتنی دیر میں بالوش سنبھل گیا۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی

تھیں۔ "تو۔ تو نقیبل کا بیٹا ہے۔"؟ اس نے تلوار سونتتے ہوئے کہا۔

"ہاں میرے سسر محترم۔" تیمور نے مسکراتے ہوئے کہا اور اپنی تلوار نکال لی۔ لیکن بالوش کے فرشتے بھی اس بات سے واقف نہیں تھے کہ تیمور نے کہاں سے تربیت حاصل کی اور اس کی قوت و صلاحیت کس قدر ہے جتنے داؤ تھے سب اجنبی تھے جنگلوں میں اس قدر جدید داؤ کوئی نہیں جانتا تھا اور سب کے سب جان لیوا۔ بالوش کو اپنے تجربے پر شرم آنے لگی۔ لیکن اس کا مقابل اس کی بے بسی پر ترس کھانے کے لئے اسے یہاں نہیں لایا تھا۔ چنانچہ تھوڑی دیر تک چوہے بلی کا کھیل جاری رہا اور اس کے بعد تیمور نے بالوش کو قتل کر دیا۔

علاقے میں ایک نئی حکومت کی داغ بیل پڑی۔ تیمور کی فراست نے جہاں بیشمار مسائل حل کئے وہاں اس کے بے شمار دشمن بھی بنا دیئے جو اس کی عقل سے جلتے تھے۔ لیکن تیمور ان سب پر حاوی تھا۔ اس نے کسی دشمن کی نہ چلنے دی اور ایک پر سکون حکومت قائم کر لی۔

اور اس کے بعد اس کا دیرینہ شوق ابھر آیا۔ یعنی شکار مہم جوئی۔ وہ مہینوں جنگلوں میں مارا مارا پھرتا۔ عیش کدوں کی راحت اسے ایک آنکھ نہ بھاتی۔ نرم غالیچے اور آرام دہ مسہری کی بہ نسبت اسے جنگل کا وحشت خیز ماحول پسند تھا۔ وہ اپنے وفاداروں کو ساتھ لے کر عموماً ایسے علاقوں کی جانب نکل جاتا جہاں عام انسانی قدم نہیں پہنچے تھے۔

اور ان دنوں بھی وہ ایسے ہی ایک علاقے میں تھا جو اس کی سرحدوں سے بہت دور تھا یہ ایسی جگہ تھی جو کسی ریاست کے تحت نہیں آتی تھی اور جہاں اصل راج صحرائی لٹیروں کا تھا۔ اس وقت اس کے غلام سالم جنگلی بکرے سلاخوں پر بھون رہے تھے اور گوشت کی بو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ جب جنگل سے پر سکوت سناٹے میں ایک فائر کی آواز گونجی۔

پرندوں کی چیخیں ماحول کو زخمی کرنے لگیں ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ

دیر تک گونجتی رہی۔ اور تیمور کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے تعجب سے اپنے نزدیک کھڑے ہوئے ازبیگ کو دیکھا۔ اور بولا۔ "ازبیگ کیا اس ویرانے میں ہمارے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔"؟

"دن میں تو کسی کو نہیں دیکھا آقا۔"! ازبیگ نے کہا۔

"لیکن یہ..." تیمور نے کہنا چاہا لیکن زبان خود بخود رک گئی۔ اب تو باقاعدہ فائرنگ ہونے لگی تھی۔ گولیاں زور و شور سے چل رہی تھیں۔ "آقا یوں لگتا ہے جیسے کسی بدنصیب قافلے کو صحرائی لٹیروں نے گھیر لیا ہے۔"

ممکن ہے آقا۔ یہ علاقہ لٹیروں کا ہو۔ ازبیگ نے جواب دیا۔ "آؤ ازبیگ۔ پریشان حال لوگوں کی مدد کریں۔" تیمور نے فطری جذبے سے مغلوب ہو کر کہا جلنے والے جانوروں کے نیچے سلگتی آگ بجھا دی گئی۔ گھوڑے تیار ہو گئے اور تیمور رائفل اور کارتوسوں کی پیٹی لئے باہر نکل آیا۔ پھر اس نے گھوڑے پر چھلانگ لگا دی اور دوسرے لمحے اس کا گھوڑا ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔

تیمور کے غلام اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ ان کے گھوڑے تیمور کے گھوڑے کے نزدیک رہنے کی کوشش کر رہے تھے وہ جانتے تھے کہ ان کا آقا جب جنگ کا ارادہ کر لیتا ہے تو بھول جاتا ہے کہ اس کا مقابلہ کتنے افراد سے ہو سکتا ہے۔ بس وہ دیوانہ وار جنگ میں کود پڑتا ہے۔

اس وقت بھی یہی ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی انھوں نے وہ روشنیاں دیکھ لیں جو خیموں میں ہو رہی تھیں وہاں شعلے بھی نظر آ رہے تھے۔ تیمور نے دیوانہ وار فائرنگ شروع کر دی۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ اور اندازہ لگا کر لٹیروں کو بھوننا شروع کر دیا۔ خونخوار لٹیروں کو بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ کوئی بڑی پارٹی مقابل آ گئی ہے چنانچہ انہوں نے پسپائی اختیار کی اور ذرا سی دیر میں اپنی پوزیشن چھوڑ کر بھاگ گئے۔

تیمور کو جب لٹیروں کے فرار کا یقین ہو گیا تو گھوڑے سے اتر آیا۔ وہ

دوڑتا ہوا خیموں کی جانب لپکا تھا اور پھر جو خیمہ اسے نظر آیا وہ اسی میں داخل ہو گیا۔ خیمے میں تباہ کاری کے آثار نظر آ رہے تھے۔ درمیان میں ایک شخص اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ خیمہ سنسان تھا۔ اس نے ایک نگاہ خیمہ پر ڈالی۔ اور اوندھے پڑے ہوئے شخص پر جھکا۔ اور اسی وقت اسے ایک چھینک کی آواز سنائی دی۔ تیمور اچھل پڑا یہ بچگانہ آواز تھی۔ خیمے کے ایک سرے پر پڑے ہوئے پردے کے نیچے اسے کچھ نظر آیا اور اس نے کمر میں اڑسا پستول نکال لیا۔

"باہر آؤ۔" اس کی کرخت آواز ابھری۔ اور دوسرے لمحے ایک خوصورت بچی باہر نکل آئی۔ دودھ جیسی۔ ہری آنکھوں والی گڑیا۔ تیمور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ بچی سفید نسل سے تعلق رکھتی تھی۔

"اور کون ہے تمہارے ساتھ۔" تیمور نے پوچھا۔

"میلی ممی۔" بچی نے معصومیت سے جواب دیا۔

"انہیں بھی بلاؤ۔"

"آجاؤ ممی۔" بچی نے اطمینان سے کہا

"باہر آ جاؤ۔ میں نے ان لٹیروں کو بھگا دیا ہے۔" تیمور نے کہا اور ایک خوبصورت عورت پردے کے عقب سے باہر آ گئی۔ اس کا بدن کانپ رہا تھا۔ تیمور نے اسے دیکھا اور پھر بچی سے بولا۔ "بیٹی اپنی ممی سے کہو کہ پریشان نہ ہوں میں دشمن نہیں ہوں۔"

"ہاں۔ تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو۔ وہ تو۔ وہ تو عجیب تھے۔"

"یہ کون ہے۔"؟ تیمور نے اوندھے پڑے شخص کی طرف اشارہ کیا۔ اور عورت جیسے کسی خواب سے چونک پڑی۔ پھر اس کے حلق سے ایک دلخراش آواز نکلی۔

"آہ۔ گوئین گوئین۔ آہ" وہ اوندھے پڑے شخص سے لپٹ گئی وہ بری طرح سسکیاں لے رہی تھی۔

"میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا خاتون۔ ٹھہرو مجھے دیکھنے دو۔" تیمور نے کہا اور خود اس شخص کو پلٹ دیا۔ ایک سفید فام تھا۔ خوبصورت خدوخال کا مالک۔ لیکن اس کے بازو پر زخم تھا۔ باقی بدن صاف تھا۔ وہ زندہ تھا۔

"آہ میرا گوئین۔" عورت نے پھر کہا۔

"بس بس۔ جب وہ ہوش میں آئے گا تو میں اسے بتا دوں گا کہ تمہاری بیوی تمہارے لئے کس قدر سسک رہی تھی۔ فی الوقت اسے طبی امداد کی ضرورت ہے۔ میں اسے اپنے خیمے میں لے جا رہا ہوں تاکہ اس کے بازو کے زخم کی دیکھ بھال کر سکوں۔ اور سنو۔ تم میرے آدمیوں کے ساتھ اپنی بچی کو لے کر آ جاؤ۔ اب تم یہاں محفوظ نہیں ہو۔"

تیمور نے زخمی شخص کو اٹھایا اور خیمے سے باہر نکل آیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ سب تیمور کے کیمپ پہنچ گئے۔

تیمور کے چند ساتھی رائفلیں لئے ہوئے ٹہل رہے تھے۔ تیمور نے زخمی گوئین کو گھوڑے سے نیچے اتارا اور پھر وہ اسے اسی طرح کندھے پر ڈالے اندر داخل ہو گیا۔ چند ہی ساعت کے بعد عورت لڑکی کو شانے پر لگائے اس کے نزدیک پہنچ گئی۔

"کیا میرے شوہر کا زخم خطرناک ہے۔"؟ اس نے پوچھا

"شانہ زخمی ہے۔ گولی اگر باہر نکل گئی ہے تو میں بینڈیج کر دوں گا۔ اور اگر گولی اندر موجود ہے تو نکالنا پڑے گی۔"

"کوئی خطرہ تو نہیں ہے۔؟"

"شائد نہیں" تیمور نے سرد لہجے میں کہا اور پھر نوجوان کا زخم دیکھنے لگا پھر بولا۔ "گولی اندر ہے تم میرے خیمے سے جاؤ"

"میں۔ میں یہیں رہوں گی۔"

"کیا میں آدم خور ہوں اسے کھا جاؤں گا؟"

"خدا کے لئے مجھے یہیں رہنے دو۔ میں مین۔" عورت نے التجا آمیز لہجے
میں کہا۔ اور تیمور نے اپنے ایک خادم کو آواز دی۔ پھر وہ اندر آگیا تو بولا۔
"خنجر سرخ کر لاؤ۔ تھوڑی دیر کے بعد تیمور اس کے زخم سے گولی نکال
رہا تھا تو جوان کی چیخیں آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔ عورت نے آنکھوں پر ہاتھ
رکھ لئے تھے اور بچی رو رہی تھی۔ لیکن پھر نوجوان پر سکون ہو گیا اب وہ ہوش میں
تھا۔

غلاموں نے پھر گوشت بھوننے کا کام شروع کر دیا تھا اور گوشت کی چراند
دور دور تک پھیل رہی تھی۔

"تم کون ہو میرے دوست۔" گوئین نے پوچھا۔

"تیمور ہے میرا نام۔ ان اطراف میں شکار کھیل رہا تھا۔ تم اپنے بارے
میں بتاؤ۔

"میرا نام میکلن گوئین ہے۔ سیر و شکار کا شوقین ہوں۔ مہم جوئی کا شوق
مجھے یہاں لے آیا۔ میری بیوی سیلی براؤن یا سیلی گوئین اور وہ میری بچی نوشین۔
ہاتھیوں کے ایک غول نے ہمیں ان اطراف میں پہنچا دیا۔ بڑی مشکل سے ہم ان
سے جان بچا سکے تھے لیکن راستہ بھٹک گئے۔ ہم راستے کی تلاش میں تھے۔ لیکن۔
آج سر شام ہی سے ہمیں احساس ہوا کہ جنگل میں ہمارے علاوہ بھی کوئی ہے۔ اور
وہی ہوا۔ انہوں نے حملہ کر دیا لیکن وہ عجیب تھے۔"

"کیوں عجیب کیوں۔"؟

"ان کی شکلیں۔ میں نے ان میں سے چند کو قریب سے دیکھا تھا۔"

"کیا وہ سیاہ فام تھے۔"؟

"ہاں۔ لیکن ان کے گلے میں چھوٹی چھوٹی کھوپڑیوں کی مالائیں پڑی ہوئی
تھیں۔"؟

"اوہ۔ تو کیا وہ لٹیرے نہیں تھے۔"؟

"لٹیرے۔"

"ہاں۔ صحرائی لٹیرے"

"میں نہیں جانتا۔ بہر حال ہم نے ان سے مقابلہ کیا لیکن وہ بھاری
پڑے۔ اور پھر اگر تم نہ آجاتے تو۔ نہ جانے۔ نہ جانے کیا ہو جاتا۔ کیا میرے
ساتھیوں میں سے۔"؟

"میرا خیال ہے وہاں کوئی زندہ نہیں تھا۔"

"افسوس۔ گوئین نے سر جھکا لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد تیمور کے لئے
گوشت آگیا اور اس نے ان لوگوں سے بھی کھانے کے لئے کہا۔

"نہیں ہم کھانے وغیرہ سے فارغ ہو چکے تھے۔"

"میں نہیں ہوا تھا اس لئے معذرت خواہ ہوں۔" تیمور نے کہا اور کھانے
میں مصروف ہو گیا۔ نوجوان اب کسی قدر تعجب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ تیمور کھانے
کے دوران کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر اس نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

"لیکن صحرائی لیٹرے۔ ان کا طریقہ کار دوسرا ہوتا ہے۔ وہ جنگ نہیں
کرتے۔ بلکہ رات کو اس وقت آتے ہیں جب لوگ نیند میں ڈوبے ہوتے ہیں لوٹ
مار کرتے ہیں اور بھاگ جاتے ہیں۔ اگر کوئی ایسی بات اندرونی علاقے کے قبائلیوں
کی ہو وہ آخری فیصلہ کرنے سے پہلے نہیں جاتے۔ بہر حال کوئی حرج نہیں ہے۔ ہاں
کیا تمہاری چلائی ہوئی گولیاں سبھی کارگر ہوئی تھیں۔"؟

"ہاں وہاں تمہیں بہت سی لاشیں ملیں گی۔"

"صبح کو تمہارے کیمپ چلیں گے پھر دیکھیں گے کہ وہ کون ہیں اور اب تم
اسی خیمے میں آرام کرو۔ یہاں تم محفوظ ہو۔ کیونکہ۔ یہ تیمور کا خیمہ ہے۔" تیمور
مسکرایا اور پھر وہ خیمے سے باہر نکل آیا۔ "خیال رکھنا۔ وہ رات کی تاریکی میں پلٹ
بھی سکتے ہیں۔" اس نے اپنے آدمیوں کو ہدایت کی اور اپنے خیمے میں چلا گیا۔

دوسری صبح بے حد خوشگوار تھی۔ تپتے ہوئے صحرا میں اگر سیاہ بادل آجائیں تو

صحراؤں کی تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ بوندا باندی کا امکان تھا۔ تیمور کی خوشگوار چنگھاڑوں نے ہی گوئین اور اس کی بیوی کو جگایا تھا۔

"اب کیسے ہو ڈارلنگ" سیلی نے شوہر سے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک۔ زخم میں بھی نہیں۔" گوئین ہنس کر بولا۔

"تم ہنس رہے ہو۔ مجھے ان بیچاروں کے مارے جانے کا غم ہے۔ وہ سب ہماری وجہ سے مارے گئے۔" سیلی نے غمزدہ لہجے میں کہا۔

"جو ہو جائے اس کا دکھ بے مقصد ہے سیلی۔"

"نجانے تمہاری فطرت کیسی ہے۔" سیلی نے منہ بنا کر کہا

"اوہ دیکھو۔ جنگلی شیر دہاڑ رہا ہے۔ انوکھا انسان ہے۔ انگریزی زبان اہل زبان کی بولتا ہے لیکن اپنے بارے میں اس نے کوئی تفصیل نہیں بتائی۔"

"ہاں واقعی ہمدرد اور سملنڈرا انسان" سیلی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور گوئین خیمے سے باہر نکل آیا۔ تیمور سامنے ہی موجود تھا۔ اسے دیکھ کر ہنس پڑا۔

"آؤ۔ ڈیئر گوئین۔ دیکھو میرے دوست۔ سورج کی پہلی کرن میرے پیٹ سے ہی طلوع ہوتی ہے۔ سورج نکلنے سے پہلے جاگ جاتا ہوں اور جاگنے کے بعد اگر کوئی وزنی شے میرے معدے میں نہ اتر جائے تو۔ پھر سورج طلوع نہیں ہوتا۔ ویسے آج کا موسم تمہارے نام کا ہے۔"

"اوہ واقعی موسم بہت خوبصورت ہے۔ لیکن میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکا تیمور۔"

"ناشتہ تم اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ کرو گے۔ کیونکہ میں کر چکا ہوں۔ اور ہاں تمہاری کیا حالت ہے۔"

"ٹھیک ہوں۔"

"مہم جو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ناشتہ کے بعد ہم لٹیروں کی لاشیں دیکھنے چلیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" گوئین نے کہا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد وہ سیلی کے ساتھ ناشتہ کر رہا تھا۔ اس سے فارغ ہو کر وہ باہر نکل آیا۔ باہر گھوڑے تیار تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد چند افراد اس طرف نکل پڑے جہاں رات کو ایک خونی ڈرامہ ہوا تھا۔

"میں تمہارے بارے میں حیران ہوں۔" گوئین نے کہا۔

"کیوں۔"؟ "تم اس علاقے کے باشندے ہونے کے باوجود اس قدر مہذب اور ہمدرد ہو۔ اور پھر ہماری زبان ہماری طرح بولتے ہو۔ کہیں بھی تو میں نے تمہارے لہجے میں فرق محسوس نہیں کیا۔"

"میری کہانی سننا چاہتے ہو۔"؟

"ہاں۔"

"تو سیدھی بات کہو۔ میں نے بیس سال تم لوگوں کے درمیان گزارے ہیں۔"

"کیا مطلب۔"؟

"جو کہا ہے اس کا مطلب ہے میں نے ایک مغربی ممالک میں پرورش پائی ہے اور اب ایک چھوٹی سی ریاست کا حکمران ہوں۔"

"اوہ۔" گوئین نے آہستہ سے کہا۔ اسے یہ سن کر حیرت ہوئی تھی کہ اس کا دوست کوئی معمولی آدمی نہیں ہے بلکہ کسی ریاست کا حکمران ہے' چند ساعت خاموش رہنے کے بعد اس نے پوچھا۔

"لیکن آپ کی ریاست کا نام کیا ہے۔"؟

"ازبورا۔ اس علاقے کی سب سے بڑی ریاست ہے۔ تیمور نے جواب دیا اور گوئین نے گردن ہلا دی۔

"خوب تو آپ یہاں سیر و شکار کو آئے ہوئے تھے۔"

"ہاں یہ میرا بچپن کا مشغلہ ہے۔" تیمور نے جواب دیا۔

"لیکن آپ نے غیر ممالک میں وقت کیوں گزارا۔؟"

"غلطی کی۔" تیمور مسکرایا؟

"نہیں میرا مطلب یہ نہیں ہے۔"

"تو پھر آپ مطلب بتانا پسند کریں گے۔" تیمور نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"میرا مطلب ہے کہ آپ کو مہذب دنیا میں بیس سال گزارنے کی ضرورت کیوں پیش آئی' کس مقصد کے تحت آپ وہاں گئے تھے جبکہ آپ کا تعلق ان علاقوں سے ہے۔"

"لمبی کہانی ہے میرے دوست اور تم بڑے چالاک۔ پوچھے بغیر باز نہیں آؤ گے صرف اتنی سی بات ہے کہ ریاستی دشمنیاں بعض اوقات مصیبت بن جاتی ہے۔ میرا باپ بھی ایک ایسی ہی دشمنی کا شکار ہو گیا تھا' اس نے میری حفاظت کے لئے مجھے مہذب دنیا میں پہنچا دیا اور وہاں میں نے ایک طویل زندگی گزاری۔ اس کے بعد واپس آکر اپنے باپ کی کھوئی ہوئی ریاست حاصل کر لی۔"

"اوہ' اس کا مقصد ہے کہ آپ کی زندگی تو خاص مہماتی رہی ہے۔ گوئین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں یوں تو زندگی بذات خود ایک مہم ہے۔" تیمور نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ ان خیموں کے نزدیک پہنچ گئے جہاں رات کو ایک خوفناک ہنگامہ ہوا تھا' خیموں کے نزدیک گوئین کے ساتھیوں کی لاشیں پڑیں ہوئی تھیں' ان لاشوں کے علاوہ وہاں اور کچھ نہیں تھا جسے گوئین نے انتہائی حیرانی سے دیکھا' تیمور خود بھی چاروں طرف چکر لگا لگا کر کچھ مخصوص نشانات دیکھ رہا تھا۔ تب اس نے پر خیال انداز میں کہا۔

"تعجب کی بات ہے' اگر وہ تمہاری گولیوں سے نہیں ہلاک ہوئے۔ تب بھی ہماری کوششوں نے ان میں سے کسی نہ کسی کو ختم ضرور کر دیا ہو گا لیکن ان میں سے ایک کی بھی لاش موجود نہیں ہے۔"

"نہیں مسٹر تیمور یہ بات نہیں ہے' میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ان میں سے کئی کو تو میں نے ہلاک کیا تھا۔ میں نے ان کے جسموں پر انتہائی کامیابی سے نشانے لگائے تھے اور آپ سبھی میرا نشانہ دیکھ سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے میرا نشانہ خالی نہیں جاتا۔"

"لیکن لاشیں۔"

"ممکن ہے رات کے آخری ایام میں وہ اپنی لاشیں اٹھا کر لے گئے ہوں۔" گوئین نے کہا۔

"ہاں یہ ممکن ہے لیکن نجانے کیوں ایسا نہیں ہونا چاہیئے تھا۔" تیمور کے انداز میں ایک عجیب سی کیفیت تھی۔

"پھر اب۔"

"ہونہہ جہنم میں جائیں۔ مجھے ان لوگوں کی لاشوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے اور نہ ہی اس لوٹے ہوئے سامان سے جواب میرا نہیں رہا ہے' بس میں تو یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ آخر وہ کون ہیں اس کے علاوہ مسٹر تیمور مجھے سب سے بڑی خوشی اس بات کی ہے کہ مجھے آپ مل گئے۔ کم از کم آپ لوگوں کی وجہ سے میں اب اپنی منزل تک تو پہنچ جاؤں گا۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" تیمور نے کہا اور پھر وہ کچھ سوچتا رہا۔

لیکن ایک بات پھر جانوروں کی خطرناک آوازوں سے پہاڑوں کا یہ ویرانہ گونج اٹھا۔ وہ سب بری طرح چونک پڑے۔ تیمور کسی وحشی ہرن کی طرح کھڑا ہو گیا تھا اور دوسرے لمحے اس نے اتنی لمبی چھلانگ لگائی تھی کہ گوئین حیران رہ گیا تھا' اتنی لمبی چھلانگ لگا کر گھوڑے کی پشت تک پہنچ جانا گھڑ سوار ہی کا کمال تھا۔ بہر صورت گوئین بھی اپنے زخمی ہاتھ کے باوجود گھوڑے پر چڑھ گیا۔ اس کے انداز میں کچھ بدحواسی پیدا ہو گئی تھی اور پھر دوسرے لمحے وہ برق رفتاری سے واپس کیمپ کی طرف جا رہے تھے۔

فائرنگ کی آوازیں خاصی تیز تھیں اور مزید تیز ہوتی جا رہی تھیں جس کا

مقصد تھا کہ دوسری طرف ایک باقاعدہ جھگڑا شروع ہو گیا تھا۔ گوئین اپنا گھوڑا برق رفتاری سے دوڑاتا ہوا تیمور کے گھوڑے کی پشت پر ہاتھ مارتا ہوا بولا۔

"کیا خیال ہے مسٹر تیمور۔"

"اوہ اس وقت خیال نہیں پوچھا جاتا ڈیئر گوئین۔"

"لیکن وہ۔ وہ ہمارے ہی۔"

"ہاں ممکن ہے' لٹیرے ہماری تاک میں ہوں۔" تیمور نے جواب دیا اور گھوڑے کی رفتار تیز کر دی۔ دور سے انہیں اپنا کیمپ نظر آ رہا تھا۔۔۔۔

سیلی نے پانی کے بھیگے ہوئے رومال سے نوشین کا چہرہ اور گردن صاف کی۔ گو اس خیمے میں غسل کا انتظام بھی تھا۔ لیکن موجودہ حالات کی بناہ پر وہ ان چکروں میں نہیں پڑ سکتی تھی۔ نوشین کے لباس وغیرہ سب خیمے میں رہ گئے تھا۔ کاش گوئین سے اس سامان کے بارے میں کہہ دیتی جو بچ گیا تھا۔

"ممی۔" نوشین نے اسے مخاطب کیا۔

"ہاں ڈارلنگ۔"

"ممی ہم اپنے گھر کب چلیں گے۔"؟

"بس بہت جلد بیٹے۔"

"مجھے یہاں بہت ڈر لگتا ہے۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"تمہارے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے نوشین۔ ہمارے شوق نے تمہاری معصومیت کی بھی پرواہ نہیں کی۔ کاش ہم یہاں نہ آتے۔"

"زیادتی کیا ہے ممی۔"

"کچھ نہیں بیٹے۔ بس ہم بہت جلد یہاں سے چلیں گے۔"

"ہاں ممی۔ جلدی چلیں مجھے اپنی دوست ۔" نوشین نے کہا لیکن اس کی زبان بند ہو گئی۔ باہر سے دو چیخیں بیک وقت ابھری تھیں۔ سیلی کے چہرے پر ایک بار پھر خوف کے آثار پھیل گئے۔ اس نے نوشین کو گود میں بھینچ لیا۔

"کیا بات ہے ممی۔"؟ نوشین نے بدستور معصومیت سے پوچھا۔ لیکن سیلی کی زبان بند ہو چکی تھی۔ وہ متوحش سی نوشین کو سینے سے چپکائے خیمے کے دروازے پر آ گئی۔ لیکن باہر کا منظر عجیب تھا۔

ان کے بدن سیاہ تھے ان پر جگہ جگہ رنگین مٹی سے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ ایک نیم درندے کی شکل میں وہ عجیب مشینی انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے گھوڑے کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے تھے۔

تیمور کے نوکروں نے رائفلیں سیدھی کر لیں اور انہیں للکارنے لگے الفاظ سیلی کی سمجھ میں نہیں آ سکے تھے لیکن اتنا وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ انہیں وارننگ دے رہے ہیں۔ اور پھر انہوں نے فائرنگ شروع کر دی۔

لیکن اس کا نتیجہ دیکھ کر سیلی کو چکر آنے لگے۔ گولیاں ان کے بدن میں پیوست ہو رہی تھیں۔ ان سے خون بھی پھوٹ رہا تھا لیکن نہ تو ان کے انداز میں کوئی تبدیلی ہوئی تھی اور نہ ان کے آگے بڑھتے ہوئے قدم رکے تھے۔

یہ اتنا وحشت ناک منظر تھا کہ سیلی کے حلق سے چیخ نکل گئی اور نوشین بھی سہم کر چیخ پڑی تھی۔

"ممی ۔ ممی اندر چلو۔ مجھے ان لوگوں سے ڈر لگ رہا ہے۔" اس نے کہا۔ لیکن سیلی صورتحال سے باخبر رہنا چاہتی تھی۔

وہ سب ان ملازموں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ملازم بھی اب مایوس نظر آ رہے تھے اور ان کے بدن نمایاں طور پر کانپ رہے تھے دفعتاً" ان میں سے ایک نے ملازم کے ہاتھ سے بندوق چھین لی اور اسے کسی معمولی تار کی طرح موڑ کر زمین پر پھینک دیا۔ اور پھر اس نے ملازم کی گردن دبوچ لی۔

دوسرے ملازموں کا بھی یہی حشر ہوا تھا۔ اور اس وقت سیلی نے خیمے کے عقب میں چھلانگ لگا دی۔ اس کا سینہ بری طرح دھڑک رہا تھا۔ نوشین اس سے چمٹ گئی تھی۔ لیکن ابھی وہ چند قدم ہی گئی تھی کہ کسی نے عقب سے اس کے

شانے دبوچ لئے سیلی کی دلخراش چیخ ابھری ۔ اور اسی وقت دوسرے ہاتھوں نے نوشین کو اس کی گود سے نوچ لیا۔ سیلی کے حواس جواب دے گئے تھے۔ وہ لہرائی اور زمین پر آ رہی اسے ہوش نہیں رہا تھا۔

گھوڑوں کے پیٹ زمین سے لگے ہوئے تھے۔ تیمور کا گھوڑا سب سے آگے تھا اور وہ اس پر مسلسل ہنٹر برسا رہا تھا اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اڑ کر کیمپنگ تک پہنچ جائے اور انتہائی برق رفتاری سے واپسی کا سفر کرتے ہوئے وہ کیمپوں تک پہنچ گئے۔ کیمپ کے قریب پہنچ کر تیمور ایک لمحہ ضائع کئے بغیر گھوڑے سے کود پڑا۔ اور پھر وہ کیمپوں کی جانب دوڑا۔ گوئین اس کے ساتھ تھا۔

سب سے پہلے اس کی ملاقات دو بے ہوش ساتھیوں سے ہوئی تھی۔ اس نے انھیں دیکھا اور پھر زور سے ان کے بدن پر ٹھوکریں ماریں۔ لیکن ملازم بے ہوش تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر ہی خون کے بڑے بڑے دھبے نظر آ رہے تھے۔ یہ دھبے یقیناً ان ملازموں کے خون کے نہیں تھے۔ تیمور اس طرف بھاگا جہاں گوئین کی بیوی سیلی موجود تھی لیکن سیلی کا خیمہ خالی پڑا ہوا تھا' تیمور باہر نکل آیا۔ اس نے خیمے کے ار دگرد کا جائزہ لیا او رخیمے کی پشت پر اس نے سیلی کو بے ہوش پڑے ہوئے دیکھا۔

"گوئین۔ گوئین۔" تیمور نے پر جوش انداز میں گوئین کو پکارا جو خود بھی خیمے کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔

"کیا بات ہے کیا بات ہے تیمور۔" اس نے خوفزدہ آواز میں پوچھا۔

"دیکھو تمہاری بیوی۔"

"سیلی سیلی۔" گوئین اس کے پاس بیٹھ گیا اور پھر وہ سیلی کو ہوش میں لانے کی ترکیبیں کرنے لگا' کچھ ہی دیر کے بعد سیلی کو ہوش آگیا اس نے گوئین کو دیکھا اور اس کے کوٹ کا کالر پکڑ کر سہمے ہوئے انداز میں بولی۔

"اوہ گوئین۔ گوئین ڈارلنگ تم آ گئے۔ افوہ۔ وہ لوگ وہ لوگ آہ۔

میری بچی۔ نوشین کہاں ہے۔ گوئین نوشین کہاں ہے۔" اس نے متوحش لہجے میں پوچھا۔ اور گوئین چونک پڑا۔ پھر وہ گھبرائے ہوئے انداز میں اٹھا اور نوشین کو آوازیں دینے لگا۔

"نوشین نوشین۔" اس نے زور زور سے آوازیں دیں تیمور تعجب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اور پھر دوسرے لمحے اس نے واپس اس خیمے کی طرف چھلانگ لگا دی جس میں سیلی تھی۔

اس نے چاروں طرف دیکھا لیکن نوشین نظر نہیں آئی تھی۔ پھر وہ دوسرے خیموں میں اس کے اطرف میں بری طرح سے سرگرداں رہا لیکن گوئین کی بیٹی نوشین کا کہیں پتہ نہ تھا۔ دوسری جانب سیلی زور زور سے چیخ چیخ کر رو رہی تھی اور روتے ہوئے نوشین کو پکار رہی تھی۔ گوئین بھی پاگلوں کی طرح دوڑ رہا تھا اور پھر تیمور اور وہ دور دور تک دوڑتے پھرے۔ تیمور کے وہ ساتھی جو اس کے ساتھ گئے تھے چاروں طرف بکھر گئے۔ تیمور نے ان سے کہا تھا کہ جیسے بھی ہو بچی کو ڈھونڈ کر لایا جائے۔ لیکن بچی کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ اور پھر تیمور کے ساتھی تقریباً ڈیڑھ دو میل کے علاقے میں گھوم کر واپس آ گئے دوسری طرف بے ہوش ملازمین بھی ہوش میں آ گئے تھے جو ان لوگوں کے ہاتھوں شکار ہوئے تھے۔ انہوں نے ان لوگوں کے بارے میں بتایا اور تیمور کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

"یہ کیسے ممکن ہے تم لوگ اپنے حواس کھو چکے ہو۔"

"ہم بالکل درست کہہ رہے جناب اگر آپ کو یقین نہ ہو تو آپ مسٹر گوئین کی بیوی سے پوچھ لیں۔"

سیلی کا بیان بھی ملازموں کے بیان سے مختلف نہیں تھا' اس نے بھی یہی جواب دیا کہ ان لوگوں کے جسموں میں گولیاں لگ رہی تھیں' سوراخ ہو رہے تھے اور ان سے خون بہہ رہا تھا لیکن ان کے انداز میں کوئی لغزش نہیں تھی۔ اور وہ اطمینان سے آگے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ ان سب کے بیانوں کی تصدیق خون کے

ان بڑے بڑے دھبوں سے ہوتی تھی جو ان لوگوں کے جسموں سے ہی نکلا تھا۔
تیمور متحیر انداز میں پلکیں جھپکاتا رہا۔ گوئین اس کے سامنے پریشان شکل بنائے کھڑا
تھا۔ تب اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"افسوس نوشین افسوس میں تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں گوئین۔
لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا یہ کیا قصہ ہے۔"

"کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ کچھ نہیں۔ کہا جاسکتا۔"

"لیکن تیمور ہمارا سب کچھ مٹ گیا۔ یہ دنیا اب ہمارے لئے بالکل بے
مقصد ہے۔" گوئین نے غمزدہ لہجے میں کہا۔

"اوہ میرے دوست اتنے ہراساں ہونے کی کوشش مت کرو میرا نام
تیمور ہے یہ میرے علاقے ہیں' میں بستیوں کو تہس نہس کر دوں گا۔ میں ان
آبادیوں کو فنا کر دوں گا جو ناجائز طریقے سے یہاں رہتی ہیں۔ میں لٹیروں کی اینٹ
سے اینٹ بجا دوں گا۔ ایک بھی لٹیرے کو زندہ نہ چھوڑوں گا اگر نوشین اس علاقے
میں نہ ملی۔"

تیمور کے چہرے پر غیظ و غضب کے آثار نظر آنے لگے تھے اور پھر اس
نے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور انہیں حکم دیا کہ واپسی کا بندوبست کیا جائے۔

"نہیں نہیں' میں نہیں جاؤں گی' میں انہی جنگلوں میں بھٹکتی پھروں گی۔
میں اپنی نوشین کو لے کر جاؤں گی۔" سیلی دیوانگی سے بولی۔

"میری بہن تم ان جنگلوں میں بھٹکتے رہنے سے کچھ نہ حاصل کر سکو گی۔
تیمور اپنی قوت کو مجتمع کر کے اس پورے علاقے کی خاک چھان مارے گا۔ ان
جنگلوں کے ایک ایک درخت کے پتوں سے تمہاری بیٹی کو حاصل کر لے گا تمہیں
فکر مند نہیں ہونا چاہیے تم تنہا نہیں ہو اور پھر اسی دن تیمور نے واپسی کے لئے سفر
شروع کر دیا۔

وہ زندگی میں پہلی بار اپنے شکار کی مہم ادھوری چھوڑ کر واپس جا رہا تھا۔

اس کے سینے میں غم و غصہ کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ لیکن ابھی یہ طوفان تھما ہوا
تھا۔ دونوں مہمانوں کو لے کر وہ اپنی ریاست میں داخل ہو گیا۔

اور پھر جو کاروائی ہوئی وہ گوئین کے تصور سے باہر تھی۔ تیمور نے اپنے
سارے وسائل نوشین کی تلاش میں صرف کر دیئے۔ وہ خود بھی گوئین کو ساتھ لے
کر دور دور کے علاقوں میں مارا مارا پھرا۔ روزانہ بے شمار لوگوں کو پکڑ کر لایا جاتا۔
ان کی شناخت کرائی جاتی انہیں اذیتیں دی جاتیں لیکن نوشین کا پتہ نہ ملنا تھا نہ ملا۔

"تم تقدیر کے سکندر ہو ارشد کہ تمہیں افریقہ کے ان انتہائی اندرونی
علاقوں میں ان جنگلیوں کی رسومات کو دیکھنے کا موقع ملا۔ ورنہ بڑے بڑے سیاح اس
چکروں میں آتے ہیں اور زندگی کھو بیٹھتے ہیں۔"

"کیا مطلب ۔ تمہارا خیال ہے کہ یہاں سے واپسی کی کوئی امید نہیں
ہے۔" ارشد نے شارق کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں۔ تم خطرہ محسوس کر رہے ہو۔"

"ہاں۔ مجھے یقین ہے کہ آخری رسم کے طور پر وہ ہمیں بھون کر کھا
جائیں گے۔"

"ہشت۔ وہ آدم خور نہیں ہیں۔ میں یقین کر چکا ہوں۔" شارق نے برا
سا منہ بنا کر کہا۔

مجھے تو یہاں ہر شخص خون آشام معلوم ہوتا ہے۔ کمبخت بولتے ہیں تو یوں
لگتا ہے جیسے آخری رسومات ادا کرنے کی دھمکی دے رہے ہوں۔"

"مسخراپن مت کرو ارشد! شارق نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مسخراپن تو تم کر رہے ہو شارق مجھے تقدیر کا سکندر کہہ رہے ہو۔ میرے
بھائی۔ کاش میں تقدیر کا بندر ہوتا۔ یہ سکندری اپن کو راس نہیں آئی۔ اور پھر تقدیر
کا بندر تو میں اسی دن بن گیا تھا جب میں نے تمہارے باوا کے ایک ملازم کے ہاں
جنم لیا تھا۔ اور ملازم بھی وہ جو پشتی وفاداری کا قائل ہو۔"

"یہ تو انسان کی خوبی ہے۔ شارق ہنس کر بولا۔

"کیا مطلب۔ یعنی یہ خوبی ہے کہ وہ خود بھی غلامی کرے اور اپنی اولاد کو بھی غلام بنائے۔ بھائی جمہوریت کے اس دور میں غلامی کا قصہ ختم ہو چکا ہے۔"

"الزام تراشی کر رہے ہو میں نے کبھی خود کو تم سے برتر سمجھا ہے۔"

"میں تو خود کو تم سے کمتر سمجھتا ہوں۔"

"وہ کیوں۔"؟

"اس لئے کہ مجھے شہروں کی حسین لڑکیاں چھوڑ کر ان ویرانوں میں آنا پڑا ہے۔"

"اوہ راشد۔ تم بدذوقی کا ثبوت دے رہے ہو۔ زندگی کی حقیقتیں جس قدر یہاں ہیں مہذب دنیا میں کہاں۔"؟

"جی ہاں ایک حقیقت وہ آ رہی ہے ملاحظہ فرمایئے۔" راشد نے ایک وحشی سیاہ فام لڑکی کی طرف اشارہ کیا جس کا بدن فولاد کی طرح ٹھوس تھا۔ لیکن وہ تقریباً برہنہ تھی۔ اوپری بدن پر تو کوئی چیتھڑا تک نہیں تھا البتہ نچلے بدن کو نہ جانے کیوں ایک مختصر سی زحمت دی گئی تھی۔

"تمہاری شازیہ سے تو اچھی ہے" شارق نے اسے چھیڑا۔

"واقعی۔ اس کے خدوخال عظمیٰ سے ملتے جلتے ہیں۔ یار شارق اگر تم زندگی کی حقیقتوں کو اتنا ہی پسند کرتے ہو ایک کام کر سکتے ہو۔"

"کیا۔"؟

"ذرا اس حسینہ کے ہونٹوں کا ایک بوسہ لے کر دکھاؤ۔"

"اوہ یہ بھی کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ راشد صاحب، بشرطیکہ ہم وحشیوں میں گھرے ہوئے نہ ہوتے۔ یہ عورتیں برہنہ پھرنے کے باوجود برہنہ ذہن کی مالک نہیں ہیں۔ میں نے بارہا محسوس کیا ہے کہ ان کی نگاہوں میں کبھی غلاظت نہیں ہوتی۔ اگر ہوتی تو آپ کو یہ بھی کر کے دکھا دیتے۔" شارق نے کہا اور راشد گردن

ہلانے لگا۔

"ٹھیک ہے بھائی ٹھیک ہے۔ جان بچانے کے یہی تو گر ہوا کرتے ہیں۔"

"اچھا تم اب فضول بکواس بند کرو۔"

"لیکن بھائی جان آخر ہم لوگ کب تک یہاں رہیں گے۔" راشد نے پوچھا۔

"یار واقعی بعض اوقات تو یہ احساس ہوتا ہے کہ تمہیں یہاں لا کر سخت حماقت کی ہے۔ بڑی مشکل سے ان لوگوں سے پیچھا چھڑایا ہے اور اب تم سر پر مسلط ہو۔"

"کاش آپ مجھ سے بھی وہیں پیچھا چھڑا لیتے۔" راشد نے برا سا منہ بنا کر کہا اور شارق کے ہونٹوں پر مسکان بکھر گئی۔

"وہاں تو نہیں۔ ہاں اگر موقع ملا تو یہاں تم سے ضرور پیچھا چھڑا لوں گا۔" شارق نے کہا اور راشد کھسیانے لگا۔

"نہیں نہیں خدا کے لئے نہیں۔ خدا کی قسم بعض اوقات تم بڑا سنجیدہ مذاق کرتے ہو۔ ایسے مذاق جو جان لیوا بھی ہو جاتے ہیں اگر تم نے مجھے یہاں چھوڑ دیا شارق تو یقین کرو تین دن کے اندر اندر مر جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے اچھا ہی ہے تمہاری زندگی سے کسی کو کیا فائدہ۔" شارق نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔

"دیکھو شارق تڑپو گے۔ زندگی بھر تڑپو گے۔ یہ میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ تمہیں راشد جیسا آدمی نہیں ملے گا۔"

"راشد جیسا آدمی۔ اور راشد کیا کہتا ہے کہ وہ میرے غلام کی اولاد ہے اور اس لئے اسے میری غلامی کرنا پڑ رہی ہے۔"

"ارے یار وہ تو مذاق کی بات تھی کبھی کہہ کر تو دیکھو غلام۔ ہونہہ کیا سمجھ رکھا ہے۔" راشد سینہ تان کر بولا اور شارق ہنسنے لگا۔

عجیب و غریب صفات کا مالک تھا یہ نوجوان بھی۔ مہذب دنیا میں ایک مہذب زندگی گزارنے کے باوجود اس کے ذہن میں نجانے کیوں پراسرار جنگلات اور افریقہ کی زندگی سے گہری دلچسپی پائی جاتی تھی۔ اس نے افریقہ پر اتنی ریسرچ کی تھی کہ اب کسی بھی طور وہاں کے باشندوں سے کم معلومات نہیں رکھتا تھا۔ افریقہ کے مختلف خطوں میں بولی جانے والی زبان وہ بخوبی سمجھ لیتا تھا' اور بہت سے افریقی بڑی دلچسپی سے اس سے باتیں کرتے اور پوچھتے کہ کیا اس نے افریقہ میں ہی زندگی گزاری ہے۔

یوں تو دنیا کے مختلف مقامات کی سیر و تفریح کر چکا تھا اور راشد ہمیشہ اس کے ساتھ رہا تھا۔ لیکن اس بار اس نے طے کیا تھا کہ وہ افریقہ کے اندرونی علاقوں میں جائے گا۔ افریقہ کا سفر اس کے لئے نیا نہیں تھا۔ البتہ راشد پہلی بار یہاں آیا تھا ویسے راشد شارق کی شخصیت سے عقیدت رکھتا تھا۔

وہ اسے ایک دیوتا کی مانند سمجھتا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق شارق صلاحیت و ذہانت میں یکتا تھا۔ اس نے جس شعبے کو اپنایا تھا اس میں کمال حاصل کیا تھا اور اس کمال کے حصول میں اس کے بزرگوں کا پورا پورا تعاون شامل تھا۔ چنانچہ افریقہ کے قدیم ہتھیار اور ان کا استعمال شارق کو بخوبی آتا تھا۔ وہ شمشیرزنی نیزہ بازی' تیشہ زنی' کمانوں کے ذریعے پھینکے جانے والے پتھروں سے شکار' بومرنگ کا استعمال اور ایسی ہی ساری چیزوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اتنی اچھی طرح کہ اگر کبھی جنگلوں میں ٹارزن بن کر نکل جاتا تو یقینی طور پر اسے ٹارزن تسلیم کر لیا جاتا۔

اس کے علاوہ بچپن ہی سے اسے جسم بازی کا شوق تھا۔ چنانچہ اس کا بدن حسین ترین جسموں میں شمار ہوتا تھا۔ اپنے وطن میں وہ کئی بار باڈی بلڈروں کے مقابلے میں حصہ لے چکا تھا اور ہمیشہ اس نے اولیت حاصل کی تھی۔

تو اس حسین شخصیت اور پروقار خطوط کے ساتھ شارق راشد کا دوست

تھا' راشد شارق کے باپ کے ایک ملازم کا بیٹا تھا لیکن ہم عمر ہونے کی وجہ سے وہ دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے سے بے تکلف تھے۔

افریقہ میں داخلے سے پہلے انہیں مختلف ہدایات ملی تھیں' اور ان کے ساتھ کچھ ایسے تجربہ کار لوگوں کو بھیجا گیا تھا جنہیں ہدایت ملی تھی کہ وہ ان کا خیال رکھیں۔ اور ان کی مکمل نگرانی کریں۔

اس سلسلے میں شارق کے باپ نے اپنے ایک افریقی دوست کا بھی حوالہ دیا تھا جو ایک قبائلی تھا۔ وہ تمام لوگ اس قبائلی کے ہاں ٹھہرے تھے اور رات کو شارق راشد کو لیکر نکل بھاگا تھا۔ کیونکہ یقینی طور پر اسے اس کے منصوبوں کی تکمیل کی اجازت نہیں ملتی' جن کی وجہ سے وہ یہاں آیا تھا۔

افریقہ کے انتہائی گھنے علاقوں میں سفر کرتے ہوئے وہ اس جگہ سے اتنی دور نکل آئے تھے کہ اب ان کا پایا جانا ناممکن تھا۔ حالانکہ راشد نے بار بار کہا تھا کہ کم از کم راستوں کی نشانی تو رکھی جائے تاکہ واپسی میں آسانی ہو۔ لیکن شارق نے اس کی بات نہیں مانی اور کہا کہ دوست افریقہ تو اتنی خوبصورت جگہ ہے کہ بس اس کے کسی پسندیدہ علاقے میں پہنچ جایا جائے تو پھر واپسی کو دل ہی نہ چاہے۔ اور راشد یہ سن کر دنگ رہ گیا تھا۔

"مگر میرے بھائی میں تو واپس جانا چاہتا ہوں' میری نصف درجن محبوباؤں کا کیا ہو گا۔ اگر میں چھ مہینے ان سے نہ ملا تو پھر یقیناً ان کی نگاہ انتخاب کسی دوسرے پر ہو جائے گی اس کے بعد میرا کیا ہو گا۔"

"لیکن تم نصف درجن محبوباؤں کا کرو گے کیا۔" شارق نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"اچار ڈالوں گا۔ تمہیں اس سے کیا۔ تم آدمی بھی انوکھے ہو۔ بھلا تمہارے اس حسن اور تمہاری اس جوانی کا کیا فائدہ جبکہ کوئی تمہاری اس جوانی کو دیکھنے والا ہی نہیں ہے۔"

"جی نہیں۔ میں اپنے آپ کو خود دیکھ لیتا ہوں۔" شارق نے جواب دیا تھا اور اس کے بعد وہ سفر کرتے رہے۔ اور پھر ایک ایسے قبیلے تک پہنچ گئے جو افریقہ کے ایک انتہائی ویران حصے میں آباد تھا۔

پر اسرار کہانیوں کی پر اسرار کڑی جہاں انہیں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ گرفتاری کے وقت راشد کی حالت تو جو کچھ بھی ہو لیکن شارق بے حد مطمئن تھا۔ اور پھر مقامی زبان نے اسے سہارا دیا۔ اس نے سردار سے ملنے کی خواہش کی۔ اور کم بخت کو نجانے کونسا فن آتا تھا کہ تھوڑی ہی دیر کی گفتگو کے بعد سردار شیشے میں اتر گیا اور انہیں ان بندشوں سے آزاد کر دیا گیا جو انکی گرفتاری کے لئے استعمال کی گئی تھیں۔ پھر انہیں دنیا کی تمام آسائشیں دے دی گئی تھیں۔

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے شارق بھائی کہ آخر اب ہم یہاں کیوں رکے ہوئے ہیں۔" راشد نے پوچھا۔

"جانم اسی کا جواب دینے جارہا تھا تمہیں کہ تم نے خواہ مخواہ اس لڑکی کی جانب متوجہ کر دیا۔"

"اوہو۔ اس کا مقصد ہے لڑکیاں تمہیں بھی متاثر کرتی ہیں۔"

"کیوں کیا میں انسان نہیں ہوں۔"

"مگر یہ افریقی لڑکیاں۔ توبہ توبہ۔ لاحول ولاقوۃ۔ شکلیں دیکھ کر نفرت آتی ہے۔ لیکن باقی سب ٹھیک ٹھاک ہے۔" راشد نے احمقانہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔ اور شارق نے اس کے سر پر ہاتھ رسید کر دیا۔

"اوہو۔ ہو۔ شارق بھائی تمہیں اپنے تھپڑ کے وزن کا صحیح اندازہ نہیں ہے اس لئے اللہ کے واسطے سر کو نشانہ نہ بنایا کرو۔ کسی دن زور دار ہاتھ پڑ گیا تو انٹینا لیے بازاروں میں پھرتا پھروں گا قسم اللہ پاک کی جھوٹ نہیں کہہ رہا۔" راشد نے عجیب سے انداز میں کہا اور شارق ہنس پڑا۔

"تم ضرورت سے زیادہ بکواس کرتے ہو راشد۔"

"اچھا چلو بکواس بند۔ لیکن تم مجھے کون سی بات بتانے جا رہے تھے۔"

"ایک بہت ہی دلچسپ۔" شارق نے جواب دیا۔

"جی جی فرمائیے۔"

"بھئی ظاہر ہے ہم یہاں ان لوگوں کی اندرونی زندگی کے بارے میں لومات حاصل کرنے آئے ہیں۔"

"ہم نہیں صرف آپ کہیں۔"

"چلو ٹھیک ہے صرف میں ہی سہی لیکن تم کچھ نہ کچھ تو ہو۔"

"ہاں گدھے کے ساتھ ایک پخ بھی ہوتی ہے۔" راشد نے جواب دیا۔

"تو جناب پخ صاحب ابھی ان کے ہاں ایک دلچسپ سلسلہ شروع ہونے لا ہے۔"

"وہ کیا۔"

"ایک بڑی پراسرار بڑی خوبصورت کہانی سنی ہے راشد اور یقین کرو کہ س پراسرار کہانی کو سننے کے بعد طبیعت بے حد مسرور ہے کہ بتا نہیں سکتا۔"

"واہ۔ واہ۔ کیا کہانی ہے طوطا مینا کی۔"

"جی نہیں۔ اسفانہ کی۔"

"یہ کونسے جانور کا نام ہے۔" راشد نے پوچھا۔

"میں نے اس جانور کو دیکھا تو نہیں ہے لیکن اس کے بارے میں جو علومات ہوئی ہیں وہ بڑی دلکش ہیں۔" شارق نے جواب دیا۔

"کاش اس علاقے کی سیاہ فام عورتوں میں مجھے کوئی دلکش روایت نظر تی۔" راشد نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"اب تم کور چشم ہو تو میں کیا کروں۔"؟

"اچھا خیر سفلانہ کی کہانی رہ گئی۔"

"سفلانہ نہیں اسفانہ۔"

"ایک ہی بات ہے۔ کیا کہانی ہے۔"؟

"میں نے سردار سے واپسی کی اجازت مانگی تھی۔ لیکن اس نے کہا۔ رکوں۔ ابھی ان کے ہاں جشن اسفانہ ہونے والا ہے۔ یہ جشن چوبیس سال کے ہوتا ہے اور اس میں افریقہ کے بے شمار قبائل حصہ لیتے ہیں۔"

"اور ہمیں بھی اس جشن میں حصہ لینا چاہیے۔ کیوں۔"؟ کیوں ر ہونٹ بھینچ کر بولا۔

"ہاں راشد۔ کہانی سنو گے تو تڑپ اٹھو گے۔"

"میرا دل تو ویسے ہی تڑپنے لگا ہے۔ بہرحال کہانی بھی سنا دو۔"

"افریقہ کے ان پوشیدہ علاقوں میں ایک دیوی کی مشترکہ حکومت ہ ہے۔ تمام قبیلوں کی ایک فیڈریشن ہے۔ یوں سمجھو کہ ہر قبیلے کی اپنی حکومت ہ ہے لیکن دیوی کی حکومت ان تمام قبیلوں پر ہے اور وہ جو حکم دے دے آخری ہے۔ اس دیوی کے بارے میں بھی زبردست انکشافات ہوئے ہیں۔ سردار نے ہے کہ دیوی کی عمر چوبیس سال ہوتی ہے اس کا انتخاب پہلے سے کر لیا جاتا ہے۔ ا پھر اسے اسی انداز میں پروان چڑھایا جاتا ہے۔ سترہ سال میں اس کی حکومت قائم دی جاتی ہے۔ اور ایک دیوی کی حکومت سنبھالنے کے لیے دوسری دیوی کی قربا دی جاتی ہے۔ یعنی پہلی دیوی کو چوبیس سال کے بعد قتل کر دیا جاتا ہے۔ اس سلے میں ایک خاص رسم ہوتی ہے۔"

"اس کے علاوہ وہ قبیلہ جہاں دیوی ہوتی ہے تمام قبیلوں سے افضل تر تسلیم کیا جاتا ہے۔"

"بات سمجھ میں نہیں آئی۔" راشد نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"توہمات کی دنیا ہے راشد۔ لیکن یہی اس دنیا کا حسن ہے۔ یوں سمجھ لو کہ وہ سب مل کر ایک دیوی کی پوجا کرتے ہیں اور یہ دیوی کسی ایک قبیلے میں ہو ہے۔"

"وہ کس طرح۔"؟

"چوبیس سال کے بعد جب نئی دیوی تخت نشین ہوتی ہے تو اس کی شادی ی کر دی جاتی ہے۔ دیوی کا شوہر بننے کے لئے ہر قبیلے کا ایک منفرد جوان جاتا ہے ر پھر دوسرے قبیلے کے نوجوان سے اس کا مقابلہ ہوتا ہے آخر میں جو جوان فاتح تا ہے اس سے دیوی کی شادی کر دی جاتی ہے اور وہ قبیلہ جس کا وہ جوان ہوتا ، تمام قبیلوں سے افضل ہوتا ہے۔ نہ تو اس کے خلاف کوئی جنگ کی جاتی ہے نہ ی کے احکامات سے روگردانی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ سارے قبائل اس کو اج ادا کرتے ہیں۔"

"اوہ۔ یہ معاملہ ہے تو پھر۔" راشد نے پوچھا۔

"پھر یہ کہ نئی دیوی کی تاج پوشی ہونے والی ہے۔"

"اور ہم اس تاج پوشی میں مہمان خصوصی ہوں گے۔"

"مہمان"

"ضروری ہے۔"

"لطف آ جائے گا راشد۔ اتنی خوبصورت رسومات کہاں دیکھنے کو ملتی ں۔"

"تو یہ عظیم رسومات کب سے شروع ہو رہی ہیں۔"

"بہت جلد۔ شاید ایک دو دن میں۔ زبردست تیاریاں کی جا رہی ہیں۔"

"اللہ کے واسطے شارق۔ ان فضول باتوں میں مت پڑو۔ یہاں سے چلو ں بہت ہو گئی۔"

"راشد آج میں سنجیدگی سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"کہو بھائی کہو۔"

"اس بار میرا افریقہ کے ان اندرونی علاقوں میں آنے کا مقصد صرف ایک ما وہ یہ کہ میں یہاں کے رسومات کے بارے میں جان سکوں۔ اب مجھے یہ موقع ملا

ہے تو میں اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤں گا۔ اور میں نہیں جانتا کہ یہاں کتنا لگے گا۔ اس لیے میرے دوست۔ تم اگر چاہو تو یہاں سے واپس جا سکتے ہ شارق نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا واقعی راشد نے خوشی سے منہ پھاڑ دیا

"ہاں راشد۔ پوری سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔"

"تب تم مجھے واپس چھوڑ کر آؤ پیارے بھائی۔ میں تمہارا دلی شکر ہوں گا۔"!

"نہیں راشد۔ میں سنجیدہ ہوں۔"

"میں بھی سنجیدہ ہوں۔"

"ٹھیک ہے میں تمہاری واپسی کا بندوست کر دوں گا۔"!

"وہ کیسے۔"؟

"سردار سے درخواست کروں گا کہ کسی کو تمہارے ساتھ کر دے۔"

"ان آدم خوروں میں سے کسی کو جو راستے میں مجھے کھا جائے۔ بھائی کسی کے پیٹ میں زندہ رہنا مجھے پسند نہیں۔"

"پھر کیا کرو گے۔"؟

"مجبوری ہے تمہارے ساتھ ہی رہوں گا۔"!

"تو پھر وعدہ کرو کہ آئندہ نخرے نہیں کرو گے۔"

خاک وعدہ کروں۔ میں تو اب سنجیدگی سے سوچنے لگا ہوں کہ شاید میہ بچے پیدا ہونے سے قبل یتیم ہو جائیں گے۔"

"یہی بہتر ہے اب بکواس بند کرو۔" شارق نے کہا اور راشد اپنے نا بچوں کے لیے غمزدہ نظر آنے لگا۔!

سرداز کا دست راست انہیں لے کر اس وسیع وعریض، میدان میں پہنچ جہاں مقابلے جاری تھے۔ ایک دن کے یہ مقابلے دو گھنٹے قبل شروع ہو چکے تھ

سردار نے ان کے لئے بیٹھنے کا بندوبست کیا۔ لیکن میدان پر نگاہ پڑتے ہی راشد کی عالت خراب ہو گئی۔

میدان میں چند انسانی لاشیں پڑی ہوئی تھیں اور ایک دیو قامت سیاہ فام اپنا تیشہ ہلا رہا تھا۔

"یہ ماروق ہے اس کی پرورش بھی دیوی کے ساتھ ساتھ کی گئی ہے۔ لوگوں کا خیال ہے یہ اس بار بھی آخری جشن میں حصہ لے گا۔"

"کیا مطلب۔"؟

"یوں تو میرے قبیلے میں بڑے بڑے زور آور موجود ہیں لیکن ماروق کو بچپن سے اسی خیال کے تحت پروان چڑھایا گیا ہے کہ وہ دیوی کے حصول کے جشن میں مقابلہ کرے۔ اس کی طاقت اور فن بے مثال ہے۔"

"ان سب لوگوں کو اس نے قتل کیا ہے۔"

"ہاں۔ یہ سب اس کے کشتہ ہیں۔ پہلی لاشوں کو میدان سے ہٹا دیا گیا ہے۔"

"اوہ۔ اس سے قبل بھی مقابلے ہوئے تھے۔"؟

"ہاں۔ اور آخری فاتح کو ماروق نے قتل کر دیا۔

"لیکن آپس کے مقابلوں میں قتل کرنا ضروری نہیں ہے سردار"

"جو شخص مقابلہ کرتا ہے اس کے ذہن میں وحشت ہوتی ہے اور اس کی دلیری کے آگے کوئی بندش مناسب نہیں ہوتی۔"

بستی میں ماروق کا مقابل کوئی نہیں ہے۔"؟

"ہے۔" سردار۔"

"ارغان۔ لیکن اس کے ورثاء اسے دیوی کے جشن میں حصہ لینے سے منع کر رہے ہیں۔"

"کیا ماروق تمہارا آدمی ہے سردار۔"

"کیا مطلب۔؟

"کیا سردار نے اس کی پرورش کی ہے"؟

"نہیں، سردار ایسا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ سرداری کسی ایک کی ملکیت ہوتی۔ اگر سردار کسی کی پشت پناہی کرے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ سر اپنی پسند سے رکھنا چاہتا ہے۔ اس لئے سردار کا کوئی آدمی ان مقابلوں میں۔ دیکھو۔ ارغان میدان میں آگیا۔ یہی ایک خطرہ تھا۔ کہ وہ مقابل نہ آئے۔"

"تمہارے خیال میں اس جشن کے لئے کون بہتر ہے سردار۔"

"ماروق۔ کیونکہ وہ وحشت خیزی میں ثانی نہیں رکھتا۔ لیکن ارغا بارے میں اطلاع ہے کہ وہ نہتا شیروں کو ہلاک کر دیتا ہے۔"

"خوب۔ شارق نے دلچسپی سے کہا۔ اور وہ دونوں مقابل آ گئے ا بھی حقیقت میں ایک مست ہاتھی تھا۔ دونوں میں خونریز جنگ ہونے لگی۔ راش آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ تب شارق نے اس کے سر پر ایک دھپ رسید کر د

"کیا بزدلی۔"؟

"اللہ کے واسطے یہاں سے اٹھ جاؤ۔"

"راشد۔ ان دونوں میں سے جو فاتح ہو گا میں اس سے مقابلہ کروں گا

"شارق۔ خدا کے واسطے مجھے یہی خطرہ تھا۔"

"تب پھر سیدھے بیٹھو۔" شارق نے کہا۔ اور راشد سیدھا ہو کر گیا۔" سچ راشد۔ یہ سپہ گری میں طاق ہیں لیکن میرے پاس کچھ ایسے خفیہ گ کہ میں انہیں شکست دے سکتا ہوں۔" شارق نے بازو تانتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس بھی ایک خفیہ گر ہے جس کے ذریعے میں تمہیں اس مة سے روک سکتا ہوں۔" راشد نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔

"وہ کیا۔" شارق مسکرایا۔

"اگر تم مقابلہ کرنے کے لئے اٹھے تو میں اس سردار کا خنجر چھین کر

کے پیٹ میں بھونک دوں گا۔ اور اس کے بعد ہماری جو چھپی ہو گی وہ قابل دید ہو گی۔" راشد نے کہا اور شارق بے اختیار ہنس پڑا

"لیکن اس کا نتیجہ۔"؟

"جو کچھ بھی ہو۔" راشد نے کہا اور دونوں آنکھیں بند کر لیں "آہ دیکھو۔ اس طرف دیکھو۔" اس نے کہا۔ اور شارق کی نگاہیں میدان کی طرف اٹھ گئیں۔ خونخوار ماروق نے اپنے اس مقابل کو بھی ہلاک کر دیا تھا۔ اس بار دیر تک وہ میدان میں اپنے مقابل کی تلاش میں لہراتا رہا اور بالآخر سردار نے اس کی فتح یابی کا اعلان کر دیا۔

"خدا کا شکر ہے تم نے عقل سے کام لیا۔" راشد نے کہا۔ میدان میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔

ماروق بیس جوانوں کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ اور اس کی روانگی کے بعد شارق نے بھی سردار سے اجازت مانگی۔ "کچھ دن اور یہاں رہو نوجوان دوست۔ تم مجھے پسند آئے۔"

"بس اب ہمیں اجازت دو سردار۔ ہمیں کچھ ضروری کام ہیں راشد اپنی روانگی سے بہت خوش تھا۔ وہ گھوڑوں پر بیٹھ کر چل دیئے۔ شارق نے ایک مخصوص سمت اختیار کی تھی۔ راشد سمت سے بے پرواہ خوشی سے سفر کر رہا تھا۔ پھر انہوں نے ایک پہاڑی پر قیام کیا۔ اور رات کو راشد نے مچھروں کو بھگانے کے لئے آگ جلانی چاہی تو شارق نے اسے روک دیا۔

"نہیں راشد۔"

"کیوں پیارے بھائی۔ یہاں مچھر بہت ہیں۔"

"رہنے دو۔ تمہارے بدن میں اتنا خون موجود ہے کہ اگر افریقی مچھر دن رات ایک ماہ تک تمہارا خون پئیں تب بھی ختم نہ ہو۔"

"لیکن تم آگ جلانے سے کیوں منع کر رہے ہو۔"؟

"ابھی تھوڑی دیر کے بعد ہم سے کچھ فاصلے پر بھی آگ روشن ہو گ
نہیں چاہتے کہ وہ لوگ ہماری طرف متوجہ ہو جائیں۔"

"کک۔ کیا مطلب۔ وہ کون لوگ ہیں۔"

"ماروق اور ان کے ساتھی۔" شارق نے اطمنان سے جواب د
راشد بری طرح اچھل پڑا۔

"کیا بکواس ہے یہ۔" اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"کیوں اس میں بکواس کی کیا بات ہے۔"

"مم مگر تمہیں کیسے معلوم۔"

"میں ان کا پیچھا کر رہا ہوں راشد۔"

"مگر کیوں راشد نے رو دینے والی آواز میں پوچھا۔

"اس لئے کہ ہم بھی اس جشن کو دیکھیں گے جس میں ماروق حصہ
گا۔"

"لعنت ہے۔" راشد نے کہا اور شارق نے عجیب سی نگاہوں سے
دیکھا۔ "مجھ پر۔" راشد نے جلدی سے کہا اور شارق کے ہونٹوں پر مسکر
پھیل گئی۔

"مگر کیوں راشد۔"

"میرے بھائی اب ان لوگوں کے پیچھے جا کر تم کرو گے کیا۔"

"راشد بڑا لطف آئے گا۔ تم ذرا غور تو کرو' اسفانہ ان میں سے ک
ملکیت ہو گی۔ ہم یہ دیکھیں گے کہ وہ کس کی ملکیت بنتی ہے۔"

"اور دیکھنے سے آپ کو کیا ملے گا۔" راشد نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے میں تو سونے جا رہا ہوں۔" راشد اس طرح گر پڑا جیسے ا
بیہوشی طاری ہو گئی ہو۔ راشد اس طرح زمین پر چت لیٹا ہوا تھا جیسے مر گیا
شارق کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس
ندازے کی تصدیق ہو گئی۔ اور آگ جل رہی تھی۔ غالباً ماروق کے لوگوں نے بھی
کہیں قریب ہی پر انتظام کیا تھا۔

"مگر بھائی صاحب آخر ہم ان لوگوں میں کیسے شامل ہوں گے۔ ہمارے
رنگ' ہمارے حلیے۔" راشد جو جاگ رہا تھا۔ اس سے چپ نہ رہا جا سکا۔

"ہوں۔ یہ کونسی بڑی بات ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں بیوقوف ہوں۔"

"جی نہیں سمجھتا تو نہیں ہوں۔" راشد نے کہا اور شارق ہنس پڑا۔

"میں نے ایک ایسا سیال حاصل کر لیا ہے جیسے ہم مل کر ان وحشیوں میں
شامل ہو جائیں گے۔"

"سبحان اللہ' سبحان اللہ' کیا عمدہ خیال ہے مگر اس سے فائدہ کیا ہو گا۔"
راشد نے پوچھا۔

"بس جو فائدہ ہو گا تم اسے دیکھتے رہو۔"

"ٹھیک ہے دیکھ رہا ہوں اچھی طرح دیکھ رہا ہوں" اور شارق ہنستا ہوا اس
کے قریب ہی لیٹ گیا۔

دوسری صبح دونوں نے اپنی کاروائیاں شروع کر دیں۔ شارق نے نجانے
کہاں سے وہ ساری تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ انہوں نے اپنے جسموں کو سیاہ رنگ
میں رنگ لیا اور بالکل ان وحشیوں جیسے ہو گئے پھر وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر چل
دیئے۔ شارق راشد کی حالت دیکھ کر قہقہے لگا رہا تھا۔

کاش تم خود بھی اپنے آپ کو دیکھ سکتے۔"

"کیا مطلب۔"

"تم مجھ سے زیادہ ہونق لگ رہے ہو۔" راشد نے ہنستے ہوئے کہا اور
شارق خاموش ہو گیا۔

یہ سفر پورے چار روز جاری رہا تھا۔ وہ لوگ انتہائی کامیابی سے ماروق کا
پیچھا کرتے رہے' اور اس سفر کا اختتام ایک انتہائی بلند پہاڑ کے نزدیک ہوا جو برف

سے لدا ہوا تھا۔ پہاڑ کے دامن میں خیموں کا ایک سر آباد تھا اور یہ جیسے عجیب غریب طرز کے تھے سب کے سب مختلف اور ایک دوسرے سے منفرد۔

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم ان لوگوں میں کس حیثیت سے ر گے۔"؟

"میرا خیال ہے اتنے سارے لوگوں میں ہمیں کوئی دقت نہیں ہو گی۔ شارق نے کہا۔

اس کے باوجود ان لوگوں نے اس شہر میں داخل ہونے سے پہلے قرب جوار کا پوری طرح جائزہ لے لیا تھا۔ پہلے انہوں نے پہاڑوں کے ایک ایسے دام میں قیام کیا جہاں خیمے نہیں لگے ہوئے تھے لیکن اس کے بعد انہوں نے ایک خی ان لوگوں کے درمیان ہی لگا لیا جو شاید مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔

یہاں کوئی ایک دوسرے کا خبر گیر نہیں تھا سب لوگ اپنے اپنے طور آئے تھے اور سب ہی نے اپنے طور پر اپنے قیام و طعام کا بھی بندوبست ک تھا۔ چنانچہ راشد اور شارق نے بھی اپنے لئے کھانے پینے اور رہنے سہنے کا بندوبس کیا۔ جو بہر صورت آسانی سے ہو گیا تھا۔

یہاں ان کی ملاقات دوسرے قبائل کے لوگوں سے بھی ہوئی شارق نے خاص طور سے اپنے آپ کو ماروق کے خیموں سے دور رکھا تھا۔ بہر صورت اس نے چند دوست بنائے۔ اپنے ساتھی کے بارے میں اس نے لوگوں کو یہ بتایا تھا کہ و گونگا اور بہرا ہے۔ خود وہ مقامی زبان میں باآسانی گفتگو کر لیا کرتا تھا۔

جس رات اسفانہ پہاڑیوں میں نمودار ہوئی چاند پوری طرح روشن تھا اور اس کے چہرے کے گرد عجیب سی روشنیاں رقص کر رہی تھیں یہ غالباً اس کے گلے میں پڑی ہوئی بڑے بڑے ہیروں کی مالاؤں کا رقص تھا جنہوں نے اسے قوس و قزح میں تبدیل کر دیا تھا۔ شارق کی نگاہیں پہاڑیوں کے درمیان سے نمودار ہونے والی اس حسین دیوی پر لگی ہوئی تھیں۔ بلاشبہ یہ دیوی مقامی نہ تھی اس کا تعلق افریقہ

سے نہیں معلوم ہوتا تھا' کیونکہ اس کے رنگ میں ایک عجیب سی سفیدی تھی جو کسی بھی طور افریقہ کے کسی بھی علاقے میں نہیں پائی جا سکتی۔ شارق نے راشد کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کیا بات ہے بھائی جان۔" اس نے سہمے لہجے میں پوچھا۔

"راشد۔ راشد اسے دیکھ رہے ہو۔"

"ہاں دیکھ رہا ہوں مگر دماغ قابو میں نہیں ہے۔"

"کیوں بھائی جان۔"

"اسے دیکھ کر ذہن و دل قابو میں رہ سکتے ہیں۔"

"خود تمہاری جو بھی کیفیت ہو میں اس سے مبرا ہوں۔"

"راشد۔ راشد اب تو کچھ اور ہی سوچنا پڑے گا۔" شارق نے کہا۔

"کیا بھائی۔" راشد رو دینے والی آواز میں بولا۔

"اسفانہ ان سیاہ فاموں کی ملکیت نہیں بن سکتی' میں بھی اس کے لئے جنگ کروں گا۔" شارق نے کہا اور راشد کی حالت خراب ہونے لگی۔

"تم۔ تم ان لوگوں سے جنگ کرو گے۔ ارے بھائی کیا خیموں کے درمیان گھوم پھر کر نہیں دیکھا تم نے۔ ایسے ایسے خوفناک دیوہیکل آدمیوں کو بھول گئے تم۔ کمبخت پورے کے پورے درخت معلوم ہوتے ہیں' کیا تم ان درختوں سے جنگ کر کے اسفانہ کو حاصل کر سکتے ہو۔"

"ہاں راشد اسے دیکھنے کے بعد تو میں اسے کسی بھی طور چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوں۔" شارق نے کہا۔

"مگر تمہارے بعد میرا کیا ہو گا۔"

"کیا مطلب۔"

"ظاہر ہے تم ان سے جیت نہیں سکو گے۔ مارے جاؤ گے اور میں مفت میں مارا جاؤں گا۔" راشد نے کہا۔

"ٹھیک ہے یار' کیا تم دوست کے لئے جان بھی نہیں دے سکتے۔"

"دے تو سکتا ہوں مگر ذرا ڈر لگتا ہے' بہر صورت اب تمہیں روکنا بے حد مشکل کام ہے۔ سوچنا غور کرنا۔ مجھ پر نہیں تو آئندہ ہونے والے بچوں پر ہی ترس کھا کر اس بات کا فیصلہ کر لینا کہ اس لڑکی کے لیے تمہارا مقابلہ کسی بھی طور پر مناسب نہیں ہو گا۔"

"عجیب و غریب ہے عجیب و غریب۔ اتنی حسین کہ تصور سے بعید۔" شارق کے منہ سے نکلا۔

"جی ہاں تصور سے بعید۔ ٹھیک ہے مرنا چاہتے ہو مرو ہمارا کیا ہے۔" راشد نے کہا اور اس کے بعد وہ اٹھ کر وہاں سے چلا آیا۔ شارق کو پوری رات نیند نہیں آئی تھی۔ اس نے جو کچھ دیکھا تھا اسے دیکھنے کے بعد ذہن و دل پر اس کا قبضہ نہیں رہا تھا۔ آنکھوں میں اسفانہ کی تصویر گھومتی رہتی تھی۔ اور نجانے کس طرح اس نے یہ تین دن گزارے۔

مقابلوں کا اعلان ہوا' بڑے پجاری نے قبائل کی رسم دہرائی۔ اور بتایا کہ اسفانہ کو حاصل کرنے والا کوئی بھی شخص ہو سکتا ہے' یہاں آنے والے ہر شخص کو مقابلے میں حصہ لینے کی اجازت ہے۔"

بڑے پجاری کے اس اعلان نے شارق کو اور خوش کر دیا تھا۔ اب اسے امید ہو گئی تھی کہ اسے مقابلے میں حصہ لینے کا موقع مل جائے گا!

"بڑے بھائی آخری بار کہہ رہا ہوں کہ باز آ جاؤ۔" راشد نے کہا۔

"نہیں یار اب کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر میں سنجیدگی سے تم سے علیحدگی اختیار کر لوں گا۔"

"تم اپنی مرضی کے مالک ہو۔" شارق نے سخت آواز میں کہا اور راشد ناراض ہو کر اسی وقت چلا گیا۔ شارق کا خیال تھا کہ راشد واپس آ جائے گا۔ لیکن ساری رات اور پورا دن گزر گیا اسے افسوس ہوا۔ اسے راشد کے ساتھ یہ رویہ

نہیں اختیار کرنا چاہیے تھا۔

لیکن دوسرے دن مقابلہ تھا۔ وہ راشد کو تلاش کرنے بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اور رہی اسفانہ کو چھوڑنے کی بات۔ تو یہ شارق کے بس سے باہر کی بات تھی۔ اس کے دل میں اسفانہ کا تیر ترازو ہو گیا تھا۔ اب تو اسے چھوڑ کر زندہ رہنا بھی بیکار تھا۔ راشد کے لئے اسے افسوس ضرور تھا لیکن اس نے ذہن دوسری طرف کر لیا۔

بڑے بڑے دیو ہیکل میدان میں اترے تھے۔ میدان میں ان کی پسند کے ہتھیار چن دیئے گئے تھے۔ لاکھوں انسانوں کا ہجوم تھا۔ طرح طرح کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بڑے میدان میں اترنے والے بیس لڑاکے تھے۔ پہلی ہی کھیپ میں ماروق بھی اترا تھا اور بڑے پجاری کے اشارے پر جنگ کا آغاز ہو گیا۔ شارق خود بھی اس جنگ میں شریک تھا۔

یہ جنگ ان کے لئے بہت بڑی مذہبی حیثیت رکھتی تھی۔ جنگ شروع ہوئی تو سب خاموش ہو گئے۔ شارق کا مقابلہ ایک ایسے گنجے سر والے دیو ہیکل شخص سے تھا جس کے ہاتھ میں چوڑا کھانڈا تھا۔ وہ کھانڈا ہلاتا ہوا آگے آیا۔ اور اس نے شارق پر ایک بھرپور وار کیا۔ شارق نے الٹی قلابازی کھائی اور متوقع پینترا بدلے بغیر یہ وار خالی دیا۔ اور پھر وہ مقابل کے پے در پے واروں سے بچتا رہا۔

انسان تھا یا جن۔ تھکنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا اس بار کھانڈا لے کر اس طرح لہرایا تھا جیسے آخری اور یقینی وار کرنا چاہتا ہو۔ ابھی وہ کھانڈا ہلا ہی رہا تھا کہ دفعتاً اس کے حلق سے ایک کریہہ آواز نکلی اور اس نے اپنا گنجا سر پکڑ لیا۔ کھانڈا اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا تھا۔ لیکن شارق نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی تلوار اس کے سینے میں گھونپ دی۔

ویسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ گنجے کو اچانک کیا ہو گیا تھا۔ اس کا دوسرا مقابل ماروق ہی تھا۔ ماروق دو آدمیوں کو قتل کر کے اس کے سامنے پہنچا تھا۔

اور اب وہ شارق سے مقابلے کے لئے تیار تھا۔

شارق اس کے جنگ کرنے کے انداز کو دیکھ چکا تھا۔ چنانچہ وہ ہوشیار ہو گیا۔ ماروق نے جنگ شروع کر دی اور ابھی وہ کچھ داؤ دکھانے بھی نہ پایا تھا کہ اچانک تڑپ اٹھا اس نے اپنا ہاتھ آنکھ پر رکھ لیا اور دوسرے لمحے شارق کی تلوار نے اس کی گردن کاٹ دی۔ لیکن اس بار شارق نے بخوبی ماروق کی آنکھ میں سوراخ دیکھا تھا۔ ماروق کسی اور وجہ سے مار کھا گیا تھا۔

بہرحال یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا کیونکہ تیسرے مقابل نے اسے للکارا تھا۔ شارق کو اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔

میدان جنگ لاشوں سے بھرا پڑا تھا۔ اور ان لاشوں سے بہتے ہوئے خون سے پاؤں پھسل رہے تھے۔ تیسرے مقابل کے خلاف برتری بھی اسی پراسرار قوت نے دلائی تھی اب تو شارق شدید حیران رہ گیا۔

چوتھے مقابل کو قتل کرتے ہوئے اس نے پتھر کا ایک نوکدار ٹکڑا صاف دیکھا جو اس مقابل کی کنپٹی پر لگا تھا۔ سورج چھپنے تک جنگ ہوتی رہی۔ اور اب صرف تین لڑاکے اور باقی رہ گئے تھے۔ پھر شارق نے آخری مقابلہ کیا۔ یہ ایک چھوٹے قد کا وحشی تھا۔ بلا کا لڑاکا۔ یہ بھی صبح سے لڑ رہا تھا۔ دونوں تھکے ہوئے تھے لیکن شارق کے انداز میں انوکھا جذبہ لڑ رہا تھا۔ اس نے پستہ قد وحشی پر تابڑ توڑ حملے شروع کر دیئے تھے۔ اور پہلی بار پستہ قد کو سنبھلنے کا موقع ملا۔

لیکن اچانک وہ دوہرا ہو گیا۔ اور اس کا ایک ہاتھ پشت پر چلا گیا۔ دوسری بار اس نے اپنی ٹانگ پکڑ لی۔ اور شارق نے اپنی تلوار سے اس کی گردن اتار دی۔ تمام میدان خوفناک نعروں سے گونج اٹھا تھا۔

بے شمار لوگوں نے شارق کے گرد حلقہ بنا لیا۔ اور پھر وہ اسے حلقے میں لئے ہوئے ایک طرف چل پڑے۔ شارق اب اسفانہ کا مالک اور قبائلیوں کے ایک بڑے گروہ کا سردار تھا۔

جس غار میں شارق کو رکھا گیا تھا۔ وہ بہت عمدگی سے آراستہ کیا گیا تھا۔ جانوروں کی کھالوں اور قیمتی ہیروں سے اسے سجایا گیا تھا۔ نرم کھالیں فرش پر بچھی ہوئی تھیں۔ دو سیاہ فام خادمائیں ہاتھ باندھے کھڑی تھیں۔

"غسل کا اہتمام ہو گیا ہے مقدس بوکاشو۔" ایک اور خادمہ نے آکر کہا۔

"غسل۔ کیا وہ ضروری ہے۔"؟

"ہاں۔ جنگ کی تھکن اتارنے کے لئے بیحد ضروری۔ اور جب چاندنی نکلے تو آپ مقدس دیوی کے حضور ہوں گے۔"

"اوہ۔ تو پھر چلو۔" شارق جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ پھر اسے غسل پر بہت شرم آئی۔ نصف درجن خادماؤں نے اسے لباس سے بے نیاز کر دیا۔ اور شارق اچھل پڑا۔ اس طرح تو اس کی پول کھل جاتی۔

"تم لوگ جاؤ۔ میں غسل کر لوں گا۔" اس نے خیمے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہم آپ کے بدن پر تھکن اتارنے والے روغن کی مالش کریں گے اور آپ بالکل پہلے کی مانند ہو جائیں گے۔"

"اگر میں پہلے کی مانند ہو گیا تو تم لوگ جوتے مار کر یہاں سے نکال دو گے۔"!

"ہم نہیں سمجھے مقدس مالک۔"

"یہی تو میرے حق میں بہتر ہے۔ اور سنو میں بالکل ٹھیک ہوں= تھکن اتارنے والا روغن اگر تم نے میرے بدن پر مل دیا تو پھر مجھے قتل کرنے کے لئے دس بیس آدمی درکار ہوں گے۔ اس لئے تم مجھے یونہی رہنے دو۔"

"مگر یہ بڑے پجاری کا حکم ہے۔"

"کیا حکم ہے۔"؟

"یہی کہ تمہیں خوشبویاب میں بسا کر رات کی عبادت کے لئے تیار کر

دیں۔"

"رات کی عبادت کیا ہو گی۔"؟

"اسفانہ کی زیارت۔"

"تب پھر تم ایسا کرو۔ خوشبویاب میرے بدن پر مل دو باقی سب خیریت ہے۔"

شارق کی الٹی سیدھی باتیں خادماؤں کی سمجھ میں نہ آ رہی تھیں۔ وہ بیچاری کیا جانتی تھیں کہ اگر وہ اسے نہلائیں گی تو اس کے بدن کی سیاہی اتر جائے گی۔اور پھر۔"

بہر حال شارق نے بکواس کر کے انہیں ٹال دیا اور پھر وہ خوشبویات میں بس کر اور ایک مختصر لباس پہن کر تیار ہو گیا۔ ہیروں کی ایک مالا اس کی گردن میں ڈال دی گئی جو اس کا امتیاز تھی۔ شارق کے دل میں گدگدیاں ہو رہی تھیں اس نے اسفانہ کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی نہ جانے نہ جانے وہ کیسی ہو گی۔"

رات کو بڑے پجاری کے سامنے پیش کیا گیا۔ عجیب ہیت کا انسان تھا۔ شارق کو اسکی شخصیت بے حد پر اسرار معلوم ہوئی۔" تمہارا تعلق کون سے قبیلے سے ہے۔"

" یوگاش سے۔" شارق نے جلدی سے جواب دیا۔

" یوگاش۔ تمہارے قبیلے پر برکتیں نازل ہوں۔ میں تمہیں اس برتری کی مبارک باد دیتا ہوں۔"

" میں تمہارا شکر گزار ہوں بڑے پجاری۔

" تمہارا قبیلہ ان سارے قبیلوں سے برتر واعلیٰ رہے گا۔ لیکن تمہارے اوپر جو ذمہ داریاں آ پڑیں گی تم انہیں نبھا سکو گے۔"؟

"کیوں نہیں بڑے پجاری۔ اگر مجھے اسفانہ کی قوتیں حاصل ہوں گی تو میں ہر مسئلے سے نمٹ سکتا ہوں۔

" ہاں وہ عظیم ہے وہ حکمران ہے وہ برکت کی دیوی ہے۔ جاؤ عقبی جھیل کے تالاب میں تمہاری اس سے پہلی ملاقات ہو گی۔ اور میں نے گردن جھکا دی اور اس کے پاس سے اٹھ آیا۔

عقبی جھیل جس کا ذکر کیا گیا تھا ایک سوراخ سے گزرنے کے بعد نمودار ہوئی تھی اور اس سوراخ کے بارے میں شاید بڑے پجاری کو معلوم تھا۔ دوسری جانب کا منظر چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔ چاند کی حسین روشنی قدرتی سبزہ زاروں پر نچھاور ہو رہی تھی۔ پھولوں کے کنج لہلہا رہے تھے اور ان پھولوں کے درمیان تالاب چاندی کا تالاب معلوم ہو رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اس تالاب تک پہنچ گیا۔ اور تب میں نے دیکھا کہ سفید پتھر پر ایک سنگی بت ایستادہ ہے جس کے عضو عضو سے روشنی پھوٹ رہی ہے میں سحرزدہ سا اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ وہ سنگی بت اسفانہ تھی۔ چاندنی اس کے جسم کے گرد حصار کھینچے ہوئے تھی تب میں اس کے کچھ اور نزدیک ہو گیا۔

ہیروں کے خوبصورت زیورات میں لدی ہوئی ایک عجیب و غریب تمکنت کی مالک' ایک ایسا حسن جو خوابوں میں بھی دیکھنے کو نہ ملے۔ میں مبہوت اسے دیکھتا رہا' وہ نگاہیں جھکائے بیٹھی تھی۔ پھر اس نے گہری سی سانس لے کر سر اٹھایا اس کی آنکھوں میں عجیب و غریب تاثرات تھے۔

" اسفانہ۔" میں نے اسے بھاری آواز میں پکارا۔ یہ آواز خمار آلود تھی۔

اس نے نگاہیں اٹھائیں اور مجھے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں کوئی تاثر نہیں تھا۔ پھر وہ آہستہ سے بولی۔

"کیا نام ہے تمہارا۔"

" شارق۔"؟

"کون سے قبیلے سے تعلق رکھتے ہو۔"؟

"یوگاش سے۔"

"وہی وحشیانہ رسمیں ہوں گی تمہاری ۔ دوسرے تمام سیاہ فاموں کی ط
تمہارے خدوخال تو بدنما نہیں ہیں لیکن تمہاری وحشت خیزی۔ تم نے میرے ۔
بیشمار لوگوں کو قتل کیا ہوگا۔"؟

"مجبوری تھی۔ ورنہ تم جیسی حسین ساتھی کے لئے تو صرف پھول ہو۔
چاہیں۔"

" تعجب کی بات ہے۔ تمہارے الفاظ تو خوبصورت ہیں۔ میں نے یہ با
اس لئے نہیں کہی کہ تم نے میری ستائش کی ہے بلکہ مجھے صرف اس بات پر حیر
ہے کہ تمہارے اندر ذوق لطیف موجود ہے۔"

"شکریہ اسفانہ۔"

"کیا تمہارا قبیلہ مہذب ہے۔"؟اس نے سوال کیا۔ "تمہارے سوال
جواب دینے سے پہلے ایک سوال میں بھی کروں گا۔"میں نے کہا۔

"کیا تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو۔ تمہارا رنگ سفید ہے۔ اور تمہار
گفتگو سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ تمہیں افریقی لوگ پسند نہیں ہیں۔"

"یہ بات نہیں ہے شارق۔ اگر میں انہیں پسند نہیں کروں گی تو۔ پھر ک
کروں گی۔ چھوڑو ان باتوں کو مجھے ایک بات بتاؤ۔"

"پوچھو۔"

"کیا تم نے مجھے صرف اس لئے حاصل کیا ہے کہ اپنے قبیلے کے لئے برکتیر
حاصل کرو۔"اس کی نگاہوں میں عجیب سی کیفیت تھی۔

"یہ سوال کیوں کر رہی ہو اسفانہ۔"؟

"اچھا چلو چھوڑو۔ آؤ۔ اب تم میرے مالک ہو۔ ہمیں چاندنی رات کا پہلا
غسل کرلینا چاہیئے۔ ورنہ تمہارا جنگجو ذہن۔ ممکن جھل جھلاہٹ کا شکار ہو جائے۔"

"کم ازکم میرے ایک سوال کا جواب ضرور دیدو۔"شارق نے کہا۔

"کونسا سوال۔"؟

"کیا تم ان میں سے نہیں ہو۔"

"نہیں میں ان میں سے نہیں ہوں۔ بلکہ ایک طویل عرصہ ہوا۔ اتنا طویل
اب تو مجھے بہت سی باتیں یاد بھی نہیں۔ ان لوگوں نے مجھے میری ماں اور باپ
چھین لیا تھا۔ پھر نہ جانے کیا کیا ہوا۔"؟

"تمہیں اپنے ماں باپ یاد ہیں۔"؟

"ہاں۔ ان کے خاکے میرے ذہن سے نہیں اتر سکے۔"

"تمہیں ان کی زبان یاد ہے۔"

"ہاں مجھے اپنی زبان یاد ہے۔"

" بہرحال مجھے افسوس ہے کہ تم دل پر کوئی بوجھ رکھتی ہو۔ میں کوشش
ں گا اسفانہ کہ تمہیں تھوڑی سی خوشیاں دے سکوں۔"

اسفانہ نے مجھے دیکھا اور پھر کھڑی ہوگئی۔ اس کی قدوقامت اس کی چال
دلکش تھی۔ پھر اس نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔"لیکن اب میں
اداس نہیں ہوں۔ وہ ایک ادا سے جھیل کی جانب بڑھتی ہوئی بولی۔

"کیوں۔"؟

"اس لئے کہ کسی ایسے جنگجو کا تصور میرے لئے بہت خوفناک تھا جو بیشمار
وں شکست دیکر مجھ تک پہنچے۔ میں سوچتی تھی کہ وہ کوئی بہت خوفناک انسان ہوگا
ن تم بیحد نرم زبان اور خوش گفتار انسان ہو۔"

دونوں جھیل کے کنارے پہنچ گئے اور پھر اسفانہ نے شرم آلود نگاہوں سے
ق کی طرف دیکھا۔ شارق کا ذہن عجیب کیفیات کا شکار تھا۔ بہرحال رسم پوری
ی تھی۔ اس نے چاندنی میں ایک حسین پیکر دیکھا جو غڑاپ سے پانی میں کود گیا۔
پھر اس نے گردن باہر نکالی۔

"کیا تم پانی میں آنے سے خوفزدہ ہو۔؟

"نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔" شارق نے کہا اس کی کنپٹیاں
تھیں۔ پھر وہ بھی پانی میں اتر گیا۔ اسفانہ اس سے دور نہیں تھی۔ وہ کسی
پر آمادہ ہو گئی تھی۔ اس نے شارق کی گردن پکڑ کر اسے پانی میں ڈبو دیا۔
کے بعد مجھے کچھ یاد نہ رہا۔ اور اس کے ساتھ خوش فعلیاں جاری رہ
اچانک ہی اسفانہ کی نگاہ میرے چہرے پر پڑی اور وہ کپکپا کر پیچھے ہٹ گئی
ہنستے ہوئے ہونٹ بند ہو گئے اور آنکھوں میں عجیب سا خوف سمٹ آیا۔
نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوا اسفانہ۔" میں نے تعجب سے پوچھا۔ لیکن اسفانہ نے ک
نہ دیا۔ وہ ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ دفعتاً مجھے اپنے چہرے کا خیال
سے پہلے میں نے اپنے ہاتھ کو دیکھا اور میرے منہ سے گہری سانس نکل گئی
ہاتھ سے وہ روغن اتر چکا تھا۔ اس کا مقصد ہے یقینی طور پر چہرہ
ہو گیا ہو گا۔ چنانچہ میرے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کیا دیکھ رہی ہو اسفانہ۔"

تم تم۔ تمہارا۔ رنگ۔ تمہارا چہرہ۔"

"جو کچھ بھی ہے اسفانہ، جیسا بھی ہے۔ اب تو میں تمہارا شو
شارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔"

"لل، لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ تم۔ تم تو۔"

"آؤ اگر تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تو پھر اس جھیل سے باہ
میں نے کہا اور اسفانہ کا ہاتھ پکڑ کر کنارے کی جانب بڑھ گیا۔
کے بعد ہم اپنے لباس وغیرہ پہن کر ایک خوبصورت جگہ جا بیٹھے۔ اسفا
نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا شارق۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں

"کیا سمجھنا چاہتی ہو اسفانہ۔"

"تم۔ یہ اچانک۔ بالکل اچانک تمہارا رنگ کیسے بدل گیا۔ تم تو بالکل سفید
ہو۔"

"حالانکہ میرا تعلق سفید نسل سے نہیں ہے اسفانہ۔ میں تمہیں اپنے
ے میں تفصیل سے بتانا چاہتا ہوں۔ میرے باپ کا نام تیمور ہے۔"
ازبورا کا حکمران تیمور۔ اور یہ ریاست افریقہ ہی کے ایک علاقے کی ہے
ں وہ علاقہ جو کسی حد تک مہذب دنیا میں شمار ہوتا ہے اور جس کا تعلق ان قبائل
، بالکل نہیں ہے۔ یعنی اس علاقے کے لوگ کبھی یہاں نہیں آتے میں مہم جوئی
، شوق میں یہاں تک آگیا تھا اور یہاں آکر میں ان حالات کا شکار ہو گیا۔ پھر ایک
ات میں نے تمہاری جھلک دیکھی اور اس کے بعد میں نے طے کر لیا کہ تمہیں
صل کرنے کے لئے شدید جدوجہد کروں گا۔ میرا قبیلہ اسفانہ اس برتری کا قائل
ں ہے جو تمہیں حاصل کرنے کے بعد مجھے حاصل ہو گی۔ میں نے تو صرف ذاتی
ند کی بنا پر حاصل کیا ہے۔ اس میں قطعی یہ خیال نہیں کہ تمہارے وجود سے
ری ریاست پر کون سی برکت نازل ہوں گی۔ میں نے تمہارے وجود کو محسوس کر
ے تمہیں اپنایا ہے۔" شارق نے محبت سے کہا۔

اسفانہ کا چہرہ اچانک پھول کی طرح کھل اٹھا تھا۔ اداسی کی وہ لکیریں جو اس
کے چہرے پر نمایاں تھیں وہ ایک دم مفقود ہو گئیں۔ تب اس نے چند قدم آگے
ڑھ کر کہا۔ "کیا واقعی شارق، کیا واقعی۔"

"ہاں" شارق نے جواب دیا۔

"تب تو۔ تب تو مجھے اپنی خوش نصیبی پر شک نہیں کرنا چاہئے۔ یوں
سمجھا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ میری عمر کے اس سال نے مجھے ان اداسیوں سے نکال
لیا ہے جو میرا مقدر بن چکی تھیں۔"

"اداسیاں۔ مقدر۔ میں نہیں سمجھا اسفانہ۔"

"میں تمہیں کسی حد تک بتا چکی ہوں کہ میری بھی ایک کہانی ہے۔"

اسفانہ نے کہا۔" میں نے تمہیں اپنے بارے میں بتا دیا اسفانہ
مجھے اپنے بارے میں تفصیل سے بتا دو تو میں تمہارا شکر گزار ہوں گا۔"
" میری تفصیل ۔ یقین کرو شارق میرے ذہن میں الجھی ہوئی
چند چیزیں مجھے یاد ہیں۔ میں بھولی نہیں ہوں۔" اسفانہ نے کہا اور خاموش
"کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گی اسفانہ۔" شارق نے پوچھا۔
"ہاں ہاں کیوں نہیں میری ایک ممی تھیں' ڈیڈی تھے اور ہم
زندگی گزار رہے تھے ڈیڈی مہم جوئی کے شوق میں افریقہ آئے تھے۔ او
بعد حالات نے انہیں مجھ سے چھین لیا۔ اور اس کے بعد وہ مجھے نہیں ملے
کی تصویریں آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ اس کے بعد مجھے یہاں
اور عجیب و غریب انداز میں میری پرورش کی جانے لگی۔ ایک طویل عرصہ
سوچ کو ختم کر دینے کا باعث ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ میں سب کچھ فرامو
میں کامیاب ہو گئی۔ لیکن میرے ذہن کے گوشوں میں ایک تڑپ اب بھ
ایک احساس اب بھی ہے کہ کاش مجھے میری ممی ڈیڈی مل جائیں۔"
"اوہ تو تمہارا تعلق کسی مغربی ملک سے تھا۔"
"ہاں۔"
"تمہیں اپنے ڈیڈی یاد ہیں۔"
"نہیں شارق بہت سی باتیں بھول گئی ہوں۔"
"تو کیا تمہیں ان کا نام بھی معلوم نہیں ہے شارق نے پوچھا
"نہی کچھ تو میرے ذہن میں بھی نہیں ہے اور نا ہی ان کا نام مجھے
بس کچھ مبہم سے خیالات ذہن کے پردوں سے ٹکراتے ہیں اور اس وقت
ذہن میں آ جاتی ہیں۔ لیکن میں ان میں کوئی خاص نقطہ تلاش نہیں کر پاتی۔"
"مجھے افسوس ہے اسفانہ" لیکن اب کیا ہو گا۔"
"کیا مطلب " اسفانہ نے پوچھا۔

"کیا میں تمہیں یہاں سے لے کر جا سکتا ہوں۔"
"شارق یہ کام آسان نہیں ہو گا۔ تمہارے قبیلے کو انہی قبائل میں سے
ہے جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں میرا مطلب ہے دیوی کی حکومت کا عقیدہ۔ اگر
معلوم ہو گیا کہ تم ان قبائل میں سے نہیں ہو تو پھر شاید یہ لوگ ہنگامے
۔"
"تو اس کے لئے کیا کیا جائے اسفانہ۔"
"میں کیا کہہ سکتی ہوں شارق۔" اسفانہ نے جواب دیا۔
"تو پھر ایسا کرو کہ فوری طور پر اس علاقے کو چھوڑیں۔" شارق نے کہا۔
"اوہ۔ کیا تم اتنی ہمت کر سکتے ہو۔"
"ہمت کی بات نہ کرو اسفانہ میں نے تمہیں حاصل کرنے کے لیے جو کچھ
ے وہ بے ہمتی کا مظہر نہیں ہے اگر یہ بات ہے تو پھر میں تمہیں یہاں سے نکال
لے جا سکتی ہوں۔ میں اس علاقے کی دیوی ہوں۔ بہت سارے معاملات کے
ھے اس علاقے سے روشناس کرایا گیا ہے۔ میں ایسے راستے جانتی ہوں جو ہمیں
ے لے جا سکتے ہیں۔ تمہیں گھوڑے بھی مل جائیں گے اور سفر کے لئے دوسری
ں بھی اور ان سہولتوں کا فراہم کرنا میرا کام ہو گا۔" اسفانہ نے کہا۔
"کیا واقعی اسفانہ۔" شارق نے تعجب سے پوچھا اور اسفانہ نے گردن ہلا
اس کی آنکھیں مسرت سے چمک رہی تھیں۔
"اگر یہ بات ہے اسفانہ تو میرا خیال ہے ہمیں ان راستوں سے پورا پورا
اٹھانا چاہیے۔"
"میں تیار ہوں۔" اسفانہ نے جواب دیا۔
"اور میرے بھائی اور بہن میں بھی تیار ہوں۔ عقب سے ایک آواز آئی
ہ دونوں اچھل پڑے۔
"یہ راشد تھا۔ نجانے کم بخت کہاں سے آن مرا تھا۔ شارق اسے دیکھ کر

بری طرح اچھل پڑا۔ اور پھر اس کے چہرے پر حیرت کے شدید آثار پھ
راشد مسی سی شکل بنائے کھڑا تھا۔

"تم۔ تم راشد۔"

"جی ہاں۔ یقیناً آپ کو ناگوار گزرا ہو گا لیکن مجھے بھی تو جان بچا
ہے۔" راشد نے بدستور برے منہ سے کہا۔

"مگر میرے دوست تو یہاں تک کیسے پہنچے۔ اور تم چلے گئے تھے۔
نے تعجب سے پوچھا اور راشد نے برا سے منہ بنایا۔

"جی ہاں چلا گیا تھا۔ اور وہ آپ کے ساتھ مقابلہ کون کر رہا تھا"
کے ملازم بھی یہاں موجود تھے۔" راشد تیکھے لہجے میں بولا۔

"کیا مطلب۔"؟

چھوڑو یار۔ اب خواہ مخواہ اپنی بھابی کے سامنے تمہاری پول کھو
دیکھ رہے ہو۔ راشد نے اپنی بغل سے غلیل نکال کر شارق کے سامنے کر دی

"کیا مطلب۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو راشد۔"؟

"میرے بھائی وہ میرے غلے ہی تھے جو تمہارے مقابل کی کبھی آنکھ
دیتے تھے' کبھی کمر پھوڑ دیتے تھے اور تم باآسانی اسے قتل کر دیتے تھے۔"
نے کہا اور شارق سچ مچ دنگ رہ گیا۔ اسے یاد آگیا تھا کہ اس نے اپنے مقا
کس طرح شکست دی تھی۔ پھر اس نے راشد کو چمٹا لیا۔

"انتہائی موقع سے ملے ہو یار' ہم لوگ فرار کا پروگرام بنا
تھے۔" شارق نے اسے لپٹائے لپٹائے کہا۔

"میں تو شروع ہی سے تمہاری تاک میں تھا۔ ہاں البتہ تالاب کے کن
موجود نہیں تھا۔ قسم کھا رہا ہوں۔ میں یہی سوچتا تھا کہ کسی بھی وقت فرار کا
مل سکا تو میں ضرور فرار ہو جاؤں گا۔" راشد نے کہا

"تو پھر آؤ۔" اسفانہ کی کہانی عجیب و غریب ہے۔

"میں سن چکا ہوں۔" راشد نے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد تین گھوڑے رات کی سیاہی میں جنگل کے ایک تنگ و
ریک درے میں پرواز کر رہے تھے' ان کی رفتار بہت تیز تھی۔ اسفانہ ان قبائل
کی دیوی ان دو گھوڑوں کی رہنمائی کر رہی تھی' اور یوں لگ رہا تھا جیسے کچھ پر
اسرار قوتیں ان کی مدد کر رہی ہوں پچھلے دو گھوڑے سوار راشد اور شارق تھے۔

ازبورا کے حکمران تیمور نے اپنے مہم جو بیٹے کو دیکھا اور اس کا چہرہ خوشی
سے کھل اٹھا۔

"آہ۔ میرا عظیم بیٹا اپنے باپ کی تصویر شارق آ۔ میں تجھے سینے سے لگاؤں
حالانکہ اتنی طویل مہم مجھے پسند نہیں ہے۔ حالانکہ میں تجھ سے زیادہ طویل مہمات کا
قائل رہا ہوں۔ بول تو نے اس مہم میں کیا دیکھا اور کیا تیری خواہشات کی تکمیل
ہوئی۔" تیمور نے پوچھا۔

"ہاں بابا۔ آپ نے میرے ساتھ جن لوگوں کو کیا تھا۔ میں انہیں دھوکا
دیکر ان اندرونی علاقوں میں داخل ہو گیا۔ جہاں جانے کے لئے آپ مجھے منع کرتے
تھے لیکن ان اندرونی علاقوں سے میں ایک ایسا ہیرا نکال کر لایا ہوں جسے دیکھ کر آپ
دنگ رہ جائیں گے۔"

"ہیرا۔ ہمیں ہیروں کی کیا ضرورت ہے بیٹے۔"!

"ہمیں ضرورت ہے بابا۔ آپ کہا کرتے تھے ناکہ اگر آپ میرے پاؤں میں بیڑی
ڈال دیں گے تو شاید میں مہم جوئی کی اس عادت کو ترک کر سکوں' کیونکہ آپ کے
ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔"

"اوہو۔ ہوہو۔ کہاں ہے وہ ہیرا۔" تیمور نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا
اور شارق نے راشد کو آواز دی۔

"راشد افریقہ کے اندرونی علاقوں کا بیش قیمت ہیرا میرے باپ کے سامنے
کرو۔" اور راشد اسفانہ کے ساتھ آگے بڑھ آیا۔ تیمور نے اسے دیکھا اور دیکھتا ہی

رہ گیا۔ پھر اس کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار نظر آنے لگے۔

"میری آنکھیں اور میری یادداشت پورے ازبوّرا میں مشہور ہے تو کیا مگر بے وقوف لڑکے۔ کیا۔ کیا تو اس صورت میں کچھ جھلکیاں نہیں پاتا۔"؟ تیمو نے شارق کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کیسی جھلکیاں بابا۔"

"کیا تیرے چچا گوئین کی بیوی سیلی کی جوانی کی شکل نہیں ہے۔" تیمور نے پوچھا۔ اور دفعتاً شارق کی آنکھوں میں عجیب سے تاثرات سمٹ آئے۔ پھر وہ کہنے لگا۔

"بابا مجھے وہ کہانی یاد ہے۔ اوہ۔ اوہ۔ میں واقعی بیوقوف ہوں۔ ہاں بابا اس کی کہانی وہی کہانی ہے جو میرے چچا گوئین کی کہانی ہے جو میرے چچا گوئین کی کہانی ہے، سنو، اسفانہ کیا تمہارا نام نوشین تھا۔

"نوشین۔" اسفانہ کے منہ سے بے اختیار نکلا

"نوشین۔" دوسری آواز تیمور کی تھی وہ لپک کر اسفانہ بغل گیر ہو گیا تھا۔" میری بچی میری بیٹی میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ میں نے تجھے پہلی نگاہ میں پہچان لیا تھا۔ آہ وہ کام جو میں نہ کر سکا تھا میرے بیٹے نے کر دکھایا۔ چلو شارق تیاریاں کرو، ہم تمہارے چچا کے پاس لندن چلیں گے۔ ویسے بھی تمہارا ان کے پاس جانے کا ارادہ تھا لیکن آج ہم اتنے سرخرو ہو کر جائیں گے کہ تصور نہیں کیا جا سکتا آج ہم ان کی بیٹی نوشین کا قرض اتارنے جا رہے ہیں جو افریقہ پر تھا۔ اور شارق خوشی سے اچھل پڑا۔

راستے میں شارق نے نوشین کو اس کی کہانی سنائی۔ بابا تیمور نے مجھے مستقل طور پر انکل گوئین کے حوالے کر دیا تھا۔ میں نے وہیں پرورش پائی ہے اور وہیں رہتا ہوں۔ بس تفریحات کا شوق مجھے جنگلوں میں لے جاتا ہے۔

نوشین نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اپنے تصور میں اپنے ماں باپ کی شکلیں

تلاش کر رہی تھی۔ اور ان کے تصور سے اس کے دل میں مسرت کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ آہ۔ جب وہ لوگ اسے پائیں گے تو ان کی کیا حالت ہو گی۔'

بڑا فنکار

ہوٹل ڈائمنڈ کے خوبصورت لان میں دھوپ سے بچاؤ کے لئے خوبصورت چھتریاں لگی ہوئی تھیں۔ اور ان چھتریوں کے نیچے بہت سارے لوگ دھوپ چھاؤں کے اس حسین امتزاج کا مزہ لے رہے تھے۔

ایک چھتری کے نیچے ہلکے کریم رنگ کے کپڑے پہنے' پاؤں میں آرام دہ چپل پہنے ایک دراز قامت اور رخوشرو نوجوان بیٹھا تھا۔ صاف ستھرا چہرہ تھا' کھلتا ہوا رنگ' متناسب نقوش اور نرم آنکھوں والے اس نوجوان کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ ایک سفاک قاتل' ماہر نقب زن' دلیر رہزن اور بڑا مشہور جعلساز ہے۔ شاید یہ بات اس کی خوبصورت ساتھی کو بھی نہیں معلوم تھی۔ جو اس کے نزدیک موجود تھی۔

جعلسازی کی تربیت اس نے بڑے بڑے استادوں سے لی تھی' یہ الگ بات ہے کہ اس کا تعلق 'یورپ اور امریکہ جیسے ملکوں سے نہیں تھا' ورنہ شاید وہ کسی جرائم پیشہ کلب کا منتظم اعلی ہوتا۔

تابش کا تعلق ایشیائی ممالک سے تھا' جرائم کی دنیا میں اس کی آمد کیونکر ہوئی اس کی بھی ایک بنیادی وجہ تھی۔ ماں بچپن ہی میں مرچکی تھی اس کی پیشانی' رخسار گردن یا جسم کے کسی بھی حصے پر خلوص' محبت یا ممتا کے کسی لمس کا وجود نہیں تھا اس نے اپنے ذہن میں بچپن سے جوانی تک کے لمحات کو دوہرایا۔ جہاں تک اس کے حواس نے اس کا ساتھ دیا' اسے کوئی ایسا لمس یاد نہیں آیا جہاں کسی محبت کا گزر ہوتا۔

اس کے باوجود اسے یقین تھا کہ اس نے جب اس دنیا میں پہلی بار آنکھیں کھولی ہوں گی تو یقینی طور پر اس کی ماں نے پیار سے اس کی آنکھوں کو چوما ہوگا'

اس کے گالوں پر پیار کیا ہوگا۔ اس کے نرم وجود کو محسوس کیا ہوگا۔ اور یہ بات اس کے لئے باعث اذیت تھی۔ کاش وہ اس وقت محبت کے ان جذبات سے بے خبر ہوتا۔ کاش وہ اتنا چھوٹا نہ ہوتا کہ ماں کے اس لمس کو محسوس نہ کر پاتا۔ اور تب شاید اس کی زندگی محرومیوں سے آشنا نہ ہوتی۔ وہ اس جگمگاتی' خوبصورت دنیا سے بیزار نہ ہوتا۔

لیکن اب۔ اب تو اسے اس جگمگاتی ہوئی دنیا سے بے پناہ نفرت تھی۔ ایسی دنیا کس کام کی جہاں محبت کا کوئی لمس نہ ہو۔ اور محبت کا یہ لمس اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ اور یہ لمس کہیں نہیں ملتا اپنے وطن میں بھی نہیں جس کی مٹی کو ماں کہا جاتا ہے' غیر ممالک میں بھی نہیں۔ اور پھر مٹی حیثیت کیا رکھتی ہے اس کا تعین کیونکر کیا جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو کونسی شے اپنی ہوتی ہے' انسان ہر جگہ ایک ہی انداز میں سانس لیتا ہے' ایک ہی انداز میں سوتا ہے' محبت کا لمس ہر جگہ ہوتا ہے لیکن ملتا نہیں ہے۔

اس نے نفرت بھری نظروں سے سامنے بیٹھی ہوئی فیملی کو دیکھا۔ شاید میاں بیوی تھے' ان کے ساتھ ان کا ایک بچہ تھا' حالانکہ ماں بہت خوبصورت نظر آ رہی تھی لیکن باپ بالکل الگ تھا اور بچہ ہو بہو باپ کی کاپی تھا۔ اس کے باوجود ماں کی آنکھوں میں پیار تھا' ایک انوکھی چمک تھی' اس بد شکل بچے کے لئے ماں کی ممتا ابل پڑ رہی تھی۔ بچہ ماں کی گود میں تھا اور ماں اپنے بچوں کو بار بار پیار کر رہی تھی۔

اس کے بدن میں تھرتھری دوڑ گئی۔ کاش۔ کاش۔ وہ بھی بچہ ہوتا۔ ماں اسے چومتی جاتی' پیار کرتی' اپنے بازوں میں لے لیتی۔ کاش---- کاش انسان ایک بار پیدا نہ ہوتا' بار بار پیدا ہوتا' مختلف شکلوں میں مختلف بھیسوں میں' تاکہ اسکی ذات کچلی نہ جاتی' ایک مخصوص حیثیت اس پر مسلط نہ ہوتی۔ اسے ایک بار زندگی ملتی وہ محدود نہ ہوتی۔ اور اگر بار بار پیدا ہوتا رہتا تو شاید اس کی ہر طلب پوری ہو جاتی یہ طلب چاہے ماں پوری کرتی یا بیوی یا محبوبہ۔ طلب تو پوری ہوتی۔

اس کا ذہن چکرا رہا تھا۔ اس کا پورا وجود سنسنا رہا تھا' وہ سوچ رہا تھا کہ ایک بار اس عورت کے پاس جائے اس کے بچے کو اس کی گود سے لے کر دور بہت دور پھینک دے اور خود اس کے شفیق بازوؤں میں لیٹ جائے۔ اور وہ عورت اسے اسی انداز میں پیار کرے جس انداز میں وہ اپنے بچے کو کر رہی تھی۔ لیکن وہ انسانوں کی فطرت جانتا تھا۔

یقینی طور پر عورت خوفزدہ ہو جاتی اور مرد اس کو مارنا شروع کر دیتا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس عورت کا اپنا نہیں ہے۔ اور اسے وہ شام یاد آگئی جب اسکے پاپا سرخ گٹھری میں ملبوس ایک عورت کو لے کر آئے تھے۔

"کون ہیں پاپا۔" اس نے نہایت اشتیاق سے پوچھا تھا۔

"تمہاری امی ہیں بیٹے۔"

"امی۔" اس نے تعجب سے اس سرخ گٹھری کو دیکھا اور محبت کی ایک انوکھی لہر اس کے ننھے سے وجود میں سرایت کر گئی۔

ہاں بیٹے آپ کی امی۔" پاپا نے نہایت شفیق لہجے میں کہا تھا' اور وہ اس سرخ لباس سے لپٹ گیا۔ پاپا اپنے بیٹے کو اپنی نئی دلہن کے پاس چھوڑ کر باتھ روم میں چلے گئے۔ اس کے ساتھ ہی سرخ لباس کو جنبش ہوئی اور اس ننھے وجود کو بیدردی سے الگ کر دیا گیا۔ پہلی بار' اپنی زندگی میں پہلی بار اس کو اس انداز میں دھتکارا گیا اور وہ حیران رہ گیا۔ پاپا کے وہ الفاظ گولہ بن کر اس کے حلق میں اٹکنے لگے کہ امی اسے پیار کریں گی۔

لیکن اس نے اسے کبھی نہ چاہا۔ کبھی پیار نہ کیا۔ ان کے ہونٹ کبھی اسے چومنے کے لئے آگے نہ بڑھے۔ ہاں اس نے بارہا دیکھا۔ بارہا محسوس کیا۔ امی پاپا کو چومتی تھیں۔ پاپا کو سینے سے لگاتی تھیں۔ اور وہ منتظر رہتا۔ اس کی ڈبڈبائی آنکھیں اس عورت کے وجود کا ہالہ کئے رہتی۔ شاید۔ شاید محبت کی کوئی رمق اس کے لئے بھی ہو۔ لیکن یہ خواہش خواہش ہی رہی۔ امی نے نہ تو اسے کبھی پیار کیا اور نہ ہی

اسے سینے سے لگایا۔

کچلے جانے کا یہ احساس اس کے لئے بڑا تکلیف دہ تھا تب اس نے ایک دن اپنے پاپا سے کہا۔ اس کی نئی امی بھی وہیں موجود تھیں۔

"پاپا۔ ایک بات کہوں۔"

"ہاں بیٹے ضرور۔" پاپا نے جواب دیا۔

"پاپا آپ تو کہتے تھے امی مجھے پیار کریں گی۔ لیکن امی تو مجھے کبھی پیار نہیں کرتیں۔"

اور بے خبر پاپا کی آنکھیں نغمانہ کی طرف اٹھ گئیں۔ "کیوں نغمی تم اسے پیار نہیں کرتیں۔"

اور نغمانہ بیگم کی بری حالت ہو گئی' انہوں نے کڑی نگاہوں سے اس معصوم بچے کو دیکھا۔ شوہر کے سامنے اور کچھ تو نہ بولیں۔ البتہ بعد میں ان کا رویہ اس بے ضرر بچے کے ساتھ ضرورت سے زیادہ سخت ہو گیا۔ انہوں نے اس کی زندگی حرام کر دی۔

پاپا کو اپنے معصوم بچے کا حال معلوم تھا لیکن وہ تو بزدل مردوں میں سے تھے۔ وہ نغمی بیگم کے سامنے بالکل بے بس تھے' پیار کا لمس دینے کی بجائے یا دلجوئی کرنے کے وہ نغمی بیگم کو خوش کرنے کے لئے اس سے برا سلوک کرنے لگے۔ ہاں البتہ ایک کام انہوں نے ضرور کیا

انہوں نے تعلیم کے لئے اسے بورڈنگ میں داخل کرا دیا۔ اس طرح اسے امی اور پاپا کے مظالم سے نجات مل گئی لیکن محبت کی کمی کا احساس' محرومی کا یہ دکھ اس کی رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ جوں جوں اس کی عمر بڑھی اسے احساس ہوتا گیا کہ دنیا میں بہت کچھ ہے لیکن کچھ نہیں ہے۔ پیار کا ایک بوسہ اس کی کمزوری بن کر رہ گیا ہے۔ محبت سے محرومی کا شکار بچہ عجیب عجیب طریقوں سے لوگوں سے محبت حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن اتفاق تھا کہ کوئی اس کی جانب راغب

نہیں ہوتا تھا۔

اور پھر موسم بادو بہاراں آگیا۔ وہ مکمل جوان تھا۔ اور جوانی کی ساری خصوصیات اس میں موجود تھیں۔ وہ خوش شکل بھی تھا' خوش لباس بھی اور اتفاق کی بات کہ جب اس کی عمر اکیس برس ہوئی تو اس کے پاپا کا انتقال ہو گیا' نغمی بیگم کی کوئی اولاد نہ ہوئی تھی' اس وجہ سے اپنے باپ کی ساری دولت کا وارث وہی تھا۔

پاپا کی موت کا کوئی تاثر اس کے ذہن میں نہ ابھرا۔ بلکہ ایک طرح سے اس نے خدا کا شکر ادا کیا تھا۔ عرصہ دراز سے اس کا اپنے پاپا اور سوتیلی ماں سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ وہ بھول گیا تھا کہ اس کی امی بھی ہیں اور پاپا بھی ہیں۔ طویل عرصہ گزر گیا تھا ان لوگوں کو دیکھے ہوئے' حالانکہ شروع میں اس نے اپنے پاپا کو کئی خط لکھے لیکن پاپا نے کبھی انکا جواب دینے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اور تھک ہار کر وہ بھول گیا کہ اس کے پاپا بھی ہیں۔

پاپا کی عنایت کردہ جائداد سے اسے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی' وہ ہاتھ پاؤں پر بھرپور یقین رکھتا تھا۔ لیکن بہرحال باپ کی چھوڑی ہوئی جائداد اسے سنبھالنی ہی پڑی اور یوں وہ اپنے باپ کی جائداد اور ملکیت کا قائم مقام بن گیا۔ کمپنی کے دفتر میں اسے بہت سارے چہرے نظر آئے' ہاں ان میں ایک چہرہ اس کی لیڈی سکرٹیری کا تھا۔ عورت کا دوسرا روپ اس نے اس صورت میں دیکھا۔ لڑکی خاصی خوش شکل تھی' اسے پیاری لگی' محبت کا وہ لمس جو اس کی کمزوری بن چکا تھا۔ اس کی کمی کو اس نے مورتی میں پورا کرنا چاہا۔ اس کے دل میں دفتر کی لگن پیدا ہو گئی اور باقاعدگی سے دفتر آنے جانے لگا۔

مورتی سکریڑی کی حیثیت سے اس کا بے حد احترام کرتی تھی۔ وہ خود بھی مورتی کے ساتھ انتہائی نرم لہجے میں پیش آیا۔ اس نے مورتی پر عنایات کی نوازش کر دی۔ اس کے لئے اتنی سہولیات فراہم کیں کہ اس زیادہ کچھ کرنا اس کے لئے اپنے بس کی بات نہیں تھی۔ اب وہ مورتی کے محبت بھرے جواب کا منتظر تھا۔ شاید

اس کی تقدیر مکمل جائے۔

لیکن مورتی تابش کے جذبوں سے بے خبر صرف اس کا احترام کرتی رہی' محبت کا وہ انداز جس کا تابش طلب گار تھا مورتی کے پاس نہیں تھا۔ اور وہ بجھنے لگا اس کی امیدیں دم توڑنے لگیں۔ اور ایک بار اس نے اپنے دفتر کے ہی ایک اکاؤنٹنٹ اور مورتی کی باتیں سن لیں۔ اتفاق سے وہ اس وقت اس حصے میں جا نکلا تھا' اندر مورتی موجود تھی۔ اپنا نام سن کر وہ ٹھٹھک گیا۔ قرب و جوار میں کوئی نہیں تھا اس لئے اس نے رک جانے میں کوئی ہرج محسوس نہیں کیا۔

"نہیں اعظم تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے' میں انہیں صرف اپنا باس سمجھتی ہوں۔" عورت کی آواز سنائی دی۔

"بکواس مت کرو مورتی' تم کیا مجھے اندھا سمجھتی ہو۔"؟ اعظم غرایا۔

"پلیز اعظم سمجھنے کی کوشش کرو' آخر میں ان کی ملازم ہوں' ان کے احکامات ماننا میرا فرض ہے' تم خواہ مخواہ کسی غلط فہمی کو دل میں جگہ دینے کی کوشش مت کرو۔"

"فرائض نبھانے کا مقصد یہ نہیں ہوتا مورتی کہ انسان اپنی عزت کی پرواہ کرنا بھی چھوڑ دے" اکاؤنٹنٹ کی آواز ابھری۔

"میں نے کب ایسا کیا ہے۔" "تم باس کی کار میں آتی ہو۔" اعظم نے سوال کیا۔ "ہاں یہ درست ہے لیکن۔"

"لیکن کیا۔"

"میں باس کے ڈرائیور کے ساتھ آتی ہوں' وہ بھی اس لئے کہ باس نے خود اس کی پیش کش کی تھی کہ وہ کار بھیج دیا کریں گے۔"

"یہاں اور بھی بہت سے لوگ ہیں۔ کیا باس سب پر اسی طرح مہربان ہیں جس طرح تم پر۔" اعظم کی تلخ آواز ابھری۔

"وہ تو سب درست ہے۔ لیکن اگر باس خود الو کا پٹھا ہے تو میں کیا کروں

اس نے آج تک میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی' ایسی صورت میں اگر مجھے کچھ حاصل ہو رہا ہے تو کیا ہرج ہے۔" مورتی نے کہا۔ اور تابش جلدی سے وہاں سے ہٹ گیا۔ اسے شدت سے مورتی سے نفرت محسوس ہوئی۔ اس کا دل چاہا کہ اس عورت کو قتل کر دے یا پھر اس سے اتنا گہرا انتقام لے کہ یہ کسی کے قابل نہ رہے۔ اور اس نے یہی کیا' مورتی کو آبرو سے محروم کرنے کے بعد وہ پر سکون ہو گیا' اس کے بعد اس نے کسی محبت بھرے لمس کی ضرورت محسوس نہیں کی' اس کا دل اس شہر سے اچاٹ ہو گیا یہاں کوئی اس کا نہیں تھا۔ تب اس نے فرم کے مینجر کو فرم مختار کار بنایا اور خاموشی سے اس شہر کو چھوڑ کر دوسرے شہر میں نکل آیا۔

کسی کو پتہ بھی نہ چل سکا کہ تابش کہاں گیا۔ اس کی پوری ذات پر بے زاری طاری تھی' تنہائی اس کے اردگرد پھیلی ہوئی تھی۔ تب اس نے سوچا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اور وہ سوچ جو اس کے ذہن سے ٹکرائی وہ نہایت خطرناک تھی۔ جرائم کی دنیا میں پہنچ گیا' دولت کی اس کے پاس کمی نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ شوقیہ جرائم کرتا تھا۔ اس نے بڑے بڑے جرائم پیشہ افراد سے تربیت حاصل کی اور اپنے استادوں کو خود اس نے اپنے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ وہ کسی کو خود سے برتر دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ ہاں جرائم کرنے کے سلسلے میں اس نے منفرد طریقے اختیار کیے۔ یعنی جرم کرنے سے قبل اس کے بارے میں خوب غور فکر کرو تب جرم کرو۔ یہ اس کا اصول تھا۔ یہی وجہ تھی کہ درجنوں لوگوں کو قتل کرنے کے بعد جن میں زیادہ تر لڑکیاں تھیں' اور ہزنی کی بے شمار وارداتوں کے باوجود وہ آزاد پھر رہا تھا۔ اور معاشرے میں ایک باعزت انسان کی حیثیت سے پہچا جاتا تھا۔

جلسازی کے کسی بھی پروگرام کو مرتب کرتے ہوئے یا اس پر عمل کرتے ہوئے تابش کی شخصیت ایک خطرناک مجرم کی سی ہوتی تھی۔ ان اوقات میں وہ ایک چالاک اور سفاک انسان نظر آتا تھا۔ لیکن عام حالات میں صرف ایک صاف ستھرا

سان تھا۔ کسی بھی مالدار آدمی کو دیکھ کر اس کی نیت خراب نہیں ہوتی تھی۔ وہ کچھ خاص مواقع ہوتے تھے جب وہ ایک جلساز کی حیثیت سے سوچتا تھا۔ فکر معاش سے نہیں تھی لیکن وہ اپنے پیشے کی مشق جاری رکھنا چاہتا تھا۔

کچھ روز پہلے اس نے ڈاکٹر ظہیر کے قیمتی ہیروں کے بارے میں سنا تھا۔ ں روز ہوٹل ایگلڈز میں بیٹھا ہوا تھا' سامنے ہی دو آدمی اسے نظر آئے جو کچھ قیمتی ہروں کے بارے میں گل افشانی کر رہے تھے تب اس کی جلساز فطرت ابھر آئی اور ں نے اپنے کان ان کی باتوں کی طرف لگا دیئے۔

بوڑھا ڈاکٹر امیر ترین لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔ ہیروں کی نمائش میں بھی یک بار اس نے اپنے ہیرے رکھے تھے جنہیں انتہائی قیمتی قرار دیا گیا تھا۔ ایک نے کہا۔ اور تابش سمجھ گیا کہ یقینی طور پر یہ دو آدمی جو گفتگو کر رہے ہیں دونوں جوہری ں۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی طرح تم مجھے وہ ہیرے دکھا دو۔" دوسرے نص نے کہا۔

"مشکل ہے' ویسے میں کوشش کر سکتا ہوں' ہاں آج سے کچھ روز کے بعد ہ ہوٹل ڈائمنڈ میں آئے گا جہاں اسے اعزازی پارٹی دی گئی ہے' اس دن ہم اس کا چھا کرنے کے بعد اس کے گھر کا پتہ معلوم کر سکتے ہیں۔"

"ونڈر فل آئیڈیا۔ یہ درست ہے۔" دوسرے شخص نے پہلے شخص کے تھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ اور تابش اپنے اگلے پروگرام پر غور کرنے لگا۔

"ڈاکٹر ظہیر کے پاس ہیرے جو قیمتی ہیں' بے داغ ہیں۔ لیکن گھر کا پتہ علوم کرنا تھا۔ اور اسے پتہ چل چکا تھا کہ آج سے کچھ روز بعد ہوٹل ڈائمنڈ میں اکٹر ظہیر احمد کو اعزازی پارٹی دی جائے گی۔ یہ پارٹی کون دے گا' کس کی جانب ے ہو گی۔ تابش کو اس سے غرض نہ تھی۔ اور جب وہ ہوٹل ایگلڈز سے اٹھا تو ں نے سوچ لیا تھا کہ ڈاکٹر کے ہیرے اس کی ملکیت بن جانے چاہئیں۔

چنانچہ آج وہ اپنی ایک دوست روزی کے ساتھ ہوٹل ڈائمنڈ میں مو
تھا۔ اسے انتظار تھا کہ کب پارٹی شروع ہو اور وہ ڈاکٹر ظہیر کے گھر کا پتہ چلا سکے۔

روزی اور تابش کافی پیتے رہے اور درمیان میں باتیں کرتے رہے
روزی سانولے رنگ کی حسین و دلگداز جسم کی مالک تھی۔ تقریباً" تین چار ماہ
وہ دوستی کے رشتے میں بندھے ہوئے تھے۔ وہ اپنی جانب سے تابش کو معصوم
کر اس کی جیبیں خالی کرا رہی تھی اور تابش اپنی جیبیں خالی کر رہا تھا۔ ہاں ابھی
اس کا دل روزی سے بھرا نہیں تھا۔ ورنہ جس دن اپنی دوست لڑکی سے بھر
اس دن کے بعد وہ اس لڑکی کو بڑی معصومیت سے پہچاننے سے انکار کر دیتا اور ا
بیوقوف سمجھنے والی لڑکیاں سوچتی رہ جاتیں کہ ان سے کہاں پر غلطی ہوئی۔

بہرحال کافی دیر تک وہ روزی کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ اس دوران ا
نے محسوس کیا کہ ہوٹل میں کچھ چہل پہل شروع ہو گئی ہے۔ اور جب اعزا
پارٹی اختتام کو پہنچی تو اس نے روزی کو خدا حافظ کہا اور اپنی کار میں جا کر بیٹھ گ
اب اسے ڈاکٹر ظہیر کا انتظار تھا جو نکلنے ہی والا تھا۔

بہرحال کام بہت آسان تھا۔ لیکن تابش کی احتیاط پسندی ' وہ اپنے کا
کوئی پہلو نظرانداز نہیں کرنا چاہتا تھا' اس نے نہایت ہوشمندی سے ڈاکٹر ظہیر ک
کا پیچھا کیا' اور سلوا ٹاؤن کے بہت ہی خوبصورت علاقے میں جا نکلا سلوا ٹاؤن میں
ہی گنی چنی کوٹھیاں تھیں اس کی کار ڈاکٹر ظہیر کی کار کا تعاقب کرتی رہی۔ اور
ڈاکٹر ظہیر کی کار کوٹھی نمبر اٹھائیس سلوا ٹاؤن میں داخل ہوئی تو اس نے اپنی کا
رفتار سست کر دی اور بڑے اطمینان سے اس کے سامنے سے گزرا بہرحال کو ٹھ
جائے وقوع دیکھ کر وہ واپس آگیا۔

کوٹھی کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنے کے بعد وہ تقریباً"
دس دن تک ڈاکٹر ظہیر کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا۔ ڈاکٹر ظہیر پچھلے
سال سے اس کوٹھی میں مقیم تھے۔ اس کے ساتھ صرف ایک جوان لڑکی تھی
خود کو ڈاکٹر ظہیر کی بیٹی کہا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ چند ملازم اور بس۔

آج رات اس نے ڈاکٹر ظہیر کی کوٹھی میں داخل ہونا تھا۔ چنانچہ کوٹھی میں داخل ہونے کے لئے اس نے عقبی سمت کو پسند کیا تھا۔ اس کے جسم پر ہلکا سا سوٹ تھا اور سوٹ کے اندرونی حصے میں وہ اوزار تھے جو تالے اور تجوریاں کھولنے کے کام آتے تھے۔ پاؤں میں پلین ربر کے شوز تھے تاکہ کسی قسم کے نشانات باقی نہ رہیں۔

شام کو آٹھ بجے وہ اپنی رہائش گاہ سے نکلا' کار اسٹارٹ کی اس کا رخ روزی کے فلیٹ کی جانب تھا' اپنے تمام کام مکمل کرنے کے ساتھ ساتھ وہ کار کی جعلی پلیٹ نمبر رکھنا نہیں بھولا تھا۔ بہرصورت روزی کو اس کے فلیٹ سے لے کر وہ ساحل سمندر کی جانب چل پڑا۔

زندگی خوبصورت حادثات کا نام ہے روزی اور یہی حادثات زندگی کو دلچسپ بناتے ہیں' ورنہ ہم ان طویل دن اور رات سے اکتا جائیں تابش نے روزی کے برہنہ بازوؤں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور روزی نے ہنس کر اپنا سر اس کے سینے سے ٹکا دیا۔ پھر اپنی سیاہ آنکھوں سے تابش کو دیکھتے ہوئے بولی۔

" تابش کیا تم مجھے اپنی لائف پارٹنر بنانا پسند نہیں کرتے 'کیا تم نہیں چاہتے کہ ہم دونوں ساحل سمندر پر ہوں یا گھر پر یا کسی ہوٹل میں۔ ہم ایک ہوں۔ ہمارے وجود ایک ہوں۔ کیا ہماری منزل ایک نہیں ہو سکتی۔"!

"مجبوری ہے روزی۔ میں تمہیں اپنی زندگی بھر کا شریک نہیں بنا سکتا نامعلوم تمہاری منزل کونسی ہے اور میری منزل کونسی۔"

"تو کیا تم نہیں چاہتے کہ ہماری منزلیں ایک ہو جائیں۔" روزی نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا' لیکن یہ محبت بھرا لہجہ تابش کے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا' اسے مورتی یاد آگئی جس کے لئے اس نے بہت کچھ کیا تھا' اور جسے وہ پانا چاہتا تھا لیکن روزی کی محبت پر یقین کرنا اب اس کے بس کے باہر کی بات تھی چنانچہ اس

نے نہایت سرد مہری سے کہا۔

"یہ ایک دلچسپ تصور ہے روزی لیکن حقیقت سے دور، زندگی کے مخ
ادوار ہوتے ہیں۔ اور ان مختلف ادوار میں آرزوئیں دل میں جنم لیتی ہیں لیکن
جانتے ہیں کہ وہ پوری ہونے کے لئے نہیں ہوتیں۔ میرے اور تمہارے درم
بڑے فاصلے ہیں روزی چنانچہ ہمیں مستقبل بھلا کر حال سے لطف اندوز ہونا چاہئ
تاکہ یہی حال اور یہی شام مستقبل کی ایک حسین یاد بن جائے۔" تابش نے کہا
آگے بڑھتے ہوئے روزی کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ روزی کے چہرے پر ایک
کے لئے عجیب سا تاثر ابھرا لیکن دوسرے لمحے اس نے خود پر قابو پا لیا۔ اور تا
کے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو گئی۔

اور وہ رات روزی کی آخری رات تھی۔ دوسرے دن کے چمکتے ہو
سورج نے تابش کے دل و ذہن سے روزی کو کھرچ پھینکا تھا۔ اور روز
کو اپنی زندگی سے نکالنے کے بعد اس نے اپنی کار کا رخ سلوا ٹاؤن کوٹھی نم
اٹھائیس کی طرف کر دیا، تقریباً بیس گز کے فاصلے پر اس نے کار روک دی، نیچے
کر اس نے کار کی نمبر پلیٹ تبدیل کی اور اطمینان سے اتر کر ٹہلتا ہوا کوٹھی کی جا
جانے لگا۔ کوٹھی کے نزدیک پہنچ کر اس نے چاروں طرف دیکھا پھر عقبی سمت
جانب چلا گیا، عقبی سمت پہنچ کر وہ جھک کر اچھلا اور چار دیواری کے اوپر پہنچ گی
اس کے ہاتھوں میں ربڑ کے موٹے دستانے تھے، پیروں میں کریپ سول تھے۔ چنا
وہ اطمینان سے باڑھ پار کر گیا۔ اور چند ساعت بیٹھا رہا۔ یہ اطمینان کر لینے کے ب
کہ آس پاس کوئی نہیں ہے تو وہ باڑھ کے سہارے سہارے آگے بڑھتا ہوا کوٹھ
کے صدر گیٹ تک پہنچ گیا۔ صدر گیٹ کے اوپر ایک چھوٹا سا بلب روشن تھا لیک
اس کی دوربین نگاہیں چاروں طرف دیکھ رہی تھیں۔ مکمل اطمینان کے بعد وہ صد
گیٹ سے آگے بڑھتا ہوا راہداری میں داخل ہو گیا اور تھوڑی دیر کے بعد و
اندرونی کمروں کے پاس تھا۔

اس نے چاروں طرف کا جائزہ لیا، پوری کوٹھی میں چار کمرے تھے، اس
ے علاوہ لان وغیرہ تھا، کمروں میں ہلکے نیلے رنگ کی خواب آور روشنی پھیلی ہوئی
ی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ کمروں کے مکین اگر سوئے نہیں ہیں تو لیٹ ضرور
چکے ہیں۔ اس نے ایک ایک کر کے چاروں کمرے دیکھ ڈالے۔ ان چار کمروں میں
رائنگ ڈائنگ کے علاوہ دو سٹنگ روم تھے۔ اور بیڈ روم تھے۔ لیکن باوجود
امی تلاش بسیار کے وہ یہ معلوم کرنے میں ناکام رہا کہ تجوری کس جگہ ہو سکتی
ہے۔ تب وہ اگلا قدم اٹھانے کے لئے تیار ہو گیا۔

دوسرے لمحے وہ ڈاکٹر ظہیر کی خواب گاہ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ خوابگاہ کے
روازے پر اس نے آہستہ سے دستک دی اور دستک دیتے ہوئے اس نے کی ہول
ے آنکھ لگا دی، کمرے میں بستر پر کوئی موجود نہیں تھا اور بستر خالی تھا۔ تابش ایک
م چونک پڑا دوسرے لمحے وہ ایک جانب ہٹ گیا تھا کیونکہ وہ قدموں کی چاپ
حسوس کر رہا تھا۔ دروازہ اطمینان سے کھولا گیا۔ تب اسے ایک دبلے پتلے دراز
امت ادھیڑ عمر آدمی نے کمرے کے دروازے سے جھانکا۔

"کون ہے۔" اس کی نحیف سی آواز ابھری اور تابش ڈاکٹر ظہیر کے
امنے آ گیا۔ تابش نے ایک زوردار ہاتھ ڈاکٹر کے سینے پر مارا اور ڈاکٹر کئی قدم
پیچھے ہٹ گیا۔ تب تابش نے پلٹ کر پھرتی سے دروازہ بند کر دیا۔

"اگر تم نے چیخنے کی کوشش کی تو جو چند سانسیں باقی رہ گئی ہیں وہ بھی کھو
بیٹھو گے۔" تابش نے انتہائی سرد لہجے میں کہا۔ لیکن سامنے موجود ڈاکٹر ظہیر پر اس
کے لہجے کی سرد مہری کا کوئی اثر نہیں تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا تب اس نے آہستہ
سے کہا۔

"کیا چاہتے ہو۔"

"جو کچھ بھی چاہتا ہوں بتا دوں گا۔" تابش نے انتہائی بیہودگی سے کہا اور
ڈاکٹر کے لباس کی تلاشی لینے لگا لیکن اس کے پاس کچھ نہیں تھا

"پستول تلاش کر رہے ہو۔" ڈاکٹر نے پوچھا۔ اور تابش چونک کر دیکھنے لگا۔

"تجوری تلاش کرنے آئے ہو شاید۔" ڈاکٹر نے ایک بار پھر کہا اور ا
گھورنے لگا۔

"تکیئے کے نیچے ہے۔" بوڑھے نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور تا
اسے غور سے دیکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ وہ بوڑھے کی کسی بھی حرکت کے
پورے طور سے تیار تھا۔ لیکن بوڑھا اطمینان سے کھڑا ہوا تھا۔ تابش نے بوڑ
پر نگاہیں جماتے ہوئے تکیئے کے نیچے ہاتھ ڈالا اور دنگ رہ گیا۔

تکیئے کے نیچے پستول موجود تھا' بہرحال بوڑھے کی اس نشاندہی پر
حیرت ہوئی تھی' اس نے پستول نکالا' اس کے چیمبر میں بھری ہوئی سب گولیاں
کیں اور اپنی جیب میں ڈال لیں۔ پستول اس نے وہیں پھینک دیا تھا۔

"مجھے بتاؤ جوان میں تمہاری کیا خدمت کروں۔ بوڑھے نے کہا اور تابش
پھر اسے گھورنے لگا۔

"خوب۔" تابش پھیکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتا ہوا بولا۔ "تم میری
خدمت کرو گے بڑے میاں۔"

"جو تم پسند کرو۔" بوڑھے نے جواب دیا۔

"مجھے تمہارے ہیروں کی تلاش ہے۔" تابش نے کہا۔

"اوہ ہیرے۔" بوڑھا ہنسا۔ یہ ہیرے بھی کم بخت باعث مصیبت ہیں۔ بہرحال کوئی بات نہیں بیٹے۔ تم چاہو تو لے لو' بڑے نایاب پتھر ہیں' بالکل بیداغ' کوئی بال کا نشان بھی ان پر نہیں ہے۔ لیکن تم مجھے بتاؤ کیا تم انہیں فروخت کرنے کا ارادہ رکھتے ہو۔ اور اگر تم انہیں فروخت کرنا ہی چاہتے ہو تو ہیروں کی رقم کا تعین کرنے کے بعد اتنی رقم تم مجھ سے لے لو۔ ہاں اگر قدردان ہو تو بات دوسری ہے ظاہر ہے ہیرے یہاں رہیں یا تمہارے پاس اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جگہ تبدیل

ہونے سے ان کی اہمیت کم نہیں ہو گی۔ بس میں چاہتا صرف یہ ہوں کہ یہ ہیرے بے داغ رہیں اور کسی ناقدر کے پاس نہ پہنچیں۔ تم مجھے صرف یہ بتا دو کہ تم ان کا کیا کرو گے۔"

"انہیں میرے حوالے کر دو ڈاکٹر بس میں صرف اور صرف یہ چاہتا ہوں اور تمہیں یہ بات بھی بتا دوں کہ میں ہیرے لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔

"لیکن اس سلسلے میں تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہو گا۔"

"وعدہ۔ کیسا وعدہ۔" تابش چونکا۔

"تم انہیں کسی غلط ہاتھوں میں نہیں جانے دو گے۔" بوڑھے ڈاکٹر نے لجاجت سے کہا۔

"چلو وعدہ۔" تابش نے کہا۔ اور بوڑھا اسے اپنے ساتھ ساتھ لئے تجوری کے پاس پہنچ گیا۔

اور تابش جیسا زیرک اور چالاک انسان بھی حیران رہ گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ بوڑھے نے ایک خوبصورت ڈیکوریشن پیس کو اٹھایا' اس خوبصورت پیس کے نیچے ایک بٹن نظر آرہا تھا۔ بوڑھے نے اس بٹن کو دبایا اور ڈیکوریشن پیس کا ڈھکن آہستہ آہستہ کھلنے لگا اور تابش چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ڈاکٹر ظہیر اگر اس تجوری کو کھولنا نہ چاہتا تو تابش کے فرشتے بھی اسے تلاش نہیں کرسکتے تھے۔

تب بوڑھے نے تجوری میں سے کچھ کیس نکالے۔ بوڑھے نے ایک کیس بکس اٹھایا اور اسے تابش حوالے کر دیا۔ تابش نے اطمینان سے کیس بکس کھولا۔ سفید مخمل میں قیمتی ہیرے جگمگا رہے تھے۔ تابش کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔

" تمہاری طلب پوری ہو گئی بیٹے۔" بوڑھے نے پوچھا۔

" شکریہ۔ بہت بہت شکریہ ڈاکٹر۔" تابش نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور پھر بولا۔

"تم نے تجسس میں مبتلا کر دیا ہے ڈاکٹر۔ کیا میں جان سکتا ہوں کہ اس عنایت کی وجہ کیا ہے۔"

"کچھ نہیں میرے بچے ۔ میری حالت تمہارے سامنے ہے۔ بوڑھا سمجھو۔ ہڈیوں میں اتنا دم خم نہیں ہے کہ تم جیسے کسی جوان آدمی کا مقابلہ کروا یوں بھی زندگی کی کیا ضمانت ۔ آتی جاتی سانس ہے' نجانے کس لمحے سانس کی یہ ڈوٹ جائے' تو تب یہ تمام دولت کس کام آئے گی' چنانچہ اب بھی اگر کسی کے کا سکوں تو زیادہ اچھا ہے۔ رہ گئی ربابہ تو اس کے لئے بہت کچھ ہے اور پھر وہ لڑکی ہیروں کی حفاظت کر بھی کیسے سکتی ہے' خواہ مخواہ پتھر کے یہ ٹکڑے اس کی زند اجیرن کر دیں گے۔"

"اوہ۔ یہ ربابہ کون ہے۔"

"میری بیٹی۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"تو کیا تمہارا کوئی بیٹا نہیں ہے۔" تابش نے پوچھا اور بوڑھے کے چہر پر کرب کے آثار نمایاں ہو گئے' اس کی دھندلائی ہوئی سی آنکھوں میں پانی کے قطرے نظر آنے لگے' پھر آنسوؤں کے دو قطرے اس کے گالوں پر ڈھلک آئے۔

اگر۔ اگر۔ بوڑھے نے آنسوؤں کے قطرے اپنے گالوں سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ اگر میرا کوئی بیٹا ہوتا تو تم مجھے اس طرح بے بس کر کے یہ ہیرے یہاں سے نہ لے جاتے میں اس وقت جوان ہوتا۔ میرے بازوؤں میں اتنی قوت ہوتی کہ میں تم جیسے شخص کو کچل سکتا' میری تجوری اتنی جلد خالی نہ ہوتی۔ لیکن بے بسی کی انتہا یہ ہے کہ میں خود بوڑھا ہوں' ایک جوان بچی رکھتا ہوں اور سب سے بڑھ کر میرے بعد میری بچی کا نگہبان کوئی نہیں ہے۔"

اور تابش کے چہرے پر عجیب سے تاثرات نمایاں ہو گئے' اس کے ذہن کو عجیب سا جھٹکا لگا تھا۔ وہ کوئی نیک جوان نہیں تھا۔ ایک سفاک اور درندہ صفت انسان تھا' اس کا دل رحم کے جذبات سے خالی تھا' لیکن بوڑھے کی بے بسی نے اسے انسانیت کی صف میں لا کر کھڑا کیا تھا۔ تب اس نے کہا۔

"لیکن ڈاکٹر تمہاری اس بے وقوفی کو میں کیا کہوں' تم چاہتے تو انہیں چھپا سکتے تھے۔ اگر تم مجھے نہ بتاتے تو شاید۔"

"تب تم میرے اوپر تشدد کرتے' مجھے مارتے میرے بچے اور میری ہڈیاں اس قابل نہیں ہیں کہ وہ کسی قسم کا تشدد برداشت کر سکیں۔ اگر اگر میری ان ہڈیوں میں جان ہوتی تو میں سب سے پہلے اپنے لخت جگر کا انتقام لیتا۔ آہ۔ میں ان کو نہ چھوڑتا جنہوں نے میرے کڑیل جوان کو ختم کیا ہے۔ بوڑھے کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہنے لگے۔ تب اچانک بالکل ہی اچانک تابش کے آہنی دل میں سویا ہوا انسان جاگ اٹھا۔ اور شاید جہاں انسان کی بے بسی کی انتہا ہوتی ہے وہاں خدا کی طرف سے اس بے بسی کا توڑ بھی ہوتا ہے۔ تابش کا ذہن و دل بدل گیا۔ اسے اپنے دل میں ایک عجیب سی تحریک محسوس ہوئی۔

"تو۔ تو کیا تمہارا کوئی بیٹا بھی تھا۔"

"ہاں۔"

"کیا نام تھا اس کا۔"

"ازیر۔" بوڑھے نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"کیا ہوا تھا اسے۔" تابش نے پھر پوچھا۔

"نوجوان ہو' حساس دل رکھتے ہو' دنیا میں بڑے بڑے دھوکے اور فراڈ ہوتے ہیں کہیں کسی سے دھوکا نہ کھا جانا" بوڑھے نے خلوص سے کہا۔

"نہیں ڈاکٹر میں ہر قسم کے حالات سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتا ہوں' تم اس کی فکر مت کرو۔"

"تب پھر آؤ۔ بیٹھو یہاں پر۔" بوڑھے نے ایک کوچ کی طرف اشارہ کیا اور تابش ایک جانب سکڑ کر بیٹھ گیا۔

"بھروسہ کر رہے ہو تو کر لو' دوستوں کی طرح بیٹھو' میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ لیکن اس کے باوجود اگر بھروسہ نہیں کر پا رہے ہو تو تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔" ڈاکٹر ظہیر نے خلوص سے کہا۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے ڈاکٹر ہر انسان دنیا میں مختلف احساس کا شکار ہو
ہے۔ میں یا تو بھروسہ کرتا ہی نہیں ہوں۔ یا پھر کرتا ہوں تو سب کچھ بھول کر کر
ہوں' اب میں تمہارے پاس بیٹھ کر یہ نہیں سوچ رہا ہوں کہ تم مجھے کوئی نقصان
پہنچاؤ گے۔ ہاں اگر مجھے تمہاری طرف سے کسی قسم کا نقصان پہنچا بھی تو میں اس سے
باآسانی نمٹ لوں گا۔" تابش نے کہا۔

"تو کیا تم میرے ساتھ ایک کپ چائے پینا پسند کرو گے۔" "ضرور ڈاکٹر۔
زندگی بھر ہمیشہ رسک لیتا رہا ہوں' ایک بار اور سہی۔" تابش مسکراتے ہوئے کہا۔

"تب پھر آؤ میرے ساتھ۔" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا اور وہ دونوں
کمرے سے باہر نکل آئے' اب وہ اس دوسرے کمرے کی طرف جا رہے تھے جس
میں روشنی ہو رہی تھی۔

"ربابہ۔ ربابہ۔ سو گئیں بیٹی۔" اس نے دروازے کے باہر سے آواز دی
اور چند ساعت کے بعد دروازہ کھل گیا۔ ربابہ ایک نوجوان حسین صورت لڑکی
تھی' شب خوابی کے لباس میں وہ ضرورت سے زیادہ حسین محسوس ہو رہی تھی۔

"تم سو گئیں تھیں ربابہ۔" ڈاکٹر نے پوچھا۔ "نہیں پاپا' کیوں کیا بات ہے۔
" لڑکی نے کہا اور پھر اس نے اپنے باپ کے ساتھ نوجوان پر نگاہ ڈالی' پھر مسکراتی
نگاہوں سے باپ کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"بالکل ٹھیک سمجھیں تم بیٹی' ملازم سو چکے ہیں' اس لئے تمہاری ضرورت
محسوس ہوئی۔" بوڑھے ڈاکٹر نے محبت سے کہا۔

"ضرور پاپا۔ آپ اپنے کمرے میں چلیں۔ میں ابھی کافی لے کر آتی ہوں۔
" لڑکی نے کہا۔ بوڑھا ڈاکٹر اور تابش واپس پلٹ پڑے۔

اس دوران تابش نے لڑکی اور بوڑھے کے چہروں اور الفاظ پر پوری توجہ
کی تھی وہ ان کے چہروں پر کسی مشتبہ بات کو تلاش کرنا چاہتا تھا' لیکن باوجود کوشش
کے وہ کوئی ایسی بات تلاش نہ کر سکا اور یہ اس کی زندگی کے انوکھے واقعات تھے'

ج تک اس کا سابقہ کسی ایسے شخص سے نہیں پڑا تھا جو اتنی آسانی سے اپنا مال چور
ے حوالے کر دیتا وہ اس گھر میں چوری کرنے آیا تھا اور گھر کے مالک نے چوری
رانے میں اس کے ساتھ بھرپور تعاون کیا تھا۔ نا صرف تعاون کیا تھا بلکہ اب کافی
ی پلوا رہا تھا۔ اور اب وہ چوری کے مال کے ساتھ دوستانہ انداز میں گفتگو بھی کر
ہے تھے لیکن واقعات اتنے دلچسپ تھے کہ تابش جیسا نڈر اور سفاک انسان اسے
ر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

وہ ایک راہداری طے کر کے دوسرے کمرے میں آئے' یہ کمرہ شاید
رائنگ روم تھا' کیونکہ اس کی سجاوٹ اس قسم کی تھی۔ تب ڈاکٹر ظہیر نے ایک
ونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹھو بیٹے۔"

"شکریہ۔" تابش نے کہا اور بیٹھ گیا۔ بوڑھا ڈاکٹر خود اس کے سامنے
سرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے صوفے کے ہتھے پر ہاتھ ٹکا کر سر ہتھیلی پر رکھ
۔ چند ساعت کچھ سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

"تمہیں واقعی میری کہانی سے دلچسپی ہے۔"

"یقیناً۔" تابش نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"تب سنو بیٹے۔ یہ ایک باپ کی مجرمانہ غفلت کی کہانی ہے۔ ایک نوجوان
ناعاقبت اندیشی کی کہانی ہے۔ آج سے تقریباً بیس سال پہلے میں سویڈن میں
دراصل بچپن سے کاروباری رہا ہوں ملک ملک کے دورے کرتے رہنا میرے
لوں میں شامل رہا ہے۔ ایک ایسے ہی دورے میں میری ملاقات ایک سویڈن
شائی سے ہو گئی غریب الوطنی میں انسان اجنبیوں پر بھروسہ کر لیتا ہے اور حالات
ہیں کہ اجنبی اسے دھوکا نہیں دیتے اور انسانیت کی وہ تمام ضرورتیں' پوری کر
ہیں جو بعض اوقات اپنے نہیں کرتے۔ اور پھر میں تو یوں بھی تنہا تھا۔ میں نے
اسے شادی کر لی۔ وہ میری خاطر مسلمان ہو گئی تھی۔ پورے بارہ سال میں نے

اور شائی نے ایک خوشگوار ازدواجی زندگی گزار دی اسی دوران ہماری محب
نشانیاں پیدا ہو گئیں اذیر اس وقت آٹھ سال کا تھا اور ربابہ چار سال کی۔
بچے کی پیدائش پر شائی نے موت کے اندھیروں کو اپنا لیا۔ اور میری زندگ
ہو گئی۔ بمشکل تمام میں نے ان بچوں کو سنبھالا اور ان کی پرورش کرنے لگا۔
بھی خاصا نقصان میں جا رہا تھا۔ چنانچہ میں نے دونوں بچوں کو سویڈن میں چ
خود واپس آ گیا' بچے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ پھر جب ایک بار ان سے
لئے گیا تو ربابہ میرے ساتھ ہی آ گئی۔ لیکن اذیر وہیں رہا۔ صحیح نگہداشت
کی وجہ سے وہ غلط راہوں پر پڑ گیا۔ اس نے جرائم پیشہ لوگوں سے دوستی
مجرمانہ کاروائیوں میں حصہ لینے لگا۔ جرائم پیشہ افراد کے ایک گروہ نے ا
شامل کر لیا۔ اور بحری قزاق بن گیا۔

سمندر کے حکمران کی حیثیت سے وہ خاصا مشہور ہو گیا تھا لیکن
سارا قصور اس کا نہیں تھا۔ خطرناک بحری قزاقوں نے اسے اپنا آلہ کار بن
ان کا تعلق کسی ایک ملک سے نہیں تھا۔ ویسے وہ اپنے علاقوں کے با اثر لوگ
لیکن سمندری قزاق کی حیثیت سے میرے بیٹے کا نام پیش پیش تھا۔ پھر ایک
بیٹا میرا معصوم بچہ پولیس سے مقابلہ کرتا ہوا ہلاک ہو گیا اور اس کی لاش سم
گم ہو گئی۔ لیکن وہ اپنے ساتھیوں کی دھوکہ دہی سے مارا گیا تھا۔ انہوں
اسے ایک مہم سر کرنے کے لئے بھیجا اور پھر خود ہی اس کے پیچھے پولیس کو
دراصل وہ اس کی شہرت سے ڈرتے تھے' وہ نہیں چاہتے تھے کہ قزاقی میں
آگے بڑھ جائے کہ ان کی حیثیت ختم ہو جائے وہ لوٹے ہوئے مال کے
عیش کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ اور میرا بیٹا
کی ہوس کا شکار ہو گیا۔ کاش ـــ کاش میں ان سے اپنے بیٹے کی موت کا ا
سکتا۔ بوڑھے کی آواز رندھ گئی۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ج
ہوئی تھی۔

اور تابش وہ سرد مزاج سفاک نوجوان سکتے کے عالم میں بیٹھا رہ گیا تھا۔ وہ
اصا جذباتی ہو گیا۔ تب اس نے بوڑھے سے کہا۔

"اس سلسلے میں' میں آپ کی کیا مدد کروں ڈاکٹر نے چونک کر اسے دیکھا

"تم۔ تم کیا کرو گے میرے بچے۔" بوڑھے ڈاکٹر کی لرزتی ہوئی آواز
بھری۔

"جو تم چاہو گے ڈاکٹر۔ تم اگر پسند کرو اور ان تمام مجرموں کی نشاندہی کرو
میں ان سے تمہارے بیٹے کا انتقام لینے کے لئے تیار ہوں۔" تابش نے کہا اور
ڑھے ڈاکٹر کی دھندلی آنکھیں اسے سوالیہ انداز میں دیکھنے لگیں شاید وہ تابش کے
ے الفاظ پر غور کر رہا تھا۔

"تو تم میری مدد کرنا چاہتے ہو۔" ڈاکٹر نے ایک بار پھر تعجب سے پوچھا۔

"ہاں۔ دل و جان سے۔ تم ان لوگوں سے انتقام لینا چاہتے ہو لیکن اپنی
بے بسی کی وجہ سے نہیں لے سکتے۔ چنانچہ میں خود کو اس کے لئے تیار کروں گا۔
لن ہوا تو میں تمہارے بیٹے کے قاتلوں کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ تابش نے
ا اور بوڑھے کی پر محبت نگاہیں اس کے چہرے پر آ ٹکیں۔

"سنو میرے بچے' جوانی ایک امانت ہوتی ہے۔ ایک عطیہ جس کا صدقہ
یتے رہنا ضروری ہے اگر تمہارے جوان بازو کسی کے کام آ گئے تو بوڑھا ہونے کے
د جب تم اپنی جوانی کو یاد کرو گے تو فخر کرو گے' تمہیں بھی احساس ہو گا کہ تم نے
انی یونہی نہیں گنوا دی۔ تمہارے جسم کی مضبوطی کسی کمزور کے کام آئی۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں ڈاکٹر اس سلسلے میں تمہاری بھرپور مدد کروں گا۔"
بش نے جذباتی انداز میں کہا۔ بوڑھے کے الفاظ نے اسے کسی حد تک متاثر کر دیا

"میری خوش قسمتی ہے بیٹے کہ تم ایک ایسے مذہب سے تعلق رکھتے ہو
ں میں وعدے کو ایمان کی نیت دی جاتی ہے اس لئے میں تمہارے وعدے کے

بعد کسی قسم کا تردد ضروری نہیں سمجھتا۔ بوڑھے نے کہا اور اسی وقت د
سے لڑکی کی آواز سنائی ہے۔"

"ڈیڈی کافی تیار ہے۔"

"لے آؤ بیٹے۔" بوڑھے نے کہا اور لڑکی ٹرالی دھکیلتی ہوئی اند
اس نے ٹرالی ان دونوں کے درمیان روکی اور خاموشی سے کافی بنا کر ان کے
پیش کر دی۔

"جاؤ اب تم آرام کرو۔ بوڑھے نے کہا اور لڑکی گردن ہلاتی ہ
نکل گئی۔ تابش خاموشی سے کافی پیتا رہا۔ پھر جب وہ کافی ختم کر چکا تو کھڑا ہو
نے ہیروں کا ڈبہ بوڑھے کے سامنے رکھ دیا تھا۔

"مجھے اجازت دو ڈاکٹر۔ تمہاری امانت تمہارے حوالے ہے۔" ا
کہا۔

"نہیں بیٹے۔ تم انہیں لے جاؤ۔ انہیں قبول کرو میری خواہش ہ
انہیں قبول کر لو۔"

نہیں ڈاکٹر میں ان کا حق دار نہیں ہوں' ہاں اگر میں تمہارے لئے
سکا تو انہیں معاوضہ کے طور پر قبول کر لوں گا۔"

"سنو بیٹے اگر تم میرے بیٹے کا انتقام لینے میں کامیاب ہو گئے تو میر
اتنا بڑا انعام دوں گا کہ تم حیران رہ جاؤ گے' یہ میرا وعدہ ہے۔"

یہ سب کچھ بعد میں دیکھا جائے گا ڈاکٹر۔" تابش نے کہا۔ اور با
آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی کار واپس اپنے مکان کی طرف جا رہی تھی۔

ڈاکٹر سے تین چار بار ملاقات کرنے کے بعد آخر یہ طے پا گیا کہ بو
تیار ہو تو اپنے بیٹے کے قاتلوں کی نشاندہی کرے۔ تابش اس کی بھرپور مدد ک
وہ ان سب کو ایک ایک کر کے قتل کر دے گا جو ڈاکٹر کے معصوم بیٹے کے
تھے۔ گو قتل کرنا اس کی عادت میں داخل نہیں تھا لیکن فطرت کی سفاکی ا

بھی کام سے نہیں روکتی تھی۔ حالانکہ بے خبر لوگوں کو قتل کرتے ہوئے اسے دکھ
بھی ہوتا تھا۔ لیکن ان بدمعاشوں نے بوڑھے کا جوان سہارا چھین لیا تھا' ایک
بوڑھے انسان کی آنکھوں سے روشنی چھین کر اسے دھندلاہٹ بخش دی تھی' ایسی
صورت میں ان بدمعاشوں کو کیفر کردار تک پہنچانا ضروری تھا۔ یوں بھی تابش اپنی
زندگی میں کچھ تبدیلی چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے طور پر فیصلہ کر لیا کہ بوڑھے کی
بھرپور مدد کرے گا۔ اور یہ فیصلہ کر کے اسے کافی سکون محسوس ہو رہا تھا۔ اسے
بوڑھے کی آنکھوں میں خوشی ناچتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور ایک مظلوم باپ کی
آنکھوں کی چمک یقیناً ان ہیروں سے زیادہ دلکش تھی۔ جنہیں وہ چرانے گیا تھا۔

اب یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ بوڑھے کی مدد کرنے میں تابش کے اندر کون
سا جذبہ کارفرما تھا۔ شاید محرومیت کے وہ احساسات جو اس کے ذہن کو بچپن سے
کچوکے لگاتے رہے تھے یا پھر ماں باپ کی بخشی ہوئی وہ کسک اسے ڈاکٹر کی مدد کرنے
پر مجبور کر رہی تھی جس سے وہ ہمیشہ خوفزدہ رہا تھا۔

بہرحال جذبہ کوئی بھی ہو اس میں تابش کا اپنا کوئی مفاد نہ تھا۔ چنانچہ وہ
ڈاکٹر سے دیگر معاملات طے کرنے کے لئے اس کی کوٹھی کی جانب چل پڑا۔

کار لاک کر کے وہ اترا اور اس نے بیل بجائی۔ اور دروازہ کھولنے والی
وہی خوبصورت لڑکی تھی جس کا نام ربابہ تھا۔ تابش کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر
اخلاقی مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس نے نہایت پر تپاک انداز میں اسے سلام بھی
کیا۔

"ڈاکٹر موجود ہیں۔" تابش نے پر اخلاق مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔ "جی
ہاں موجود ہیں۔ آیئے۔" ربابہ نے کہا اور آگے کی جانب چل پڑی۔ تابش اس کے
پیچھے تھا۔

"آپ ازیر کے دوست ہیں۔" ربابہ نے اس کے ساتھ چلتے چلتے پوچھا۔
اور تابش ایک دم چونک گیا۔

"ازیر۔اوہ۔ ہاں۔ ازیر میرے گہرے دوستوں میں سے تھا' وہ سمجھ گ
کہ ڈاکٹر نے لڑکی کو یہی بتایا ہو گا۔

"تب آپ نے بھی ازیر کو برے راستوں پر جانے سے نہ روکا' آ
بہت اچھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔" لڑکی اداسی سے بولی۔

"افسوس دراصل میرا اور ازیر کا ساتھ بہت تھوڑا عرصہ رہا۔ وہ سو
میں ہی رہا اور میں کہیں اور چلا گیا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا اس کی زندگی میں
برے لوگ آئے' یہ سب کچھ میری عدم موجودگی میں ہوا۔ تابش تو یوں بھی جھ
بولنے کا ماہر تھا۔

لڑکی نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا اور چند منٹ کے بعد وہ اسے
ہوئے ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی۔

"تشریف رکھئے۔" لڑکی نے ایک کوچ کی طرف اشارہ کرتے ہو
اور تابش بیٹھ گیا۔ تب لڑکی نے بچوں کے سے انداز میں کہا۔

"ڈیڈی دیکھئے تو سہی کون آیا ہے۔"

"کون ہے بیٹے۔ اندر سے ڈاکٹر ظہیر کی آواز ابھری اور پھر وہ ڈرا
روم کا پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا۔

"تم۔ تم۔ آؤ بیٹھو۔" بوڑھے نے کہا اور تابش جو ڈاکٹر کو دیکھ کر کھ
گیا تھا پھر بیٹھ گیا۔

"ہاں ڈاکٹر اب بتایئے کیا ارادے ہیں آپ کے۔" تابش نے پوچھا
بولا۔" تم مجھے ان لوگوں کے نام اور پتے دیدو ڈاکٹر۔ میں دیکھوں گا کہ کس
خلاف کیا کر سکتا ہوں۔"

"نہیں میرے بچے' تم میری زندگی کی خواہش پوری کرنے کے لئے
کی بازی لگا رہے ہو۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ میں اور ربابہ بھی تمہا
ساتھ رہیں گے۔"

"جیسی آپ کی مرضی ڈاکٹر۔ ہاں آپ جتنی جلد ہو سکے یہاں سے روانگی
کی تیاریاں کرلیں' میں چند گھنٹوں کے اندر آپ کے ساتھ چلنے پر تیار ہو جاؤں
گا۔"

"بہت بہت شکریہ بیٹے' میں تمام انتظامات کرلوں گا' تم بے فکر رہو۔ آہ۔
آہ میری کتنی دیرینہ آرزو پوری ہو رہی ہے' میرے پیارے بیٹے تم نے میرے دل
کی سلگتی ہوئی آگ بجھانے کی کوشش کی ہے بوڑھے نے انتہائی خوشی کے عالم میں
کہا۔ اور آنکھیں بند کرلیں۔ اور تابش کو اپنے ذہن و دل میں ایک عجیب سا سرور
محسوس ہوا۔ اس نے بوڑھے کی آنکھوں میں وہ چمک پائی تھی جس کے عوض اس
نے یہ کام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

تمام تیاریاں مکمل کرنے کے بعد ڈاکٹر نے تابش کو اطلاع دیدی اور تابش
ڈاکٹر کے پاس پہنچ گیا۔

"تم نے ان لوگوں کی تفصیل نہیں پوچھی بیٹے جن لوگوں سے ہمیں نمٹنا
ہے۔" ڈاکٹر ظہیر نے کہا۔

"میں ایسی کوئی بات پوچھنا نہیں چاہتا ڈاکٹر جو آپ بتانا پسند نہ کریں' آپ
ہاں بھی اور جسے بھی کہیں گے میں اسے قتل کردوں گا اور بس۔" تابش نے جواب
یا۔

"میں تمہارا مشکور ہوں بیٹے' تمہارے اس خلوص کی قدر میرے دل کی
ہرائیوں میں ہے اور اس کے عوض۔ اس کے عوض میں تمہاری زندگی میں اتنی
شیاں بھردوں گا کہ تم سمیٹ نہ سکو گے'

"اوہ ڈاکٹر۔ دنیا کی سب سے بڑی خوشی وہ ہے جو کسی دکھے ہوئے دل کو
ارا دے کر حاصل کی جائے۔ میں اچھا انسان نہیں ہوں ڈاکٹر تمہارے میرے
ری کرنے آیا تھا۔ لیکن نہ جانے کہاں سے میرے دل میں ایک اچھائی جاگ اٹھی
ر اس کا کوئی معاوضہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ میں جو کچھ کر رہا ہوں اپنے سکون دل

کی خاطر تمہارے اوپر اس کا کوئی بوجھ نہیں ہے ڈاکٹر اس بات کو تم ذہن سے
دو۔"

"آہ میرے دوست' میرے محسن۔" ڈاکٹر نے جذباتی لہجے میں کہا او
رسمی گفتگو ہوتی رہی اور اس کے بعد تابش وہاں سے اٹھ گیا۔ ڈاکٹر نے اس
وعدہ کیا تھا کہ وہ فوری طور پر بقیہ انتظامات بھی مکمل کر کے روانگی کے دن
مطلع کرے گا۔ کچھ دنوں کے بعد تابش کی ملاقات پھر ڈاکٹر سے ہوئی ڈاکٹر نے
ٹیلیفون پر بلایا تھا۔

"ہم سوئیڈن جانے کے لئے تیار ہیں تابش۔ کیا ارادہ ہے تمہارا۔"
ظہیر نے پوچھا۔

"جو تمہارا ارادہ ہو ڈاکٹر میں تو بالکل تیار ہوں۔" تابش نے کہا۔ "!
کل صبح کی فلائٹ سے ہم روانہ ہو جائیں گے"

"مناسب۔"

"ربابیہ میرے ساتھ ہی جائے گی' بڑی ضدی لڑکی ہے حالانکہ میں
اسے ٹالنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہیں مانتی اس کا کہنا ہے کہ وہ ہمارے
ہی جائے گی۔"

"جیسا آپ پسند کریں ڈاکٹر یہ تو آپ کا کام ہے۔" تابش نے جواب
اور ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا دی۔

"میں بھی کیا کروں تابش دراصل وہ میری اکلوتی بیٹی ہے۔"

دوسرے دن تمام تیاریوں کے بعد وہ ائیرپورٹ پہنچ گئے۔ ربابیہ کے ا
سے یہی پتا چلتا تھا جیسے وہ کسی خوشگوار سفر کی ابتداء کرنے جا رہی ہو۔ وہ خاصی
تھی۔ جہاز میں وہ بھی تابش ہی کے نزدیک بیٹھی تھی۔

"مسٹر تابش آپ خوش ہیں نا۔"

"کیا مطلب ربابیہ۔"

"مقصد یہ کہ ہم سوئیڈن کی سیر کریں گے۔ آہ مجھے دوسرے ممالک دیکھنے
کا بڑا شوق ہے۔ حالانکہ کئی بار موقع مل چکا ہے لیکن بس۔"

"ہاں ربابیہ اپنا اپنا شوق ہوتا ہے۔"

"تابش آپ کہاں کہاں گئے ہیں۔"؟

"بہت سی جگہوں پر۔"

"کیا بات آپ کچھ کھوئے کھوئے سے ہیں۔"

"نہیں ربابیہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"غالباً ڈیڈی نے آپ کو بھی کسی سلسلے میں الجھا دیا ہے۔ بڑی عجیب ہے
فطرت ان کی' ہمیشہ بچوں کی طرح کھوئے رہتے ہیں نجانے کیوں۔"؟

"ہاں ربابیہ بعض اوقات انسان کی زندگی میں یہ کھویا کھویا پن شامل ہو جاتا
ہے' لیکن تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تابش نے ٹالنے والے انداز
میں کہا۔ اور ربابیہ خاموش ہو گئی۔ تابش اپنے خیالات میں گم تھا۔ یہاں تک کہ وہ
اپنی منزل کے قریب پہنچ گئے۔

دو تین اسٹاپ کے بعد طیارہ اسٹاک ہوم ائیرپورٹ پر اتر گیا۔ میں زندگی
میں پہلی بار سوئیڈن آیا تھا۔ اسٹاک ہوم کے بارے میں مجھے مکمل تفصیلات معلوم
نہیں تھیں۔

بہرحال ہم ایک خوبصورت ہوٹل وان گرے میں ٹھہرے عظیم الشان
ہوٹل کی آن بان میرے لئے بہت دلکش تھی۔ اور بوڑھے ڈاکٹر نے اپنی بیٹی کو مکمل
آزادی دیدی تھی۔ ربابیہ اس طرح میرے ساتھ تھی جیسے ہم دونوں میں کوئی خاص
رشتہ ہو۔

یہاں پہنچنے کے بعد چند گھنٹے آرام کیا گیا اور پھر ڈاکٹر ظہیر نے شام کی
چائے پیتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"ہاں ڈیر تابش اب کیا پروگرام ہے۔"؟

"میں تو یہاں اجنبی ہوں ڈاکٹر۔ سارے پروگرام آپ ہی ترتیب دیں گے۔ میں نے بے تکلف ہو کر جواب دیا۔

"اوکے تو پھر میری پیش کش ہے کہ تم دونوں اسٹاک ہوم اور اس کے نواح کی سیر کرو۔ میں اس دوران اپنے دشمنوں کو تلاش کرتا ہوں اور تم بے فکر رہو۔ تابش تمہاری وجہ سے میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنی جان آ گئی ہے کہ میں ایک بار پھر سے اپنے دشمنوں کے مقابل آ سکوں۔ میرے ساتھ ایک ایسا شخص موجود ہے جس پر مجھے مکمل اعتماد ہے۔"

"میں آپ کے اس اعتماد کو کبھی دھوکا نہیں دوں گا ڈاکٹر ظہیر" تابش نے جواب دیا اور مسکراتا ہوا گردن ہلانے لگا پھر ربابیہ سے بولا۔

"ربابیہ میری طرف سے تمہیں اجازت ہے کہ تابش کے ساتھ اسٹاک ہوم کی اچھی طرح سیر کر لو۔ رات ہونے سے قبل واپس آ جانا۔ میں اس وقت تک تم لوگوں کی تفریحات میں کوئی مداخلت نہیں کروں گا جب تک اپنے کام سے فارغ نہ ہو جاؤں۔"

"اوکے ڈیڈی۔" ربابیہ نے کہا۔

بہر صورت اس شام تابش اور ربابیہ نے کوئی پروگرام نہیں بنایا لیکن دوسرے دن صبح وہ دونوں اکٹھے ہو گئے۔ ناشتہ بھی ایک ساتھ ہی کیا۔ ناشتہ سے پہلے تابش نے ربابیہ سے ڈاکٹر ظہیر کے بارے میں پوچھا۔

"ڈاکٹر کہاں ہیں۔ کیا انہیں علم ہے کہ ناشتہ میرے کمرے میں کیا جائے گا۔"

"نہیں تابش ڈیڈی تو صبح ہی صبح چلے گئے۔"

"کیا مطلب۔؟"

"ہاں وہ بغیر ناشتہ کئے چلے گئے تھے۔ مجھے کہہ گئے تھے کہ تم تابش کے ساتھ ناشتہ کر لینا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کب تک واپس آؤں گا۔"

"اوہ۔" تابش نے گہری سانس لے کر کہا پھر بولا۔!" اس کے باوجود میں نہیں چاہتا تھا کہ ڈاکٹر ظہیر دشمنوں کے اس شہر میں تنہا پھیریں۔"

"دشمنوں کا شہر۔"؟ ربابیہ نے تعجب سے پوچھا۔

"اوہ۔ ہاں جس جگہ کے بارے میں زیادہ معلومات نہ ہوں میں اسے دشمنوں کے شہر سے ہی تعبیر کرتا ہوں۔"

"عجیب ہو تم۔" ربابیہ نے ہنس کر کہا اور پھر وہ دونوں ناشتے میں مشغول ہو گئے۔ ناشتہ کے بعد دونوں باہر نکل آئے۔ ربابیہ نے ایک ٹیکسی حاصل کی۔ اور پھر وہ اسٹاک ہوم کی سیر کو نکل گئے۔

جنگلوں اور جھیلوں کا ملک سویڈن تابش کے لئے دلچسپ اور دلکش تھا۔ یہاں اس نے لکڑی بھیجنے کا نظام دیکھا۔ ملک کے رقبہ کا پچپن فیصد جنگلوں اور جھیلوں پر مشتمل ہے چونکہ دریاؤں کا رخ قدرتی طور پر شمال کی طرف ہے اس لئے درختوں کو کاٹ کر دریاؤں میں ڈال دیا جاتا ہے اور وہ بہتے ہوئے جزیرہ بالٹک پہنچ جاتے ہیں۔

پورا دن وہ شہر گردی کرتے رہے۔ ربابیہ اس دن بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ کئی بار اس نے سویڈن کی تعریف کی۔ لیکن تابش سوچ میں ڈوبا رہا تھا۔

"تابش۔" اس نے اسے آواز دی۔

"ہاں ربابیہ۔"

"یوں لگتا ہے جیسے تم میرے ساتھ خوش نہ ہو۔"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"نہیں تابش، مجھے لگ رہا ہے۔"

"تمہارے وہم ہے ربابیہ۔"

"حالانکہ۔ ڈیڈی کا کچھ اور خیال ہے۔"

"کیا۔"؟

"انہوں نے تم سے ایک بات کہی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ تمہیں خوشیاں دیں گے کہ تم ساری زندگی ان کے شکرگزار رہو گے۔"

"ہاں انہوں نے کہا تھا۔ لیکن یہ بات تمہیں کس طرح معلوم ہوئی۔"

"مجھے تو وہ سب کچھ معلوم ہے تابش جو تم خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے۔" ربابہ کے ہونٹوں پر پراسرار مسکراہٹ پھیل گئی۔

"یعنی۔"؟

"بتاؤں گی نہیں۔ ویسے ڈیڈی کا خیال ہے کہ اپنے کام سے فارغ ہو کر و ہم دونوں کو رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیں گے۔"؟

"اوہ۔ کیا واقعی۔"؟

"تابش کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہوئے۔"؟ ربابہ نے پوچھا۔ او تابش نے گردن ہلا دی۔ ویسے اس کی روح خوش ہو گئی تھی۔ ربابہ کی عزت و صرف ڈاکٹر کی بیٹی کی حیثیت سے کرتا تھا باقی زندگی میں وہ ایسے کسی بندھن کا قائل نہیں تھا۔

"خوشی کی بات ہے ربابہ۔" "نہیں۔ تمہارے انداز میں و انبساط نہیں ہے تابش جو کسی پسندیدہ شے کے مل جانے کی خوشی میں چہروں پر ابھ آتا ہے۔"

"میں اس موضوع پر تم سے پھر بات کروں گا ربابہ۔"

اور ربابہ کسی قدر سست ہو گئی۔ تابش نجانے کیوں الجھا الجھا سا تھا۔ بہرحال شام کو واپس آ گئے۔

ڈاکٹر ظہیر ابھی تک نہیں آیا تھا۔ کافی رات گئے ڈاکٹر ظہیر واپس آیا ا کے انداز سے تھکن نمایاں تھی۔ وہ مسکراتا ہوا ان کے سامنے آیا۔

"واہ بھئی تم دونوں کو خوش دیکھ کر ساری تھکن دور ہو گئی۔ ویسے دونوں نے اسٹاک ہوم کی سیر کی"؟

"ہاں ڈیڈی۔ لیکن یوں لگتا ہے جیسے تابش صاحب کو سویڈن پسند نہیں یا۔"

"کیوں تابش۔"

"نہیں ڈاکٹر ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ربابہ شرارت کر رہی ہیں۔"

"اوہ۔ ہاں۔ یہ واقعی شریر ہے۔ کھانا کھا لیا تم دونوں نے۔"

"ابھی نہیں۔"

"منگواؤ۔ ویسے میری درخواست ہے کہ میری مصروفیتوں میں تم پریشان نہ ہوا کرو۔ اور کھانا وغیرہ کھا لیا کرو۔"

"نہیں ڈاکٹر ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" تابش نے کہا اور پھر اس نے ویٹر کو بلا کر کھانے کا آرڈر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے کے بعد ڈاکٹر نے ربابہ سے کہا۔

"اب کیا خیال ہے ربابہ بیٹے۔"؟

"کیا مطلب ڈیڈی۔"

"بھئی تھوڑی دیر کے لیے تابش ہمیں ادھار دے دو۔"

"اوہ ہاں۔ ضرور۔" ربابہ ہنس کر بولی اور پھر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد ڈاکٹر نے دروازہ بند کر لیا۔

"میری پہلی ہی کوشش بے حد کامیاب رہی تابش، اتنی حیرت انگیز کہ تم یقین نہیں کرو گے۔"

"کیا ڈاکٹر۔"

"میرے دشمن کا نام۔ سر جان میکوئے تھا۔ اور یہی شخص دراصل بحری قزاقوں کا سربراہ تھا۔"

"خوب۔" تابش نے دلچسپی سے کہا۔

"جان میکوئے کو میرے بیٹے کی ذہانت سے خطرہ تھا تابش۔ اس کا خیال تھا

کہ ایک دن میرا بیٹا اس کی برتری ختم کر دے گا۔ چنانچہ اس نے سازش کر کے اسے قتل کرا دیا۔ لیکن آج جو انکشاف ہوئے ہیں وہ حیرت انگیز ہیں۔"

"وہ کیا۔"؟

"جان میکوئے کا پچھلے سال انتقال ہو گیا ہے۔ اور اب وہ اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔"

"اوہ۔" تابش کے ہونٹ سکڑ گئے۔!

"میں اس کے ایک ملازم ہڈسن آرگن سے ملا تھا۔ اور ہڈسن آرگن کو جس وقت معلوم ہوا کہ میں کس کا باپ ہوں تو وہ رو پڑا۔"

"بہت خوب۔"

"دراصل ہڈسن کی بیٹی پریشا میرے بیٹے سے محبت کرتی تھی اور ان دونوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میرے بیٹے نے ہڈسن کو کچھ کاغذات دیئے تھے اور کہا تھا کہ وہ ان کی حفاظت کرے۔ وہ کاغذات اس کے پاس محفوظ تھے۔ بہر حال میرے بیٹے کی موت کے بعد ہڈسن کی بیٹی نے بھی خود کشی کر لی اور اب ہڈسن تنہا ہے۔"

"عجیب کہانی ہے ڈاکٹر۔"

"ان کاغذات کا تذکرہ ایک بار میرے بیٹے نے بھی مجھ سے کیا تھا اور جانتے ہو کیا کہا تھا۔"

"میں کیا جانوں ڈاکٹر۔"

"اس نے کہا تھا کہ ان کاغذات میں ایک خزانہ کا نقشہ ہے۔ اور یہ خزانہ سوئیڈن میں محفوظ ہے۔"

"یہ تو کہانی کا رخ ہی بدل گیا ڈاکٹر۔" تابش حیرت سے بولا "مجھے بتاؤ اب میں کیا کروں۔ میکوئے مر گیا ہے۔ اب ہم انتقام کس سے لیں گی۔؟"

"ظاہر ہے ڈاکٹر۔ ایک طرح سے ہمارا یہاں آنا بے مقصد رہا۔" "نہیں بیٹے۔ بے مقصد نہیں ہے۔ مجھے بیٹے کے روپ میں تم مل گئے ہو۔" ڈاکٹر کی آواز

میں بے پناہ خلوص کی چاشنی تھی۔

"یہ تمہاری محبت ہے ڈاکٹر۔"

"اور میں اس محبت کو پروان چڑھاؤں گا۔" ڈاکٹر کی آنکھوں سے محبت پھوٹ رہی تھی اور تابش تعجب انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔

"پھر اب ہمیں کیا کرنا ہے ڈاکٹر۔"

"ہڈسن سے میری بات ہوئی ہے بیٹے۔ اس سے میں نے کہا کہ میری امانت مجھے واپس دی جائے اور اس نے وعدہ کر لیا ہے۔"

"اوہ۔ کب واپس کرے گا۔"

"کل۔"

"خوب۔" تابش نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں اس نے کہا ہے کہ کل وہ کاغذات میرے حوالے کر دے گا۔"

"پھر اس کے بعد آپ کیا کریں گے ڈاکٹر۔"

"اس کے بعد میرے بچے میرے بیٹے۔ وہ خزانہ ہم اور تم ہی حاصل کر لیں گے۔ پھر ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ اب میں ساری زندگی تمہیں چھوڑنا نہیں چاہتا۔ میری خواہش ہے کہ ساری زندگی تم میرے ساتھ رہو۔ میرے بیٹے بن کر۔ بولو کیا تمہیں منظور ہے۔" ڈاکٹر ظہیر نے کہا۔

"ڈاکٹر یہ ساری باتیں تو بعد میں سوچی جائیں گی۔" تابش نے کسی قدر بیزاری سے کہا۔

"نہیں بیٹے یہ تو ابھی سوچنے کی باتیں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے بیٹے بن جاؤ ہمیشہ کے لئے۔"

"وہ کس طرح ڈاکٹر"

"تم ربابیہ کو اپنا لو۔" اس طرح تم ہمیشہ میری نگاہوں کے سامنے رہو گے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"اوہ ڈاکٹر، ربابیہ آپ کی بیٹی ہے' بے شک میرے لئے قابل احترام لیکن آپ اس کے لئے مجھے سوچنے کا موقع بھی نہیں دیں گے۔"

"کیوں نہیں کیوں نہیں۔"

"اگر میرا فیصلہ نفی میں ہوا تو۔"

"میں تمہیں مجبور کروں گا۔ میں تمہاری اس محبت کو آواز دوں گا جو ایک نئے جذبے کے تحت تمہارے سینے میں موجزن ہے اور اس کے بعد میں تم سے بھیک مانگوں گا کہ تم مجھے بڑا تسلیم کرلو۔"

"اوہ ڈاکٹر اس کے دوسرے ذرائع بھی تو ہو سکتے ہو اگر آپ مجھے بیٹا بنا رہے ہیں تو ربابیہ کی کچھ ذمہ داریاں مجھ پر بھی عائد ہوتی ہیں۔"

"نہیں تابش ابھی جلد بازی نہ کرو۔ جو کچھ ہم کر رہے ہیں وہ تو کرتے ہی رہیں گے لیکن بعد میں، میرا مقصد ہے اپنے وطن جانے کے بعد تم اس سلسلے میں بہتر فیصلہ کر سکو گے اور اگر تمہارا اس وقت بھی جواب انکار میں ہوا تو میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔"

"شکریہ ڈاکٹر۔ میرے لئے یہی بہتر ہے کہ آپ مجھے سوچنے کا موقعہ دیں اس دوران میں یہی کروں گا کہ ربابیہ کو اس نگاہ سے دیکھوں ابھی تک میں نے اس کے بارے میں اس انداز میں نہیں سوچا۔"

"اب سوچنا بیٹے اب سوچنا۔ وہ تمہارے لئے بری بیوی ثابت نہیں ہوگی ۔ میں نے اسے بڑی اچھی تربیت دی ہے۔"

"ہاں مجھے اس بات کا اندازہ ہے۔ تابش نے کس قدر تلخ لہجے میں کہا لیکن یہ تلخی ایسی تھی کہ ڈاکٹر اسے محسوس نہ کر سکا۔

بات یہ طے ہوئی کہ کل کا دن وہ پھر سیر و تفریح میں گزار دیں گے اور ڈاکٹر ظہیر ان کاغذات کے حصول کے لئے کوشش کرے گا۔

لیکن تابش کے ذہن میں نہ جانے کیوں ایک خلش سی بیدار ہو گئی تھی۔

اکٹر کی زندگی کا مقصد اپنے بیٹے کے قاتلوں سے انتقام لینا تھا' اور اس مقصد کے لئے اس نے باآسانی وہ ہیرے تابش کے حوالے کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا جو ایک ہی قیمت حیثیت رکھتے تھے اور اب وہ خزانے کی بات کر رہا تھا۔ دوسری صبح ناشتہ ے بعد ڈاکٹر ان دونوں سے رخصت ہو کر چلا گیا اور ربابیہ مسکراتی ہوئی اس کے س بیٹھ گئی۔

"کیوں جناب۔ کیا خیال ہے' کیا آج بھی آپ پر وہی بوریت طاری رہے ی۔" ربابیہ نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بوریت تو مجھ پر کل بھی طاری نہیں تھی ربابیہ' وہ صرف تمہارا احساس ا۔" تابش نے کہا۔

"جی ہاں جیسے میں اتنی بے وقوف ہوں۔" ربابیہ نے ناز بھرے انداز میں کہا۔

"خیر ہر لڑکی اپنے آپ کو عقلمند سمجھتی ہے۔ لیکن میرا خیال کچھ مختلف ہے۔" تابش نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اچھا اچھا ٹھیک ہے میں بے وقوف ہی سہی' جو کچھ بھی ہوں آپ کو مجھ کو جھے اپنانا پڑے گا۔ کیا سمجھے آپ۔"

"ٹھیک ہے سمجھ گیا۔" تابش نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر وہ دونوں یاریاں کرنے لگے۔

اسٹاک ہوم کے اطراف آج بھی انکی نگاہوں سے دور نہ رہ سکے۔ صنوبر شمشاد کے درختوں کے تنے بہتے ہوئے ندیوں میں جا رہے تھے۔ اور وہ دونوں تمام ناظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ نجانے وہ کب تک گھومتے پھرتے رہے اور پھر نہوں نے ایک ہوٹل میں کھانا کھایا یہاں تک کہ شام ہو گئی۔

"کیا خیال ہے ربابیہ واپس چلنا ہے۔"

"ہاں اب تو واپس ہی چلیں گے۔ بڑی تھکن ہو گئی ہے لیکن تابش تم

بڑے مخلص انسان ہو۔"

"کیوں۔"

"اتنے حسین مناظر تمہارے اوپر اثر انداز نہیں ہوتے۔"

"ہاں ربابیہ اس کی کچھ وجوہات ہیں۔"

"کیا۔"

"بس میں بچپن سے اتنا پسا ہوا ہوں کہ اب کوئی خوشی دل و جان پر بھر
انداز میں اثر انداز نہیں ہوتی۔"

"میں تمہاری اس کیفیت کو بدل دوں گی تابش۔"

"کوشش کرنا ربابیہ شاید کامیاب ہو جاؤ۔"

"اوہ گویا تم مجھے اس کا موقع دو گے۔" ربابیہ مسکراتی ہوئی بولی۔

"ربابیہ کل تم نے مجھ سے ایک بات کہی تھی۔ تابش کسی خیال کے تحت
بولا۔

"کیا۔"؟ ربابیہ نے پوچھا۔

"تم نے کہا تھا ربابیہ کہ تم ایسی باتیں جانتی ہو جن کا میں تصور بھی نہیں کر
سکتا۔"

"ہاں تابش، لیکن تم کیا سمجھتے ہو کیا میں زندگی کا اتنا بڑا خطرہ اسی طرح
مول لے لوں گی۔"

"خطرہ۔" تابش نے تعجب سے کہا۔

"ہاں تابش خطرہ۔"؟

"کیا تم تھوڑی سی تشریح کرنا پسند کرو گی ربابیہ۔"

"لیکن تابش میں کہہ چکی ہوں کہ بعض اوقات انسان کی زندگی میں صرف
ایک ہی اہم راز ہوتا ہے اور وہ راز اس کی زندگی کا سرمایہ ہوتا ہے اگر یہ راز کھل
جائے تو پھر رازدار کے سوا اس کی زندگی میں کچھ اور نہیں رہ جاتا۔"

"یہ راز اتنی اہمیت کا حامل ہے۔" "ہاں تابش۔"

"تب تم سوچ لو ربابیہ۔ میں اس قابل ہوں یا نہیں۔"

"تم اس قابل تو ہو تابش۔ لیکن محسوس کر رہی ہوں کہ تم مجھ سے کھنچے
کھنچے سے ہو۔ یعنی تم مجھے وہ اہمیت نہیں دیتے جو میرے دل میں تمہارے لئے
ہے۔"

"یہ صرف تمہارا خیال ہے ربابیہ۔"

"کیا مطلب۔" ربابیہ اچانک خوش ہو گئی۔

"ہاں ربابیہ۔ تم میری زندگی میں رچتی جا رہی ہو۔ میں اب اکثر تمہارے
بارے میں سوچتا ہوں۔"

"میں تمہاری زندگی کی بہترین ساتھی بنوں گی تابش۔ ہم ایک ایسی جنت
میر کریں گے جس میں صرف ہم تم ہوں گے اور خوشیاں۔"

"سوچ لو ربابیہ۔ مجھ جیسے انسان کے ساتھ تم خوش رہ سکو گی۔ میں لاابالی
طرت کا مالک ہوں۔ ممکن ہے کسی وقت میں تمہارے لئے تکلیف دہ بن جاؤں۔"

"تم صرف میرے بن جاؤ تابش اس کے بعد تم کیا ہو اور کیا رہو گے یہ
یکھنا میرا کام ہے۔" ربابیہ نے کہا اور تابش خاموش ہو گیا۔

"بولو۔"

"میں تیار ہوں ربابیہ۔"

"اوہ۔ تابش۔ تابش۔" ربابیہ نے بہت زیادہ خوشی کا اظہار کیا تھا پھر وہ
ل ہوٹل میں جا بیٹھے۔ ربابیہ کے چہرے پر عجیب تاثرات تھے۔ لیکن تابش۔ وہ
ا زندگی کا وہ مخصوص کھیل شروع کر چکا تھا جو وہ اکثر کھیلتا آیا تھا۔

ڈاکٹر ظہیر سے وہ مخلص تھا۔ اسے اس بے بس بوڑھے پر ترس آیا تھا اور
نے سوچا تھا کہ ساری زندگی تو برے کاموں میں بسر کر دی ہے۔ زندگی میں کوئی
ا کام ہو جائے تو ذہن و دل کو قرار ملے گا۔"

"لیکن یہاں آنے کے بعد تابش کے ذہن نے ڈاکٹر ظہیر کے اندر تبدیلیاں محسوس کی تھیں۔ اسے شبہ ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر کے اندر کچھ گہرائی ہے۔ کا مطمع نگاہ کچھ اور ہے۔ ورنہ بیٹے کے انتقام سے خزانہ تک چھلانگ کچھ غیر فط تھی۔ اور وہ اسی بارے میں جاننے کا خواہشمند تھا۔ اور اس سلسلہ میں ممکن ربابیہ کار آمد ثابت ہو سکے۔ اسی لئے تابش نے آج اس کی بات مان کر اپنے راستہ ہموار کیا تھا۔

ربابیہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ پھر وہ ایک گہری سانس لے بولی۔ "اگر میں کچھ حیرت انگیز باتوں کا انکشاف کروں تابش تو تم یقین کرو گے۔

"میں نہیں سمجھا۔"

"ایسی باتیں جو ناقابلِ یقین ہوں۔"

"ہاں میں یقین کر لوں گا۔ ربابیہ"

"کیوں۔" اس نے سوال کیا۔

"اس لئے کہ ہم نے ایک مقدس رشتے کو اپنانے کا فیصلہ کیا ہے اور رشتے میں جھوٹ کی گنجائش نہیں ہوتی۔"

"سچ تابش۔" ربابیہ نے مسرت سے لیا۔

"ہاں ربابیہ۔ تم بتاؤ۔ تم خود کو پرکھو کیا تمہارے دل میں میرے لئے خاص مقام نہیں پیدا ہو گیا۔ کیا تم اس مقام کو نظرانداز کر سکتی ہو۔"

"نہیں تابش۔"

"اب تو میں بھی اسی اسٹیج پر ہوں۔"

"تو سنو تابش میں ڈاکٹر ظہیر کی بیٹی نہیں ہوں۔" ربابیہ نے کہا اور اچھل پڑا۔

"کیا۔ کیا واقعی۔؟"

"ہاں گفتگو میں جھوٹ کی گنجائش نہیں۔"

"پھر۔ پھر تم کون ہو اس کی۔؟"

"کوئی نہیں۔ صرف سیکرٹیری۔ اوپر سے موم کی طرح نرم اور سادہ نظر آنے والا ڈاکٹر ظہیر۔ اندر سے اتنا سخت اور کریمہ ہے کہ تم تصور نہیں کر سکتے اس دنیا میں اس کا کوئی بیٹا بھی نہیں ہے۔ وہ ہیرے جو تم نے دیکھے تھے نقلی تھے۔"

"ربابیہ۔" تابش سخت حیران کر دیا ہے۔

"ایک ایک لفظ کی تصدیق اپنی پسند کے مطابق کر لینا جہاں جھوٹ نظر آئے مجھے گولی مار دینا لیکن براہ کرم غور سے سنو۔"

"اوہ ربابیہ۔ تم نے مجھے سخت حیران کر دیا ہے۔

"ہاں تابش۔ ڈاکٹر ظہیر کا ماضی مین تمہیں بتاؤں۔ عالم نوجوانی میں وہ خود بحری قزاق تھا اور اس نے جہازوں کو لوٹ لوٹ کر کافی خزانہ جمع کر لیا تھا۔ لیکن پھر وہ گرفتار ہو گیا اور اسے بیس سال کی سزا ہوئی۔ چونکہ اس کا تعلق ایشیا سے تھا اس لئے اسے ایشیا میں ہی رکھا گیا۔ باہر نکلنے کے بعد وہ قلاش تھا۔ لیکن نہ جانے کس طرح اس نے یہ مقام حاصل کیا اور اسکے دل میں شاید آرزو تھی کہ وہ اپنا خزانہ حاصل کر کے بہتر زندگی گزارے وہ زندگی جو جیل کی نذر ہو چکی تھی۔

تابش کی آنکھیں شدید حیرت سے کھلی ہوئی تھیں۔ "پھر۔"؟ اس نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

"اس دوران اس کو ایسے جرائم پیشہ شخص کی تلاش رہی جو خزانے کے حصول میں اس کی مدد کر سکے اور اسی پروگرام کے تحت اس نے اپنے ہیروں کی پبلٹی کی تاکہ انہیں کوئی چرانے آئے اور ڈاکٹر کو کوئی کام کا آدمی مل جائے۔ سو تم مل گئے۔ یہ ہے پوری کہانی۔"

"تو ڈاکٹر کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔"

"شاید پوری دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے۔"

"تمہیں یہ ساری باتیں کس طرح معلوم ہوئیں ربابیہ۔"

"اس کی خفیہ ڈائری سے جو اتفاق سے ایک دن میرے ہاتھ لگ گئی تھی۔"

"بہت بڑا دھوکہ ہوگیا ربابہ۔ ڈاکٹر بہترین اداکار ہے لیکن اس نے شادی کا چکر کیوں چلایا ہے۔"

"صرف تمہیں پھانسنے کے لئے۔ وہ بوڑھا ہے اور اسے شبہ ہے کہ خزانہ حاصل کر کے تم اس سے دھوکہ نہ کرو چنانچہ اس نے یہ کھیل کھیلا ہے مجھے اس نے اپنی بیٹی بتایا ہے صرف اس لئے کہ تم سوچو کہ مجھ سے شادی کرنے کے بعد تو خزانہ تمہیں مل جائے گا اور اس خیال کے تحت تم ڈاکٹر سے کوئی جھگڑا نہ کرسکو۔"

"خدا کی پناہ۔" تابش نے سر پکڑ لیا۔ دیر تک وہ اسی انداز سے بیٹھا رہا پھر بولا۔ "ربابہ اب کیا ہوگا۔"

"تم میرے بننے کا وعدہ کرچکے ہو تابش۔"

"خلوص دل سے۔"

"تو میں تمہارے لئے کام کروں گی۔"

"وہ کیسے۔"؟

"ڈاکٹر نے مجھے اپنا راز دار بنا لیا ہے خزانہ حاصل کرو۔ اس کے بعد ڈاکٹر کو راستے سے ہٹا دیں گے اور پھر ہم اس خزانے کے مالک ہوں گے۔"

"اگر ڈاکٹر نے یہ سب کچھ خزانے کے لئے کیا ہے تو اچھا نہیں کیا ربابہ تم خود بتاؤ کیا میں اس کے لئے جذباتی نہیں ہوگیا تھا۔"

"ہاں مجھے علم ہے۔"

"اور اس طرح اس نے میرے جذبات کا مذاق اڑایا ہے۔"

"وہ ایک برا ماضی رکھتا ہے تابش۔ اس سے کوئی بات بعید نہیں ہے" ربابہ نے جوابدیا اور تابش سوچ میں ڈوب گیا۔

اس رات جب وہ ہوٹل پہنچے تو ڈاکٹر ظہیر واپس آگیا تھا۔ ان دونوں

دیکھ کر وہ پر خلوص انداز میں مسکرایا۔ رات کا کھانا ساتھ ہی کھایا گیا۔ اور ڈاکٹر حسب معمول اسے لئے ہوئے دوسرے کمرے میں پہنچ گیا۔ ربابہ اپنے کمرے میں رہ گئی تھی۔

ڈاکٹر ظہیر تابش کے سامنے بیٹھ گیا پھر اس نے اندرونی لباس سے کچھ کاغذات نکال کر تابش کے سامنے پھیلا دیئے۔

"ہڈسن نے وہ کاغذات میرے حوالے کردیئے ہیں وہ کام صبح ہی کو ہوگیا تھا۔ اس کے بعد میں سارا دن اس سلسلے میں آوارہ گردی کرتا رہا ہوں۔" ڈاکٹر ہیر نے بتایا۔

"اوہ خوب۔ گویا آپ نے کچھ اور بھی معلومات حاصل کی ہوں گی ڈاکٹر بش نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"وہ کیا۔"

"ہمیں کل لیپ لینڈ کے شہر کیرونا جانا ہے۔ کیرونا میں ایک وسیع و عریض بل موجود ہے، جس کے مغربی کنارے پر ایک ایسی جگہ ہے جہاں وہ خزانہ پوشیدہ ہے۔ میرا خیال ہے تابش اسے حاصل کرنے میں ہمیں کوئی خاص دقت نہیں ہوگی۔ اعلیٰ پیمانے پر تیاریاں کر کے چلیں گے۔ اور خزانہ حاصل کرلیں گے بلکہ یوں ہو کہ میں نے یہ تیاریاں مکمل کرلی ہیں۔ میں نے بتایا ناکہ میں ان ساری چیزوں ور کرچکا ہوں۔ اور تمہارے آنے سے تقریباً آدھ گھنٹہ قبل واپس آیا ہوں۔

" خوب۔ آپ کی کارکردگی تو قابل تعریف ہے ڈاکٹر۔" تابش نے اتے ہوئے کہا۔

" ہاں بس میرا دشمن مرگیا اور میرے انتقام کی حسرت دل میں ہی رہ گئی۔ ورت مرنے کے بعد تو میں اس سے انتقام نہیں لے سکتا۔ اس لئے میں نے

اس خانے کو بند کر دیا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"ٹھیک ہے ڈاکٹر اس کے علاوہ ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔؟"

"بہر صورت اب تو مجھے صرف تمہاری ذات سے امیدیں وابستہ ہیں
کچھ کروں گا، تم دونوں کے لئے ہی کروں گا۔" ڈاکٹر نے پر خیال انداز میں
اور تابش گردن ہلانے لگا۔ ویسے اس کی پر خیال نگاہیں گہرائی سے ڈاکٹر کا جائزہ
رہی تھیں۔ کتنا فطرتی انسان تھا چہرے پر ایسی معصومیت اور بے بسی کہ جیسے وا
مظلوم ہو۔

ڈاکٹر کے کمرے سے نکل جانے کے بعد تابش بستر پر لیٹ گیا۔ لیکن ا
ذہن بری طرح گھوم رہا تھا۔ ربابیہ نے جو کچھ بتایا تھا وہ اس کے لئے بڑی حیرت ا
بات تھی۔ لیکن جس طرح ڈاکٹر ظہیر نے اس کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش
تھی، ربابیہ کیا خود بھی ایسی کوشش نہیں کر سکتی۔ کیا اسے صرف ایک مخلص لڑ
جا سکتا ہے، اگر ڈاکٹر نے تابش کو دھوکہ دیا ہے تو ربابیہ بھی اسے دھوکا دے
ہے۔ تابش جذبات میں آ کر یہاں تک چلا آیا تھا لیکن ڈاکٹر اور ربابیہ کا اسے
دینا آسان کام نہیں تھا کیونکہ اس نے اپنی زندگی جرائم کی دنیا میں گزار دی تھی
ربابیہ نے اسے شادی کا فریب دیا تھا۔ لیکن تابش اب کسی سے
نہیں تھا۔ یہ خزانے کی بات تھی جس کے لئے نسلیں تباہ ہو گئی ہیں چنانچہ
اعتبار حماقت ہے۔"

دوسرے دن صبح ہی سے ڈاکٹر ظہیر نے تیاریاں شروع کر دی تھیں
غیر ملک میں اس نے بہت کچھ کر لیا تھا۔ چنانچہ ایک بڑی لانچ چل پڑی۔ اس
لیپ لینڈ کی طرف تھا۔

میلوں دور تک پھیلی ہوئی جھیل پر سمندر کا گمان ہوتا تھا۔ اسکے
چلتے ہوئے ہم نے سوئیڈن کی ثقافت پر غور کیا اور اس کے بارے میں گفتگو
رہے۔ ہم ورنالو نامی جگہ پہنچ گئے۔ یہاں ہم نے ایک سیاح کی حیثیت سے

تھا۔ "ان غاروں میں جانے کے لئے رات کا وقت موزوں رہے گا۔"
ڈاکٹر نے کہا۔

"جیسا آپ مناسب سمجھیں ڈاکٹر۔" تابش نے آمادگی ظاہر کر دی۔ ورنالو
کے نزدیک سیاحوں کی کیمپنگ تھی اس کیمپنگ میں انہوں نے بھی اپنا خیمہ لگا لیا۔
اور پھر آدھی رات اس خیمہ میں گزاری۔ آدھی رات کو انہوں نے تابش کو جگا
دیا۔

"تیار ہو تابش۔"

"ہاں ڈاکٹر۔ لیکن آپ اتنے مطمئن ہیں جیسے آپ کو کامیابی کا پورا یقین
ہے۔"

"یقین نہ آنے کا کیا سوال ہے۔ چلو۔" ڈاکٹر نے کہا۔ اور وہ تینوں چل
پڑے۔ ڈاکٹر نے اب ربابیہ کو بھی بظاہر ایک کہانی سنا کر اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا۔
اور ربابیہ بڑی سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔

پہاڑیوں کے ایک غار کے سامنے ڈاکٹر نے نقشہ نکالا اور گردن ہلاتے
ہوئے بولا۔ "یہی جگہ ہے سو فیصدی یہی جگہ ہے۔ ہم کدالیں اور ٹارچیں لے کر
غار میں داخل ہو گئے۔ خاصا وسیع اور صاف ستھرا غار تھا۔ بہرحال ایک جگہ پر سخت
کھدائی کرنا پڑی تھی۔ اور ہم ایک چٹان کو کھودنے میں کامیاب ہو گئے۔ چٹان کے
عقب میں ایک آہنی صندوق موجود تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں وہ صندوق نمایاں ہو
گیا اور ڈاکٹر کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ "ہم کامیاب ہو گئے بچو۔ ہم
کامیاب ہو گئے۔" ڈاکٹر کی خوشی سے لرزتی ہوئی آواز ابھری۔ اور پھر اس نے
صندوق کا تالا کھول دیا۔ سونے کے قیمتی زیورات ہیروں کی انگوٹھیاں و اشرفیاں
سونے کے بڑے بڑے ڈلے صندوق میں بھرے ہوئے تھے۔ غار میں دن کی روشنی
پھیل گئی۔

"آہ خزانہ لاکھوں روپے کی مالیت کا خزانہ۔" ڈاکٹر رندھی ہوئی آواز میں

بولا۔

" خود کو قابو میں رکھو ڈاکٹر۔ آؤ اس خزانے کو چرمی تھیلوں میں منتقل کر
لیں۔" تابش نے کہا۔

اور ڈاکٹر نے وہ تھیلے نکال کر سامنے ڈال دیئے جو وہ اپنے ساتھ لے کر آ
تھا۔ قیمتی خزانوں کو تھیلوں میں منتقل کیا جانے لگا۔ تقریباً چار تھیلے پوری طرح بھر گئے
تھے۔ ربابیہ اس دوران بالکل خاموش رہی تھی جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔ بہر
صورت وہ خواب کے سے عالم میں باہر نکل آئے اور پھر اس کیمپنگ تک پہنچ گئے
جہاں ان کا قیام تھا۔ تب ڈاکٹر نے کہا۔

" یہ سب کچھ تمہارے لئے ہے میرے بچو۔ سب کچھ تمہارے لئے آہ میں
کتنا خوش نصیب ہوں کہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو رہا ہوں میری بیٹی ربابیہ اور تم
اب اس خزانے سے عیش کرو گے' کیا خیال ہے کیا ہم اسی وقت واپسی کا پروگرام نہ
بنالیں۔" ڈاکٹر نے پوچھا۔

" جیسا آپ مناسب سمجھیں ڈاکٹر۔"

" ہاں ہاں چلو۔ یہاں میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میرا خاص مقصد پورا ہو چکا
ہے۔ اب ہم یہاں رک کر کیا کریں گے۔ رات میں سفر کوئی ایسی قابل اعتراض
بات تو نہیں ہے' بے شمار سیاح رات کے وقت سفر کرتے ہیں۔ آؤ۔" ڈاکٹر نے کہا
اور اسی وقت خیمہ واپس اٹھا دیا گیا۔

کیمپنگ سے واپسی میں بہر صورت کافی دیر لگی تھی' صبح ہونے میں کچھ ہی
دیر تھی جب ہم واپس اپنے ہوٹل میں پہنچے۔ تھیلے انتہائی احتیاط کے ساتھ ہوٹل کے
کمروں میں لے آئے تھے۔ نیند آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ ڈاکٹر میں اور
ربابیہ تینوں دیر تک بیٹھے اس کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔

اب اسے اپنے وطن لے جانے کا سوال ہے میں اس سلسلے میں تمہاری
رائے جاننا چاہتا ہوں تابش۔"

" میرا خیال ہے ڈاکٹر۔ ہمیں فوری طور پر یہ ہوٹل چھوڑ دینا چاہئے اور
کسی ایسی جگہ قیام کرنا چاہئے جہاں ان کی بہتر حفاظت ہو سکے" میں نے تھیلوں کی
طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

" ہاں' مناسب تجویز ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

" اس کا بندوبست آپ کو کرنا ہوگا۔"

" خیر میں یہ بندوبست کرلوں گا لیکن اس کے بعد۔"

" اس کے بعد آہستہ آہستہ ہم اسے وطن منتقل کریں گے۔ ایک بڑا حصہ
میں لے جاؤں گا ایک ربابیہ اور ایک آپ۔ بہر حال ہمیں خطرات تو مول لینا ہی
ہوں گے"!

"ٹھیک ہے۔ ممکن ہے میں کوئی بہتر تجویز سوچ سکوں۔ بہر حال تمہاری
پہلی تجویز سے متفق ہوں یعنی کسی پرائیوٹ جگہ کا بندوبست۔"

"ہاں۔ یہ ضروری ہے ڈاکٹر۔"

ٹھیک ہے جاؤ۔ لباس وغیرہ تبدیل کر کے تھوڑی دیر آرام کرلو۔
بلکہ یہیں آجاؤ۔ باتیں کریں گے۔"

"اوکے ڈاکٹر۔" تابش نے کہا اور اپنے کمرے میں آگیا۔ لیکن اب اس کی
ذہانت کا وقت شروع ہوا تھا اسے ڈاکٹر کے منصوبوں کو شکست دینا تھی اور اس کے
لئے وہ اپنی بہترین صلاحیتوں سے کام لینا چاہتا تھا۔ اس نے لباس تبدیل کیا اور
دوبارہ اس کمرے میں پہنچ گیا جہاں ربابیہ اور ڈاکٹر موجود تھے۔

ربابیہ نے عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھا تھا اور پھر غیر محسوس انداز میں
مجھے ایک اشارہ بھی کیا تھا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی اور معذرت آمیز انداز میں
ہم دونوں کو دیکھتی ہوئی باتھ روم کی جانب چلی گئی۔

میں ایک آرام کرسی میں دراز ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر ظہیر بھی ایک آرام کرسی
میں آنکھیں بند کئے دراز تھا۔ رات بھر سے جاگنے کی وجہ سے خاصی تھکن محسوس

ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر اسی طرح گزر گئی۔ باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز
رہی تھی۔ تب ڈاکٹر نے کہا۔
"رات بھر جاگنے کی وجہ سے تھکن محسوس ہو رہی ہے۔ کیا خیال ہے۔"
ڈاکٹر نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔
"ہاں ڈاکٹر۔"
"لیکن اس کے باوجود ہم پہلے اپنا کام انجام دیں گے۔ اس کے بعد کو
اور قدم اٹھائیں گے۔"
"بالکل ٹھیک ہے ڈاکٹر۔" میں نے جواب دیا۔ اسی وقت ربابیہ اندر آ
اور ڈاکٹر کہنے لگا۔ "ربابیہ کچھ بندوبست کردو ناشتہ کرنا تو میرا خیال ہے اس وق
مناسب نہ ہوگا۔ ہاں اگر ممکن ہو سکے تو کسی مشروب کا بندوبست کرلو۔"
"بہتر ڈیڈی۔" ربابیہ نے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔ میں چند ساعت سو
رہا۔ ڈاکٹر بدستور آنکھیں موندے کرسی پر دراز تھا۔ دیر تک خاموشی رہی پھر ربا
ایک ویٹر کے ساتھ واپس آگئی۔ ویٹر ایک ٹرے میں جگ اور تین گلاس سے
تھا۔ اس نے یہ تینوں چیزیں ایک بڑے میز پر رکھدیں۔ کوئی خوشرنگ مشروب تھ
ربابیہ اس مشروب کو گلاسوں میں انڈیلنے لگی اور پھر ایک گلاس ڈاکٹر کے سا
رکھدیا اور دوسرا تابش کے سامنے اور تیسرا گلاس اس نے میز پر ہی رہنے دیا تھا۔
نہ جانے کیوں تابش کو محسوس ہوا تھا جیسے ربابیہ کے چہرے پر کوئی خا
تاثر ہو۔ ایک انوکھا تاثر۔ اور اس کی چھٹی حس نے اسے خطرے کا احساس دلا
ایک لمحے میں اس نے صورتحال پر غور کیا۔ اور بولا۔
"ربابیہ پلیز تکلف تو ہو ذرا میرے کمرے سے سگریٹ اور لائٹر لادو۔"
"اوہ ضرور۔" ربابیہ نے کہا اور اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی تابش ا
مشروب کا گلاس لے کر اٹھ گیا اور اس انداز میں آگے بڑھا جیسے چہل قدمی کر
ہو۔ پھر اس نے اپنا گلاس بھی اسی میز پر رکھدیا جہاں ربابیہ کا گلاس رکھا تھا پھر

کا گلاس لے کر وہاں سے ہٹ گیا۔ اس طرح اس نے چالاکی سے گلاس بدل دیا تھا۔
پھر وہ کرسی پر آ کر بیٹھ گیا اور گلاس کی شراب کی کئی چسکیاں لے ڈالیں۔ ڈاکٹر بھی
اس دوران خاموشی سے ایک مشروب پی رہا تھا۔
تب ربابیہ واپس آگئی۔ اس نے دروازہ بند کردیا اور پھر اپنا گلاس اٹھا کر
ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ "واقعی بڑی تھکن محسوس ہو رہی ہے ڈیڈی۔"
"کیا خیال ہے مسٹر تابش۔" اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیلی
ہوئی تھی۔
"ہاں۔ میں نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔ ربابیہ بھی اپنا گلاس خالی کر چکی
تھی۔ پھر اس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔
"کیا خیال ہے ڈاکٹر ہمیں کتنی دیر لگے گی۔" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے
میری طرف دیکھا اور بولا۔
"بس چند لمحات اس کے بعد مسٹر تابش اس دار فانی سے کوچ کر جائیں
گے۔"
"اور آپ ڈاکٹر۔" ربابیہ کے لہجے میں تمسخر تھا۔
"کیا مطلب۔"
ایک گولی آپ کے گلاس میں بھی تھی ڈاکٹر۔ دراصل مسٹر تابش ڈاکٹر نے
آپ کو زہر دلوایا ہے۔ تاکہ آپ کا کیس ختم ہو جائے۔ زہر کی ایک گولی آپ کے
گلاس میں اور دوسری ڈاکٹر کے گلاس میں ڈالی گئی ہے بھئی میں کسی کو شریک کار
نہیں بنا سکتی اب میں سوئیڈن کی شہریت لے لوں گی اور یہ خزانہ میرا اور صرف میرا
ہوگا۔"
"لیکن تم۔ تم تو میرے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھیں ربابیہ۔"
"گدھے ہو۔ ہم لوگ شادی نہیں کرتے۔ ڈاکٹر نے تمہیں بیوقوف بنایا
اور میں نے تم دونوں کو۔ یہ سونا چیز ہی ایسی ہے۔"

"کتیا۔ ذلیل کتیا۔ میں تجھے۔" ڈاکٹر نے چیخ کر کہا۔ لیکن پھر اس کی آواز
بھنچ گئی اور اس نے دونوں ہاتھ گلے پر رکھ لئے۔ لیکن چند لمحات کے بعد خود رباب
کی حالت بھی خراب ہونے لگی تھی۔

"جانم۔" تابش مسکرا کر بولا۔ میں بہرحال تم دونوں سے چالاک ہوں۔ کیا
تم سمجھتی تھیں کہ میں تمہارے فریب میں آ جاؤں گا۔ جب ڈاکٹر جیسا فرشتہ صورت
اچھا انسان نہ نکلا تو تمہارے اوپر بھروسہ کیا معنی رکھتا ہے۔ شراب کے گلاس بدل
چکے ہیں ڈارلنگ۔ اور ہاں تم نے تجویز اچھی پیش کی۔ خزانے کو یہاں سے لے
جانے کی کوشش کے بجائے کیوں نہ یہیں رہائش اختیار کی جائے۔ عمدہ خیال ہے۔"

رابیہ اب زمین پر گر پڑی تھی اس نے دونوں ہاتھوں سے حلق دبا لیا تھا
تابش اطمینان سے اٹھا۔ اس نے ڈاکٹر کے کپڑوں کا سوٹ کیس خالی کر دیا۔ پھر
چاروں تھیلے اس میں ٹھونسے اور ان دونوں کو خدا حافظ کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

چاندنی رات کا شکار

کہتے ہیں شیطان کے ہاں ولی بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ولی کے ہاں شیطان
بھی۔ یہ مثال مکمل حقیقت رکھتی ہے۔ اور اکثر اس کی عملی شکلیں نمودار ہوتی
رہتی ہیں۔ ایسی ہی ایک مثال شیر زاد خان کی تھی۔ شیر زاد خان' زور آور خان کا
بیٹا تھا۔ زور آور خان جیسا نیک انسان دور دور کے علاقے میں نہیں تھا لوگ اس کی
شریف النفسی کی قسمیں کھاتے تھے۔ اس علاقے کا سب سے بڑا زمیندار تھا لیکن
پھلدار شجر کی طرح جھکا ہوا' ہر ایک کے کام آنے والا' ضرورت مند اس کے پاس
سے کبھی ناکام نہیں لوٹتے تھے۔ ہر طرف سے اس کے لئے دعائیں ہوتی تھیں۔

لیکن خدا نے اسے شیرزاد جیسا بیٹا دے کر نہ جانے کس گناہ کی سزا دی
تھی۔ شیرزاد ولی کے گھر کا شیطان تھا۔ ہاتھی کی طرح طاقتور اور لحیم شحیم' بھیڑیئے کی
طرح خونخوار اور درندہ صفت' رحم نام کے کسی جذبے کا اس کے دل میں گزر
نہیں تھا۔ نوجوانی کی عمر میں قدم رکھ چکا تھا لیکن اس کا لڑکپن ہی کیا کم قیامت تھا جو
خدا نے اسے جوانی بھی دے دی!

بچپن ہی سے اس کے مشغلے اس کی خونی فطرت کی رہنمائی کرتے تھے۔
درختوں پر سپاٹے بھرنے والی گلہریوں کو انتہائی پھرتی سے پکڑ کر وہ ان کے ہاتھ پاؤں
کاٹ دیتا اور ان کے تڑپنے کا تماشہ دیکھ کر خوشی سے قہقہے لگاتا۔ زور آور خان اس
کے ان مشغلوں سے بہت فکر مند تھا' لیکن شیرزاد اکلوتی اولاد تھا اور زور آور خان
اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ اس لئے ہول کھانے کے باوجود وہ بیٹے کو مکمل طور
سے سرزنش نہ کر سکا اور خونی بیٹا اپنے خونی مشغلوں میں اضافہ کرتا رہا۔

پھر بارہ سال کی عمر میں اس نے پہلا قتل کیا۔ زرواد خان کا بیٹا شمشیر اس کا

پہلا شکار تھا۔ شمشیر کی عمر دس سال تھی اور اکثر وہ شیرزاد کے ساتھ جھیل پر
جاتا تھا۔ اس دن دونوں بچے جھیل میں مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ شیرزاد کوشش
باوجود ایک بھی مچھلی نہ پکڑ سکا جب کہ شمشیر کے کانٹے میں لگنے والی یہ تیسری
تھی۔ شیرزاد کو غصہ آگیا پہلے تو اس کا دل چاہا کہ جھیل میں آگ لگا دے لیکن
اس کے بس کی بات نہیں تھی اس لئے نزلہ شمشیر پر گرا۔

"تم چالاکی سے میرے کانٹے میں پھنسنے والی مچھلیوں کو اپنی طرف بلا
ہو!" اس نے غراتے ہوئے شمشیر سے کہا۔

"تو تم میری طرف آنے والی مچھلیوں کو اپنی طرف بلا لو" شمشیر
معصومیت سے کہا۔

"بکواس مت کر۔ یہ تینوں مچھلیاں میری ہیں!" شیرزاد نے اس کی مچھ
اپنے قبضے میں کر لیں اور پھر شمشیر کو دھکا دیتے ہوئے کہا" تو جھیل کے دو
کنارے پر بیٹھ' پھر دیکھتا ہوں کہ تیرے کانٹے میں مچھلی کیسے لگے گی؟"

"لیکن میں یہ مچھلیاں تمہیں نہیں دوں گا!" شمشیر بھی بپھر گیا اور شی
نے اپنا چھوٹا سا شکاری چاقو نکال لیا۔

" یہ میری ہیں۔ انہیں کون لے سکتا ہے؟" شمشیر نے شیرزاد کے شک
چاقو سے خوفزدہ ہوئے بغیر کہا۔

لیکن شیرزاد کی خونی فطرت عود کر آئی تھی' اب وہ مچھلیوں کے لئے
بلکہ اپنی فطرت کی تکمیل کے لئے شمشیر کا دشمن ہو رہا تھا۔ جھیل کے کنارے
کرنے والے پرندے شمشیر کی دلدوز چیخیں سن کر خوفزدہ ہو گئے۔ شیرزاد چاقو
ایک وار سے مطمئن نہیں ہوا بلکہ اس نے پے در پے چھ وار کر کے شمشیر کو
کر دیا۔

اور جب بستی میں شمشیر کی جھیل کے کنارے پڑی ہوئی لاش کی با

ں اطلاع پہنچی تو کہرام مچ گیا۔ اس پرسکون بستی کے لوگ جیالے تھے' خوددار تھے
لین باہمی محبت اور امن اور سکون سے رہتے تھے۔ اس بہیمانہ قتل سے بستی کے ہر
رد کو دکھ ہوا...... اور پھر قاتل کی تلاش میں دشواری نہ ہوئی۔ بستی کا ایک ایک
رد شیرزاد کا نام سن کر ساکت رہ گیا تھا۔

زور آور خان کے احسانات سے سب کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں کوئی کچھ
ہ بول سکا لیکن زور آور خان نے شیرزاد کو رسیوں سے باندھ کر خود جرگہ کے
امنے پیش کر دیا تو بستی کے دل میں احترام اور بڑھ گیا۔

"تمہیں علم ہے زور آور خان' خون کا بدلہ خون ہوتا ہے؟"

"مجھے معلوم ہے اور میں اس قانون کا احترام اپنا فرض سمجھتا ہوں۔!"
زور آور خان نے لرزتی ہوئی لیکن پرعزم آواز میں کہا۔

جرگے کا سردار اس انسانیت کے پیکر کے ایثار کو فراموش نہ کر سکا۔ سب
جانتے تھے کہ شیرزاد' زور آور خان کا اکلوتا فرزند ہے سب کو علم تھا کہ وہ اس کی
دولت کا تنہا مالک ہے اور یہ بات بھی سب جانتے ہیں زور آور خان نے اس کی
پیدائش کے لئے کیسی کیسی منتیں مانی تھیں تب کہیں جا کر شیرزاد کا منہ دیکھ سکا تھا
اور سب ہی کو معلوم تھا کہ زور آور خان بیٹے کی موت کا غم برداشت نہ کر سکے گا۔

لیکن قانون' قانون تھا۔ جرگہ کا سردار بھی' شمشیر کے باپ کی اجازت کے
بغیر شیرزاد کو معاف نہ کر سکتا تھا۔ زرداد خان بیٹے کے غم میں پاگل ہو رہا تھا لیکن
پاگل پن کے عالم میں بھی وہ زور آور خان کے اس احسان کو فراموش نہ کر سکا جو
اس نے کسی کو کانوں کان خبر کئے بغیر کیا تھا۔ چنانچہ اس نے لرزتی آواز سے شیرزاد
کو معاف کرنے کا اعلان کیا۔ اس نے کہا۔

" میرا چراغ گل ہو چکا ہے۔ خدا شیرزاد کو انسان بننے کی توفیق دے۔
میں زور آور کے گھر کی روشنی نہیں چھینوں گا۔ میں نے شیرزاد کو معاف کیا' خدا

بھی اسے معاف کرے۔"

اور جرگے میں غلغلہ بند ہو گیا۔ زور آور خان نے زرداد خان کے
پکڑ لئے اور پھر اس نے زرداد خان کو اتنی دولت دی کہ ساری عمر اطمینان
زندگی بسر کر سکے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بیٹے پر پابندیاں لگا دیں! شیرزاد بار
قید میں زخمی چیتے کی طرح تلملانے لگا لیکن ابھی بے بسی کی عمر تھی۔ وہ کچھ نہ کر
تھا البتہ باپ کی طرف سے اس کے دل میں نفرت پیدا ہو گئی۔

یہ پابندی چھ ماہ تک جاری رہی اس دوران زور آور خان بیٹے
نصیحتیں بھی کرتا رہا اور اس کے انسان بننے کے لئے دعا بھی۔ پھر چھ ماہ ک
کے بعد شیرزاد پر سے پابندی کچھ نرم کر دی گئی۔ شیرزاد چالاک تھا اس نے ظا
کہ وہ اب شریف بن گیا ہے۔ لیکن در پردہ اس کی درندگی جاری رہی۔ شمشیر کو
کرنے میں اسے بے پناہ لذت ملی تھی اور قید کے دوران بھی وہ اس لذ
فراموش نہ کر سکا۔ اس کا دل بے اختیار چاہتا تھا کہ وہ کسی اور کو قتل کر دے۔

لیکن فی الحال یہ ممکن نہیں تھا البتہ جب اس کی عمر اٹھارہ سال ہوئی تو
شام اسے زور آور خان کا پستول چرانے کا موقع مل گیا اس نے زور آور خا
پستول غائب کر دیا اور اس وقت تک اسے چھپائے رکھا جب تک اس کی تلا
ترک نہ کر دی گئی۔ اب وہ ایک پستول کا مالک تھا اور پھر ایک شام وہ اس جگہ
گیا جہاں عام راستہ گزرتا تھا' اس راستے پر قافلے سفر کرتے تھے اور مختلف قبا
کے لوگ یہاں سے گزرتے تھے!۔

وہ تین بدنصیب انسان تھے جو بڑی بستی سے روز مرہ کے استعمال کا سا
لے کر اپنی بستی جا رہے تھے۔ ان کے خچر سست رفتاری سے سفر کر رہے تھے او
بار بار انہیں تھپکیاں رسید کر رہے تھے تاکہ رات ہونے سے قبل گھر پہنچ جائیں
اچانک پستول کا دھماکہ ہوا اور ان میں سے ایک کی پیشانی میں سوراخ ہو گ

رے دونوں انسان گھبرا گئے لیکن وہ نہ تو فرار ہو سکے اور نہ مدافعت کے لئے
کر سکے۔ شیرزاد کے پستول سے نکلی ہوئی دو اور گولیاں انہیں چاٹ گئیں اور
کے خچر گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

پھر ایک اور قبیلے کے لوگوں نے اس راستے سے گزرتے ہوئے ان تین
ن کو دیکھا اور اس کی اطلاع بہت جلد اس قبیلے تک پہنچ گئی جس کے وہ تینوں
ں تھے جس علاقے میں ان تین افراد کو قتل کیا گیا تھا وہ زور آور خان کا تھا۔
مرنے والے افراد کے قبیلے کا ایک وفد غیض و غضب میں ڈوبا ہوا زور آور
قبیلے میں آیا اور اس سے مطالبہ کیا کہ ان تینوں افراد کے قاتلوں کو ان کے
لے کیا جائے' ان کا خون بہا دیا جائے۔ ورنہ دوسری صورت میں جنگ کے لئے
رہا جائے۔

قبیلے کے ایک ایک فرد سے پوچھ گچھ کی گئی لیکن سب نے ان تین افراد
تل سے لاعلمی کا ظاہر کی۔ وفد کے افراد اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار
تھے کہ قتل اس قبیلے کے لوگوں نے نہیں کیا ہے۔ زور آور کے قبیلے کے
ر نے کہا کہ قاتلوں کے بارے میں اسے کوئی علم نہیں ہے اگر پتہ چل سکا تو
قبیلے کے جرگے کو اطلاع دے دی جائے گی۔ دماغ ٹھنڈے رکھنے کی کوشش کی
ورنہ خونریزی ہو گی جسے کوئی بھی پسند نہیں کرتا! لیکن بپھرے ہوئے وفد نے
صالحانہ رویئے کو بھی مکاری سمجھا اور دھمکیاں دیتا ہوا واپس چلا گیا اور پھر قبیلے
ضا میں پورے تیس سال کے بعد جنگ کے بادل منڈلانے لگے! زور آور کے
کے لوگ صلح پسند اور امن کے حامی ضرور تھے' لیکن بزدل نہ تھے اور دنیا جانتی
کہ ٹھنڈے دماغ کے لوگ جب جنگ کرتے ہیں تو گرم دماغ والے ان کے
نہیں رک سکتے!۔

اس قبیلے نے پورے تیس سال کے بعد جنگ کے لئے ہتھیار اٹھائے اور

دوسرے قبیلے کے حملہ آور ہونے کا انتظار کرنے لگے اور پھر پر نباری کی ایک ر
میں دوسرے قبیلے نے زور آور کے قبیلے پر حملہ کر دیا ان کا خیال تھا کہ زور
قبیلے کے لوگ غافل ہوں گے۔ لیکن یہ خیال باطل ہو گیا۔ چٹانوں نے آگ
شروع کر دی اور حملہ آور قبیلے کے لوگوں کو جان بچانا مشکل ہو گیا۔ اس کی
قدمی رک گئی اور وہ پوزیشن لے کر جنگ کرنے پر مجبور ہو گیا۔ لیکن وہ بھی
قبیلہ نہیں تھا۔ اس کے حامیوں نے اس کی مدد کی اور پورے تیرہ دن تک
جاری رہی۔

زور آور کا قبیلہ محفوظ جگہوں کی وجہ سے اب بھی ان پر بھاری
تھا، کوئی بھی فرد جنگ پسند نہیں کرتا تھا۔ لیکن اب قبیلے کی آن کا سوال تھا۔ چنا
فرد کو بہادری دکھانے کا موقع دیا گیا!

اور جب خونریزی کا موقع ملا تھا تو شیرزاد کیوں پیچھے رہتا اس
درخواست کی کہ اسے اپنے طور پر کام کرنے کی اجازت دی جائے اور اسے ا
مل گئی۔ تب شیرزاد نے قبیلے کے چنے ہوئے جیالوں کو اکٹھا کیا یہ سب اس کی
نوجوان تھے اور اب اپنے دشمنوں کے خون کے پیاسے تھے اور جب انہیں ش
جیسا بے جگر اور سنگدل رہنما ملا تو وہ جو کچھ نہ کر دیتے، کم تھا!

سات دن تک حملہ آور قبیلے نے برابر کی جنگ لڑی تھا۔ اس کا جتنا
نقصان ہو رہا تھا اتنا ہی نقصان دوسرے قبیلے کا ہو رہا تھا، لیکن بعد کے چھ دن
آور قبیلے کے لئے مصیبتوں کے دن تھے۔ شیرزاد نے ان پر عرصہ حیات تنگ
دیا۔ وہ ہتھیار پھینکنے والوں کو بھی نہیں چھوڑ رہا تھا اس کا کام صرف قتل کرنا
حملہ آوروں کے قدم اکھڑ گئے۔ انہیں شیرزاد کی وجہ سے بدترین شکست کا سا
پڑا اور وہ بچے کھچے ساتھیوں کے ساتھ فرار ہو گئے!

☆☆☆☆☆☆☆

زور آور کے قبیلے نے شاندار جشن فتح منایا۔ اس جشن میں شیرزاد کو
خراج تحسین پیش کیا گیا لیکن شیرزاد اپنی ٹولی کے ساتھ غائب تھا نہ جانے وہ کس
مہمات میں نکل گیا تھا! اس جشن میں جرگے کے سردار نے فیصلہ کیا کہ اس جنگ میں
دشمن کو شکست دینے کے باوجود اس سے انتقام نہیں لیا جائے گا۔ اور اسے خلوص
دل سے معاف کر دیا جائے گا۔ اس سے کہا جائے گا کہ ان تین افراد کے قاتل کو
جس وقت بھی گرفتار کیا گیا اس قبیلے میں بھیج دیا جائے گا! آئندہ امن کی راہیں ہموار
کی جائیں گی۔

زور آور کے قبیلے نے یہ پیغام دوسرے قبیلے کو بھجوا دیا اور قبیلے کے
شکست خوردہ افراد نے جو انتقام کے خوف سے اپنے بستیاں چھوڑ کر پہاڑوں میں
روپوش ہونے کی تیاریاں کر رہے تھے، اس پیغام کو سن کر فاتح قبیلے کے ممنون ہو
گئے۔ انہوں نے فرار کی تیاریاں بند کر دیں! لیکن اسی وقت شیرزاد کی خونی ٹولی ان
پر جا پڑی۔ اس نے ایسی تباہی مچائی کہ زمین آسمان کانپ اٹھے۔ اس نے قبیلے کا تمام
سازوسامان لوٹ لیا۔ اس کے بچے، بوڑھے، مرد اور عورتوں کو قتل کر دیا لوٹ کے
مال میں چند حسین اور نوجوان لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ شیرزاد اپنے درندہ صفت
ساتھیوں کے ساتھ لوٹ کا مال لے کر چل پڑا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے قبیلے کے لوگ
اس کے اس کارنامے پر بہت خوش ہوں گے۔ لیکن اسے اپنے باپ کا بھی خیال تھا۔
زور آور خان کم از کم اس کے ساتھ لڑکیوں کی موجودگی پسند نہیں کرے گا! چنانچہ
وہ رات انہوں نے پہاڑوں میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔

اور اس رات شیرزاد پہلی بار عورت کی لذت سے آشنا ہوا۔ ابھی تک
اس کی فطرت صرف خونریزی کی طرف مائل تھی۔ لیکن اس رات اسے معلوم ہوا
کہ مرد کی زندگی عورت کے بغیر بے مزہ ہے! وحشت و بربریت کی اس تاریک
رات میں نوخیز اور جوان دوشیزاؤں کی دلدوز چیخیں، چٹانوں کا کلیجہ شق کرتی رہیں

اور شیرزاد کے وحشی ساتھیوں کے قہقہے ان چیخوں کا مذاق اڑاتے رہے۔ گلرنگ دو شیزاؤں کے مرمریں جسم خون میں ڈوب گئے اور اس رات کی صبح بے حد وحشت انگیز تھی۔ لٹی ہوئی عصمتیں چٹانوں پر برہنہ پڑی تھیں' ان کے جسموں پر زخم تھے' آنکھوں میں آنسو اور خاموش! سنگدل شیرزاد نے ان جاندار لاشوں کو دیکھا اور فیصلہ کیا کہ انہیں قبیلے میں لے جانا خطرناک ہے۔ چنانچہ اس نے ساتھیوں کو ان زندہ لاشوں پر نشانہ بازی کی دعوت دی اور ظلم کے رسیا تیار ہوگئے!

نیم مردہ لڑکیوں کو ٹھوکر مار کر اٹھایا اور انہیں بھاگنے کا حکم دیا گیا۔ زندگی سے کسے پیار نہیں ہوتا' نیم مردہ جسموں کو لئے اپنی برہنگی کو بھولے ہوئے وہ فرار ہو کر ان بھیڑیوں کے چنگل سے نکل جانے کی کوشش کرنے لگیں اور بھاگتی ہوئی لڑکیوں کے جسموں کو گولی کا نشانہ بنانے کا کھیل شیرزاد اور اس کے ساتھیوں کو بہت ہی دلچسپ محسوس ہوا۔

فائروں کی آوازیں گونجتی رہیں اور چٹانیں ان کمزور اور مظلوم لڑکیوں کے خون سے غسل کرتی رہیں تھوڑی دیر کے بعد بہت سی چٹانیں خون سے سرخ ہو گئیں۔ اور ان کے دامن میں آرزوؤں کی کہانیاں بے گور و کفن پڑی تھیں۔

اس دلچسپ کھیل سے فارغ ہو کر شیرزاد لوٹا ہوا مال لئے گھوڑوں پر سوار ہو کر اپنے قبیلے کی طرف چل پڑا اور تیز رفتاری سے سفر کرتا ہوا گردن فخر سے بلند کئے قبیلے میں داخل ہوا اور اس کے منتظر لوگ اس کے استقبال کے لئے دوڑ پڑے۔ انہوں نے شیرزاد کا پر جوش استقبال کیا کیونکہ وہی اس جنگ کا ہیرو تھا۔ پر جوش استقبال کرنے والوں میں زور آور خان بھی تھا۔

لیکن جب شیرزاد نے لوٹا ہوا مال جرگے کے سردار کے سامنے پیش کیا اور اپنی بہادری کی داستان سنائی تو سردار غم و خوف سے چیخ پڑا۔

"کس کی اجازت سے تم نے یہ خونریزی کی؟ کس کی اجازت سے تم نے
ٹ مار کی؟"

"یہ فاتح قبیلوں کا حق ہے سردار!" شیرزاد نے کہا۔

"لیکن سردار کی اجازت سے۔ افسوس ہم نے انہیں کیا پیغام دیا ہے اور نے کیا کیا؟ اب پہاڑوں میں بسنے والے قبیلے ہمیں بددیانت اور جھوٹوں کے نام سے پکاریں گے' کوئی ہمارے قول پر اعتماد نہیں کرے گا!"

"مجھے اس پیغام کا کوئی علم نہیں تھا سردار......!" شیرزاد نے مکاری سے
ہا۔

"صرف یہی بات سزا سے بچاتی ہے ورنہ تم سزا کے مستحق تھے۔" سردار نے ہاتھ ملتے کہا اور شیرزاد غصے سے تلملاتا ہوا واپس آگیا۔ اس کے خیال میں یہ ں کی حق تلفی تھی۔ اسے اس کی محنت کا پھل نہیں دیا گیا تھا۔

سردار نے پھر جرگے کو طلب کیا اور اس بات پر غور ہونے لگا کہ اب کیا یا جائے......؟ کھویا ہوا اعتماد کیسے بحال کیا جائے۔ ابھی اس بارے میں کوئی فیصلہ یں ہونے پایا تھا کہ پامال شدہ قبیلے کے چھ افراد زخموں سے چور فریاد لے کر سردار کے پاس پہنچ گئے۔ ان کے گھوڑوں پر مرمریں لاشیں لدی ہوئی تھیں۔ ان مظلوم ر بے گناہ لڑکیوں کی لاشیں جن کی عصمت دری کر کے انہیں گولی کا نشانہ بنا دیا گیا
ا!

بستی سے جس فرد نے ان لاشوں کو دیکھا غصے سے دیوانہ ہوگیا۔ فریاد لے کر آنے والوں نے جرگے کے سردار کو بتایا کہ ان کے ساتھ ظلم ہوا ہے اور ظلم کرنے والا کون ہے!

خدا کی قسم اس جرم کو معاف نہیں کیا جائے گا۔ مجرموں کو سرراہ سنگسار کیا جائے گا انہیں ایسی عبرتناک سزا دی جائے گی کہ یہ حرکت کرنے والو کے دل رکت کرنا بھول جائیں گے!" سردار نے جوش غضب سے کہا۔

"لیکن ظالم اس قبیلے کے سب سے با اثر شخص زور آور خان کا ب
ہے۔" کسی نے سردار کو یاد دلایا۔

اگر زور آور نے بیٹے کی حمایت کی تو اسے بھی بیٹے کے جرم کا برابر شریک قرار دیا جائے گا اور اس کی سزا بھی وہی ہو گی جو اس کے بیٹے کی!" غصے سے لرزتے ہوئے سردار نے کہا اور پھر نرم لہجے میں بولا۔ " حالانکہ ہم زور آور پر شک کرکے گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں وہ جیسا انسان ہے' سب جانتے ہیں۔"

پھر خفیہ طور پر ان تمام افراد کے گھروں کی ناکہ بندی کرادی گئی جو شیر کے ساتھ شریک تھے اور سردار نے زور آور خان کو طلب کر لیا۔

زور آور خان جس وقت جرگے کی پتھریلی عمارت میں داخل ہوا تو تم نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ سامنے ہی بانوں سے بنی ہوئی چارپائیوں پر مظلو لڑکیوں کی لاشیں چادروں سے ڈھکی ہوئی رکھی تھیں۔ زور آور خان نے حیرت سے ان لاشوں کی طرف دیکھا اور پھر چاروں طرف کھڑے ہوئے لوگوں کے چہروں ک پڑھنے کی کوشش کرنے لگا! پھر اس نے سردار سے سوال کیا۔

"مجھے کیوں طلب کیا گیا ہے سردار.....؟"

"ایک اہم فیصلے کے لئے زور آور خان......! سردار کی پاٹ دار آوا گونجی۔

"میں منتظر ہوں......!" زور آور خان نے کہا.... اور سردار نے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ اس نے ڈھکی ہوئی لاشوں پر سے کپڑے کھینچ لئے اور ان بر کلیوں کو دیکھ کر زور آور خان کی آنکھیں جھک گئیں اس نے خوف سے جھرجھر لی۔

"یہ کیا ہے سردار...... خدا کے واسطے مجھے جلد ان کی مظلومیت ک داستان سنادیں میرے صبر کا امتحان نہ لیں۔"

" فیصلہ یہ کرنا ہے زور آور خان کہ ان مظلوم لڑکیوں کی عصمت دری کر کے انہیں ہلاک کرنے والوں کے ساتھ کیا کیا جائے؟" سردار نے زور آور خان کے چہرے پر نظریں جما کر کہا۔

"سلوک؟ ان ننگ انسانیت لوگوں کے جسم ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں۔ ان کے خاندان کے ایک ایک فرد کو زندہ جلا دیا جائے تاکہ سانپوں کی نسل آگے نہ بڑھ سکے۔"

" ہمیں تم سے اسی جواب کی توقع تھی زور آور خان' لیکن اس میں تمہارے ضمیر کا امتحان بھی ہے' ٹھنڈے دل سے غور کرکے جواب دو کہ اگر ان لوگوں میں تمہارا بیٹا بھی شامل ہو' تو تم کیا کرو گے؟"

زور آور خان کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ اس کا پورا جسم لرزنے لگا اور اس نے غصے سے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اگر میرے بارہ بیٹے ہوتے اور اس ظلم میں شریک ہوتے تو میں ان میں سے ایک ایک کو سنگسار کرتا۔ پھر اس عورت کو کتیا کی موت مار دیتا جس نے ان بیٹوں کو جنم دیا ہوتا اور پھر خود علاقے کی سب سے بلند پہاڑی سے کود کر خودکشی کر لیتا کیونکہ وہ میرے بیٹے تھے"

زور آور خان کے پر جلال چہرے اور اس کے سخت الفاظ کو سن کر سب دہشت زدہ ہو گئے سردار بھی چند منٹ تک کچھ نہ بول سکا پھر اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

" آفرین ہے زور آور خان لیکن اولاد اگر غلط نکل جائے تو ماں باپ کی حد تک قصور وار نہیں ہوتی۔ ہاں اس اولاد کی طرف داری ضرور قابل برداشت ہوتی ہے ۔ خدا سے اپنے گناہ کی معافی مانگو زور آور خان اور اس المناک انکشاف پر ہمیں بھی اپنے برابر کا شریک غم سمجھو کہ ان لڑکیوں کی عصمت دری کر کے انہیں

گولیوں کا نشانہ بنانے والوں کا سردار تمہارا بیٹا شیرزاد ہے اس نے شکست خوردہ قبیلے کو لوٹا وہاں درندگی کی ایسی مثال قائم کی کہ رہتی دنیا تک ہم اس داغ کو اپنی پیشانی سے نہیں مٹا سکتے وہ قبیلے کی نوجوانوں لڑکیوں کو اٹھا لایا پھر اس نے اور اس کے ساتھیوں نے ان کلیوں کو مسل دیا اور ان کے پاک جسموں سے اپنی ناپاک خواہشات کی تکمیل کے بعد انہیں مشق ستم بنایا۔ یہ مظلوم لوگ فریاد لائے ہیں۔ ان کی داد رسی کرنی ہوگی زور آور خان ۔ ہماری خواہش ہے کہ شیرزاد اور ان تمام لوگوں کو کل صبح ان فریادیوں کے سامنے سنگسار کیا جائے اور اس کام میں یہ خود شریک ہوں۔"

زور آور خان کا چہرہ پتھر کی طرح سخت تھا۔ اس کی آنکھوں سے اس کے تاثرات کا اندازہ لگانا مشکل تھا سردار اور دوسرے لوگ اس کے جواب کے منتظر تھے لیکن جب زور آور خان کئی منٹ تک خاموش رہا تو سردار نے کہا۔

"کیا تمہیں ہمارے اس فیصلے پر اعتراض ہے زور آور خان؟"

"نہیں" زور آور خان نے انتہائی پر سکون لہجے میں کہا پھر بولا "ظالم' بے حد چالاک ہے' سردار اس سے قبل کہ اس فیصلے کی اطلاع اسے پہنچے اور وہ فرار ہونے کی کوشش کرے' اسے گرفتار کر لیا جائے۔"

" مرحبا زور آور خان ہمیں صرف تمہارے فیصلے کا انتظار تھا ان سب لوگوں کے گھروں کی ناکہ بندی کر دی گئی۔ ابھی تھوڑی دیر کے اندر انہیں گرفتار کر کے تاریک خانقاہ میں قید کر دیا جائے گا" سردار نے کہا اور پھر اس نے مجرموں کی گرفتاری کے احکامات صادر کر دئیے۔

شیرزاد کی غمزدہ ماں بے چینی سے زور آور کی منتظر تھی۔ بیٹے کی گرفتاری نے اسے شدید حیران کر دیا تھا۔ کل تک تو پورے قبیلے کی عورتیں اسے شیرزاد جیسے جیالے کو جنم دینے پر مبارک باد دینے آتی رہی تھیں اور شیرزاد کی ماں کی گردن فخر سے بلند ہو گئی تھی۔ اس نے زور آور خان کو شرمندہ کیا تھا کہ جس بیٹے کو وہ دن رات برا بھلا کہتا تھا' جس بیٹے کا مستقبل اسے بھیانک نظر آتا تھا اسی نے آج قبیلے کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے اور زور آور شرمندہ انداز میں مسکرانے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکا تھا۔ لیکن آج اسی بیٹے کو اس بے دردی سے کھینچ کر لے جایا گیا تھا' آخر کیوں؟

زرو آور خان جیسے ہی گھر میں داخل ہوا' وہ بپھرے ہوئے انداز میں کھڑی ہو گئی۔

"کیوں گرفتار کیا گیا ہے میرے بیٹے کو؟ کیا جرم کیا ہے اس نے یہی ناکہ قبیلے کی عزت بچالی ہے اور دشمنوں کو عبرت ناک شکست دے کر قبیلے کا سر اونچا کیا ہے میں کہتی ہوں یہ انصاف ہے؟ کس کے حکم سے میرے شیردل شیرزاد کو گرفتار کیا گیا ہے؟"

"انصاف چاہتی ہو تاجور؟" زور آور خان نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"ہاں میں انصاف چاہتی ہوں میں ان سازشیوں کی سزا کی طلب گار ہوں جنہوں نے میرے بیٹے کے خلاف سازش کر کے گرفتار کر لیا ہے۔ آخر کیا جرم کیا ہے میرے بیٹے نے؟"

"انصاف کیا جائے گا تاجور' پورا پورا انصاف کیا جائے گا۔ کل صبح تمہارے شیرزاد کو سنگسار کر دیا جائے گا۔ یہ جرگے کے سردار کا فیصلہ ہے لیکن ایک فیصلہ اور ہے جو میں نے کیا ہے۔" زور آور خان نے بدستور پر سکون لہجے میں کہا۔

" سنگسار کر دیا جائے گا؟ میرے بیٹے کو؟" شیرزاد کی ماں نے حیرت اور خوف کے ملے جلے انداز میں پوچھا' لیکن زور آور خان نے کوئی جواب نہیں دیا وہ خاموشی سے اندر چلا گیا اور پھر اس نے دیوار سے لٹکی ہوئی بندوق اتار لی۔ پھونک مار کر اس کی نال صاف کی' اسکا نشانہ دیکھا اور پھر دو کارتوس نکال کر اس کے چیمبر

میں لگائے۔ بندوق ہاتھ میں لئے وہ باہر نکل آیا۔ تاجور اسی طرح سکتے کے عالم میں بیٹھی تھی۔ زور آور خان کے ہاتھ میں بندوق دیکھ کر بھی اس کے چہرے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

"ہاں تمہارے بیٹے کو سنگسار کیا جائے گا تاجور ایک ایسے جرم کی پاداش میں جس کے لئے یہ سزا ناکافی ہے۔ کاش اس کے لئے کوئی اس سے بڑی سزا تجویز ہوتی۔"

"اس نے کیا جرم کیا ہے؟" تاجور نے غضب ناک شیرنی کی طرح پوچھا۔

"شکست خوردہ قبیلے کی چودہ لڑکیوں کو اغواہ کرنے کا جرم' پہاڑوں میں لے جا کر ان کی عصمت دری کرنے کا جرم اور پھر ان کے پامال جسم کو گولیوں کا نشانہ بنانے کا جرم...... صرف یہی جرم کئے ہیں اس نے۔ کیا تمہارے خیال میں اس کی سنگساری کے لئے یہ جرائم کافی نہیں ہیں؟"" نہیں' نہیں یہ نہیں ہو سکتا' شیرزاد ایسا نہیں کر سکتا""؟

"اس نے کیا ہے تاجور' اس نے یہی کیا ہے' جرگے نے اسے سنگسار کرنے کی سزا دی ہے' لیکن میرے نزدیک یہ سزا کافی نہیں ہے تاجور جرگے کے سردار نے انصاف سے کام نہیں لیا ہے شیرزاد کو اس سے بڑی سزا ملنی چاہئے تھی میں نے اپنے ضمیر کے مشورے سے شیرزاد کے لئے ایک سزا تجویز کی ہے۔ جسے سردار نے منظور نہیں کیا لیکن میرے خیال میں سزا کسی حد تک مناسب تھی شیرزاد کو وہی سزا ملنی چاہئے میں اپنے ضمیر کی آواز کو دبا نہیں سکتا ہوں۔ میں شیرزاد کو وہی سزا دینا چاہتا ہوں جو سردار نے منظور نہیں کی۔ میں نے سردار سے کہا تھا کہ اس جرم کے مجرم کو سنگسار کیا جائے اور اس کے اہل خاندان کو زندہ جلا دیا جائے تا کہ اس مجرم کی نسلیں تک تباہ ہو جائیں اور پھر اس کی نسل کا کوئی نوجوان اتنا سنگدل پیدا نہ ہو میں اب بھی اس فیصلے پر قائم ہوں۔ ہمارے خاندان کا چراغ

شیرزاد تھا۔ شکر کرو تاجور آج تمہیں صرف ایک بیٹے کا غم ہے' خدا کی قسم اگر میرے بارہ بیٹے ہوتے تو ان میں سے ہر بیٹے کو یہی سزا دیتا تاکہ اس ناپاک خون کے جراثیم اس کی پشت کی کسی نسل کے فرد میں سرایت کر کے اس بہیمت کا دوبارہ مظاہرہ نہ کر پاتیں۔ ہمارے جسم ناپاک ہیں تاجور' ہمارے جسم سے مس ہو کر چلنے والی ہوائیں جراثیم پھیلا سکتی ہیں مجھے اپنے خون کی گندگی کا شدید غم ہے جب میرے جسم سے شیرزاد کا ناپاک نطفہ تمہارے جسم میں منتقل ہوا تھا' کاش اس وقت کوئی سانپ مجھے ڈس لیتا' کاش اس وقت طوفان آ جاتا اور ہم دونوں چٹان کے نیچے دب کر مر جاتے' کاش ہماری زندگی میں وہ رات نہ آتی۔"

زور آور خان کا چہرہ آگ کی طرح سرخ ہو رہا تھا اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ "ہمیں اس جرم کی سزا ملنی چاہئے تاجور کہ ہم نے اس درندہ صفت بیٹے کو کیوں پیدا کیا؟ میں نے اپنے اور تمہارے لئے ایک معمولی سزا تجویز کی ہے میں تمہیں گولی مار دینا چاہتا ہوں' کیونکہ تم اس سنگدل شیطان کی ماں ہو' اور پھر میں پہاڑوں کی سب سے اونچی چٹان سے کود کر خود کشی کر لوں گا یہ میرا عزم ہے۔"

زور اور خان نے بندوق سیدھی کر لی اور تاجور کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

اب وہ زور آور خان سے متفق تھی۔

فائر کی آواز ہوئی لیکن تاجور کے منہ سے چیخ نہ نکلی وہ چیخ کر اپنی تکلیف کا اظہار نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ اس کی کوکھ سے جنم لینے والے نے دوسروں کو جو تکلیف پہنچائی تھی وہ اس تکلیف سے زیادہ تھی۔ وہ چیخ کر شرمندہ ہونا نہ چاہتی تھی

زور آور خان کے دوسرے فائر نے اس کی تکلیف کا خاتمہ کر دیا۔

"میں تجھے آخری بار اپنے سینے سے لگا کر بوسہ نہیں دوں گا تاجور' کیونکہ تو ایک درندے کی ماں ہے" زور آور خان نے ڈوبتے ہوئے لہجے میں کہا اور پھر وہ اندر سے مٹی کے تیل کا کنستر اٹھا لایا اس نے گھر میں چاروں طرف تیل چھڑکا اور

اسے آگ دکھا دی اس کے بعد وہ مکان کے عقبی حصے سے نکل کر بلند پہاڑی چٹان کی طرف چل دیا۔

"تو جانتا ہے معبود میں ایک قابل سزا انسان کو سزا دے رہا ہوں۔ میری نیت صاف ہے' تیری عطا کی ہوئی زندگی نعمت تھی' لیکن میں اس نعمت کا جائز استعمال نہ کر سکا اور میرے نطفے نے ایک ایسے انسان کو جنم دیا جو میرے لیے باعث شرمندگی ہے۔" اس نے بلند چٹان کے کنارے کھڑے ہو کر آسمان کی طرف منہ کر کے کہا اور چٹان سے چھلانگ لگا دی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تاریک خانقاہ بلند و بالا پہاڑیوں کے درمیان ایک گہرا تاریک غار تھا جو بے حد کشادہ تھا ایک پرانی روایت کے تحت یہاں کسی بزرگ نے قیام کیا تھا۔ اس لئے یہ خانقاہ کہلاتی تھی' لیکن اب وہ جیل کی حیثیت سے استعمال ہوتی تھی۔ جرگہ سزا کے طور پر کسی کو دو چار دن کے لئے یہاں بھیج دیتا تھا اور لوگ یہاں آنے کے خوف سے لرز جاتے تھے۔

شیرزاد اور اس کے ساتھیوں کو ان کا جرم سنا دیا گیا تھا اور ایک رات کے لئے انہیں یہاں پہنچا دیا گیا۔ دوسری صبح ان کی زندگی کی آخری صبح تھی شیرزاد نے اس سزا کو قبول نہیں کیا تھا۔ اس کے دل میں اپنے قبیلے کے سردار کے لئے نفرت پیدا ہو گئی تھی وہ ایسی موت مرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

اس وقت بھی وہ غار کی تاریک دیوار سے پشت لگائے بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا اس کے تمام ساتھی موت کے خوف سے گہری گہری سانسیں لے رہے تھے کوئی ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتا تھا اور تاریکی نے ان سب کے تاثرات کو چھپا رکھا تھا کافی دیر کی خاموشی کے بعد تاریکی میں اس آواز گونجی!۔

"کیا تم لوگوں نے ناانصافی کی اس موت کو قبول کر لیا ہے؟؟"

اس کی آواز کے جواب میں کوئی آواز سنائی نہ دی "کیا تم سب موت کے خوف سے مر چکے ہو؟" شیرزاد' شیر کی طرح گرجا۔

"لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں شیرزاد...!؟ کسی نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"خودکشی"... شیرزاد نے اسی طرح گرج کر کہا.... "ہم خودکشی کر سکتے ہیں تاکہ مرتے وقت انہیں شکست دے دیں جنہوں نے ہمارے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ فتح کے بعد جشن فتح ہمارا حق تھا جو ہم نے اپنی مرضی کے مطابق منایا کیونکہ ہم فاتح تھے پھر انہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ ہمیں اس جشن کی سزا دیں؟"

"لیکن ہمیں خودکشی کس طرح کرنی چاہئے شیرزاد؟"

"میرے ذہن میں اس کے لئے ایک بہترین ترکیب آئی ہے خودکشی کا ایک باعزت طریقہ لیکن تم سب کو میرا ساتھ دینا ہو گا" شیرزاد نے مسکراتے ہوئے کہا اور وہ سب تاریکی میں آنکھیں پھاڑنے لگے۔

"کیا تم میرا ساتھ دو گے؟"

"ہم تمہارا ساتھ دیں گے" سب نے بیک وقت کہا۔

"تب پھر اٹھو غار کے دہانے کو ایک پتھر سے بند کیا گیا ہے اس پتھر کو بند کرنے میں جتنے آدمیوں نے طاقت صرف کی ہے ہماری تعداد ان سے کہیں زیادہ ہے کیا ہم اس پتھر کو ہٹا کر دروازہ نہیں کھول سکتے؟"

"لیکن دروازے کے باہر پہریدار ہوں گے وہ ہمیں بھون ڈالیں گے" کسی نے کہا۔

"ان کی گولیوں سے ہمیں موت ہی آئے گی نا۔ یہ موت اس موت سے بدرجہ بہتر ہو گی جو کل صبح ہمارا استقبال کرے گی پورے قبیلے کی نگاہ ہم پر ہو گی اور ہم پتھروں کی بارش میں سسک رہے ہوں گے ہمارے دانت ٹوٹ جائیں گے' آنکھیں پھوٹ جائیں گی' جسموں کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی اور پھر ہمارے بھیجے باہر

نکل پڑیں گے۔ کیا وہ موت اس موت سے اچھی ہوگی جو پہریدار کی گولیوں سے آئے گی؟"

"نہیں نہیں وہ موت ہمیں پسند نہیں ہے۔"

"تب اس موت کو پسند کر لو جس میں ہمارے بچ جانے کے امکانات بھی ہیں۔" اور سب تیار ہو گئے۔

وہ دیواریں ٹٹولتے ہوئے غار کے دہانے کے قریب پہنچ گئے۔ سب نے اس بڑی چٹان پر ہاتھ رکھے جو غار کے دھانے کو ڈھکے ہوئے تھی اور اس پر طاقت صرف کرنے لگے سیدھے سادھے انسانوں نے ان کی تعداد کا خیال نہیں رکھا تھا۔ تاریک خانقاہ ایک دو آدمی کے لئے تو جیل کا کام دے سکتی تھی لیکن بیک وقت اتنے سارے آدمیوں کے لئے نہیں۔ چٹان دوسری طرف لڑھک گئی اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اندر آنے لگے جرگے والے ان قیدیوں کو اس مضبوط جیل میں بند کر کے مطمئن ہو گئے تھے انہوں نے کسی پہریدار وغیرہ کا خیال ہی نہیں رکھا تھا چنانچہ باہر میدان صاف تھا۔

اور جب باہر سے کوئی تحریک نہیں ہوئی تو شیرزاد اپنے ساتھیوں کے ساتھ باہر نکل آیا۔ شیر کچھار سے باہر نکل آیا.... بپھرا ہوا خونخوار شیر..... اور اب جو کچھ نہ کرتا کم تھا۔ شیرزاد کے ساتھیوں کے لئے یہ زندگی غیر متوقع تھی..... وہ خوشی سے پھولے نہ سمائے تاروں کی چھاؤں میں وہ ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے اور پھر ان کی نگاہیں دور بستی کے ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کی طرف اٹھ گئیں۔

"وہ بستی اب ہمارے لئے نفرت کی بستی ہے ہمارا تعلق اب اس سے ختم ہو گیا ہے وہاں ہمارا کوئی عزیز نہیں ہے۔ اب وہ ہمارے دشمنوں کا شہر ہے کیا تم میں سے کوئی دشمنوں کے شہر میں جانا پسند کرے گا؟" شیرزاد نے پوچھا۔

"اب وہاں ہمارا کون ہے شیرزاد اب ہم وہاں جا کر کیا کریں گے؟" سب

ے یک زبان کہا۔

"تب پھر تم زندگی کیسے گزارو گے قبیلے والے ہمارے فرار سے واقف ہو ر ہمیں علاقے کے کونے کونے میں تلاش کریں گے دوسرے قبیلے انکی مدد کریں ے اور ایک ایک کر کے ہم سب گرفتار ہو جائیں گے کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟"

"ہماری رہنمائی کرو شیرزاد" انہوں نے کہا۔

"اگر تم شیرزاد" پر بھروسہ کرو گے تو ماحول ہمارا تابع ہو گا' لوگ ہمارے موں سے کانپیں گے' ہمارے دشمن ہمیں خراج ادا کر کے زندہ رہ سکیں گے ہم جو بیلوں کے منہ پھیر سکتے ہیں اس پورے علاقے پر ہماری ہیبت ہو گی لیکن اس کے لئے تمہیں جان فروشی کرنی ہو گی کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟"

"ہم تیار ہیں" سب نے بیک وقت کہا۔

"تب آؤ دشمنوں کے اس شہر سے ہم گھوڑے اور ہتھیار حاصل کریں گے زاحمت کرنے والے ہر شخص کو فنا کر دو' خواہ وہ تمہارا بھائی کیوں نہ ہو اب ہماری لگ قوم ہے' ہمارا کوئی بھائی' کوئی عزیز نہیں ہے آؤ۔ اور درندوں کا یہ دستہ ات کی تاریکی میں غم واندوہ میں ڈوبی ہوئی بستی کی طرف چل پڑا۔

انہوں نے خاموشی سے گھوڑے کھولے جس قدر اسلحہ مل سکتا تھا حاصل لیا اور پھر ان کے گھوڑے پہاڑوں کی طرف نکل گئے بستی کے لوگ اس طوفان ے بے خبر تھے جو اب شیرزاد کی شکل میں آنے والا تھا۔

انہیں تو دوسری صبح رات کے واقعات کا علم ہو سکا اور صبح بستی والوں ے لئے عجیب تھی زبانوں پر جہاں درندہ صفت شیرزاد کی خوفناک آزادی کے رچے تھے' وہیں اس کے فرشتہ خصلت باپ کی داستان بھی تھی اس غیور باپ کی استان جو اپنے بیٹے کے جرم کا مجرم خود کو بھی قرار دے چکا تھا' کیونکہ اس بیٹے نے س کے ہاں جنم لیا تھا کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اس المیے پر نم نہ تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

برف کی بستی، سرشام سنسان ہو گئی نہ جانے یہ شام اتنی بھیانک کیوں تھ
برف باری یہاں کے لئے کوئی نئی چیز نہ تھی سال کے بیشتر مہینوں میں برف بار
ہوتی رہتی تھی اس لئے یہ برف کی بستی کہلاتی تھی۔ آج شام بھی موسم نے بتا
کہ برف باری ہو گی اور لوگوں نے تیاریاں کرلی تھیں۔ تمام کاروبار معمول س
پہلے بند ہو گئے تھے اور پختہ اور نیم پختہ مکانوں کے چراغ روشن ہو گئے تھے۔ لیک
آج بستی کے لوگوں کے ذہنوں پر بوجھ تھا ایک ناقابل بیان سا بوجھ ہر شخص محسو
کر رہا تھا، لیکن کوئی کسی سے اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔

ماہ رخ بھی اس بوجھ سے خود کو آزاد نہ محسوس کر سکی حالانکہ برف بار
اس کے دل میں خوشبوؤں کا طوفان لاتی تھی آسمان سے برستے ہوئے سفید ذرا
اسے بہت پسند تھے اور وہ دعا کرتی کہ دن رات برف باری ہوتی رہے لیکن آج
اس موسم سے لطف اندوز نہ ہو رہی تھی نہ جانے یہ کیسا بوجھ تھا جو اس کے دل
دماغ پر طاری تھا باورچی خانے سے اس کی ماں کی آواز آ رہی تھی جو حسب معم
اس کے بھائی پر چیخ چلا رہی تھی اور کبھی کبھی چمٹے کی آواز بھی سنائی دے جاتی جو
زمان کے جسم کے کسی حصے پر ہی پڑا ہوتا تھا۔

یہ شاہ زمان بھی خوب ہے اپنے کہنے کے مطابق جب تک وہ چولہے
پاس بیٹھ کر دو چار جھڑکیاں، دو چار چمٹے نہیں کھا لیتا تھا اس کی دن بھر کی تھکن ن
اترتی تھی۔ شاہ زمان خوبانیوں کی تجارت کرتا تھا۔ ایک چھوٹے سے حصے میں ا
نے خوبانیوں کے درخت لگائے تھے۔ جو اس کی محنت سے خوب پھل دیتے تھے ا
پھر وہ سیزن بھر تازہ خوبانیاں اور اس کے بعد خشک خوبانیاں فروخت کرتا تھا۔ ا
خاصی گزر ہو رہی تھی باپ نے مکان کے پچھواڑے ترکاریاں لگا رکھی تھیں جو
کی ضرورت بخوبی پوری کر دیتی تھیں، کچھ بھیڑیں تھیں جن کی دیکھ بھال بھی

ن اور ماہ رخ کے باپ نے اپنے ذمہ رکھی تھی اس طرح چار افراد پر مشتمل یہ
۔ خوشحال زندگی گزار رہا تھا ماہ رخ کی عمر اٹھارہ سال تھی، شاہ زمان بائیس سال
ہو چکا تھا، لیکن والدین کو بیٹی کی شادی کی فکر تھی ماہ رخ جنگلی بیل کی طرح بڑھ
ی تھی اس کے چھلکتے ہوئے حسن کو دیکھ کر نہ جانے کتنے دلوں کے پیمانے لبریز ہو
تے تھے۔ والدین کو اس بات کا پورا پورا احساس تھا اور وہ روزانہ کی آمدنی میں
کچھ نہ کچھ پس انداز کر رہے تھے تاکہ ماہ رخ کے ہاتھ پیلے کئے جا سکیں۔

"ارے مان جا موذی، سارا گوشت کچا ہی کھا جائے گا تو روٹی کے ساتھ کیا
کھائے گا" چمٹے کی سڑاک کے ساتھ ہی ماں کی آواز سنائی دی ماہ رخ بے اختیار
پڑی وہی پرانا جھگڑا شاہ زمان پکتی ہوئی ہانڈی سے گوشت کی بوٹیاں نکال کر کھاتا
تھا۔ شکر کے ڈبے سے شکر نکال کر پھانکتا رہتا اور ماں اس پر چیختی چلاتی رہتی۔

صحن سے باپ کے حقہ گڑگڑانے کی آواز سنائی دے رہی تھی کیسی مانوس،
میٹھی آوازیں ہیں یہ.....ماہ رخ نے سوچا اور وہ کچھ اور اداس ہو گئی اس
رسے کہ ماں باپ اس کی شادی کی فکر کر رہے ہیں۔ پھر یہ مانوس آوازیں کیسی
ں ہو جائیں گی اور نہ جانے کون کون سی آوازیں، نہ جانے وہ کیسی آوازیں
ا۔ ماہ رخ نوجوان ضرور تھی، لیکن نوجوان لڑکیوں کی طرح اس کی
ں بے لگام نہیں تھی۔ اس نے آج تک کسی مرد کو گہری نگاہ سے نہیں دیکھا تھا
، والدین کی عزت کا پورا پورا احساس تھا اور بستی کے لوگ اس گھرانے کو
ت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

کھڑکی سے ہوا کا نم جھونکا آیا اور ماہ رخ کو سردی کا احساس ہوا اس کا دل
کہ کھڑکی بند کر دے، لیکن نہ جانے کیوں اس نے اس خواہش عمل نہیں کیا
ی اس کے جسم میں سرایت کرتی رہی اور اسے پھر ایک عجیب سی ویرانی کا
س ہوا۔

"ماہ رخ، روشنی کیوں نہیں کی؟" باورچی خانے سے ماں کی آواز سنائی د
اور وہ چونک پڑی اسے کمرے میں چھا جانے والی تاریکی کا احساس ہوا۔ باہر اب ب
روشنی تھی، لیکن اندر اندھیرا پھیل گیا تھا ایک طویل انگڑائی لے کر وہ اٹھی آ
دان سے ماچس اٹھا کر اس نے مٹی کے تیل کا چراغ روشن کر دیا۔

اور چراغ روشن ہوتے ہی دھماکے ابل پڑے وہ بری طرح اچھل پڑی ا
خوف زدہ نظروں سے چراغ کو دیکھنے لگی لیکن بہت جلد اسے احساس ہو گیا
دھماکے چراغ سے نہیں ہو رہے بلکہ باہر ہو رہے ہیں اس کے باپ کے حقے کی آ
بند ہو گئی ماں کی بک بک بھی بند ہو گئی اور شاہ زمان کی آواز سنائی دی۔

"یہ کیسے دھماکے ہیں بابا؟"

"گولیاں چل رہی ہیں۔" بوڑھے گل زمان نے کہا۔

"کیا ہوا؟ کسی سے جھگڑا ہو گیا؟ میں دیکھوں؟"

"دماغ خراب ہے تیرا تاریکی میں چلنے والی گولیاں راستہ نہ
دیکھتیں۔" ماں نے شاہ زمان کی قمیض کا کالر پکڑ کر کہا۔

"لیکن عورتوں کی طرح گھر میں گھسے رہنا بھی ٹھیک نہیں ہے ماں"
زمان نے کہا۔

"میں دیکھتا ہوں" گل زمان نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ ماہ
جلدی سے کمرے میں پہنچی اور کھڑکی کھول کر باہر جھانکنے لگی لیکن گولیاں چ
آواز دور سے آ رہی تھی البتہ باہر بھاگتے دوڑتے لوگ صاف نظر آ رہے تھے۔

چند لمحات کے بعد ماہ رخ کا باپ ہانپتا کانپتا گھر میں داخل ہوا "ڈاکو...
شیرزاد نے گاؤں پر حملہ کر دیا ہے" اس نے ہانپتے ہوئے لہجے میں کہا "ابھی و
بستی کی طرف ہے لیکن جلدی ادھر کا رخ کرے گا۔"

"خدا غارت کرے اس شیرزاد کو، اس بستی والوں کے پاس کیا رکھا

نواسے لوٹنے آ گیا"

"ماہ رخ بندوق نکال دے، بیٹا گولیاں لے آ اور کھڑکی کے پاس سے ہٹ
ا۔" بوڑھے نے کہا اور ماہ رخ کوٹھری کی طرف گئی جہاں اس کے باپ کی پرانی
ندوق اور تھوڑے سے کارتوس رکھے ہوئے تھے۔

"خدا غارت کرے، خدا غارت کرے۔" ماں ایک ہی گردان کر رہی تھی
ر ماں رخ خوف زدہ انداز میں شیرزاد کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ "شیرزاد
ن علاقوں کا بے تاج شہنشاہ تھا پورے علاقے کے قبائل اسے خراج ادا کرتے تھے
ں کی درندگی کی داستانیں ہر زبان پر تھیں۔ خراج وصول کرنے کے باوجود تفریحا
ل و غارت گری کرتا تھا اس کے ساتھی نوجوان طوفان کی طرح کسی بستی پر جا پڑتے
ر مال و اسباب لوٹتے اور نوجوان لڑکیوں کو اٹھا لے جاتے، کوئی ان کا کچھ بگاڑ
یں سکتا تھا۔ شیرزاد کے لئے بہت سے قبائل نے اتحاد کر کے ایک باقاعدہ دستہ
تیب دیا تھا، لیکن اس دستے کا ایک فرد بھی زندہ نہ بچ سکا اور ان قبائل کی بے
ر بستیاں نیست و نابود کر دی گئیں۔ سینکڑوں نوجوانوں قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد
ی کی ہمت نہ ہوئی کہ ایسا کوئی قدم اٹھاتا۔ جس نے شیرزاد کے لئے کوئی سازش
، موت کے گھاٹ اتر گیا۔ بڑے بڑے جیالے اس کے نام سے کانپتے تھے اور کبھی
چھ نہ نیچی کرنے والے قبائل بھی اسے خراج ادا کرنے پر مجبور تھے۔

اس طرح شیرزاد اس علاقے کے لئے قہر بن گیا تھا اس چھوٹی سی بستی کا
ا نے رخ کبھی نہیں کیا تھا کیونکہ یہ معمولی حیثیت کی حامل تھی لیکن آج نہ جانے
طوفان اس طرف کیسے مڑ گیا تھا؟

"تو یہ خوف، یہ بوجھل ماحول، کسی خونی داستان کی ابتدا تھی۔" ماہ رخ
ے سوچا۔ گولیوں کی آواز تیز تر ہوتی گئی۔ آہ و بکا کی آوازیں ان کی آوازوں سے
آہنگ تھیں۔ لوگ جان بچانے کے لئے بھاگ رہے تھے اور شیرزاد کے درندہ

صفت ساتھیوں کے گھوڑے انہیں روند رہے تھے۔ بستی والوں نے حتی المقدور مقابلہ کرنے کی کوشش کی لیکن طوفان کے آگے کہیں بند بندھتے ہیں؟ ذرا سی دیر میں ان کی مدافعت ختم ہو گئی اور اب صرف انہیں قتل کیا جا رہا تھا۔ لوٹا جا رہا تھا' ان کے مکانات کو آگ لگائی جا رہی تھی اور بڑی بستی کی تباہی کے بعد شیر زاد نے چھوٹی بستی کا رخ کیا اسے اس بات سے غرض نہیں تھی کہ کہاں کیا ملتا ہے' اسے تو صرف قتل و غارت گری سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ چھوٹی بستی بھی مصیبت میں گھر گئی شاہ زمان نے کھڑکی کے پاس مورچہ سنبھال لیا اور دوڑتے ہوئے گھڑ سواروں پر نشانہ لگانے لگا۔

اس کا نشانہ بہت اچھا تھا اور ماہ رخ نے اپنی آنکھوں سے تین سواروں کو خاک و خون میں لوٹتے دیکھا تھا۔ وہ بھائی کی دلیری پر بہت خوش تھی اور باپ کو شا زمان کے کارنامے کے بارے میں بتاتی جا رہی تھی۔ دوسری طرف ڈاکو بھی اس خطرناک مکان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اس کھڑکی سے ہونے والی فائرنگ انہیں شدید نقصان پہنچا رہی تھی۔

چنانچہ ایک ڈاکو نے دستی بم کا پن ہٹا کر اس کھڑکی کی طرف اچھال دیا۔ شا زمان کی تیز نظروں نے بم دیکھا اور ماہ رخ کو لپیٹ میں لے کر دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی پتھروں کی دیوار اڑ گئی لیکن دونوں بہن بھائی بچ گئے تھے۔ ڈاکو انہیں مہلت نہیں دینا چاہتے تھے' چنانچہ کئی آدمی اندر گھس آئے اور ان کے سینوں پر بندوقیں رکھ دی اسی وقت ایک تیز سیٹی کی آواز سنائی دی اور شاہ زمان اور اس کے باپ کی جان بچ گئی۔ ورنہ ڈاکو انہیں نشانہ بنانے جا رہے تھے۔

یہ سیٹی شیر زاد کی تھی اور اس کا مطلب تھا کہ بستی والوں نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور اب کسی ڈاکو کو ایک گولی بھی چلانے کی اجازت نہیں ہے نہ جانے اس شریفانہ اصول کو شیر زاد نے کیسے اپنا لیا تھا یا پھر یہ بھی اس کی تفریحات میں ایک

بات تھی حالانکہ کئی مرتبہ اسے نقصان بھی اٹھانا پڑا تھا۔

ڈاکوؤں نے ان چاروں کو کھڑا کیا اور دھکیلتے ہوئے باہر لے آئے تب ماہ رخ نے پہلی بار ڈاکو شیر زاد کو دیکھا اتفاق سے شیر زاد اس وقت ان کے مکان کے سامنے ہی تھا باہر اتنی روشنی اب بھی تھی کہ شیر زاد کے خوفناک چہرے کو دیکھ سکتی تھی کبھی یہ چہرہ خوبصورت بھی ہو گا لیکن ظلم کی لعنت نے اسے کریہہ بنا دیا تھا۔

شیر زاد نے بھی اسے دیکھا اور دیکھتا رہ گیا وہ بستی کی دوسری لڑکیوں کو بھول گیا جنہیں اس کے انتخاب پر پکڑا گیا تھا۔ بستی سے آہ و بکا کی آوازیں اب بھی بلند ہو رہی تھیں' لیکن شیر زاد اب صرف ماہ رخ کو دیکھ رہا تھا پھر اس کا گھوڑا آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور ماہ رخ کے قریب پہنچ گیا اور پھر گھوڑے سے اتر گیا اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے جیسے وہ کوئی انوکھی چیز دیکھ رہا ہو.... اس کی زندگی میں پہلی لڑکی وہ تھی جب اس نے ایک فاتح کی حیثیت سے ایک قبیلے کو لوٹا تھا اور وہاں سے حاصل شدہ لڑکیوں پر تشدد کر کے انہیں قتل کر دیا تھا اس لڑکی نے اسے عورت کی لذت سے متعارف کرا دیا تھا اور اس کے بعد جب وہ ڈاکو بن گیا تو اسی لڑکی کے جسم کی لذت نے لوٹ مار کے ساتھ لڑکیوں کے اغوا کی عادت بھی ڈال دی۔ شاذو نادر ہی اس کی راتیں عورت سے خالی ہوتی تھیں اب تو اسے ان لڑکیوں کی شکلیں بھی یاد نہیں رہی تھیں جنہیں اس نے تباہ کیا تھا وہ سہمی سہمی لڑکیاں جو اسے دیکھ کر سکتے کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتی تھیں۔ شیر زاد کا نام ہی ان کے حواس پر بجلی گرانے کے لئے کافی ہوتا تھا۔ شیر زاد ان بے جان لاشوں کو بھسبھور کر رکھ دیتا اور وہ خوف سے کراہ تک نہ سکتیں۔

اور اب اس کی زندگی میں عورت کا نیا روپ آیا تھا۔ کیسا موہنی روپ تھا وہ سحر میں مبتلا ہو گیا تھا ایسی پاکیزگی' ایسی تمکنت تو اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی یہ کیا ہے....؟ اس کا دل دھڑکنے لگا وہ خود کو لڑکی کے سامنے بے بس محسوس کرنے لگا

اس نے اپنا وجود ہلکا پھلکا محسوس کیا اور اسی عالم میں کئی منٹ گزر گئے۔

"اس کے بارے میں کیا حکم ہے سردار؟" اس کے ایک ساتھی نے آگے بڑھ کر پوچھا اور شیرزاد نے چونک کر اسے دیکھا۔

اس کا ساتھی اس کے دیکھنے کے مفہوم کو غلط سمجھا اور اس نے دوسری لڑکیوں کی طرح ماہ رخ کے دونوں بازو پکڑ کر اسے بے دردی سے کھینچا اور شیرزاد کے جسم میں بجلی دوڑ گئی' زندگی میں پہلی بار عورت کی بے حرمتی اسے پسند نہ آئ اس نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھے بغیر پستول سیدھا کیا اور پستول کی گولی ساتھی ک پسلیاں چیرتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔

تب شیرزاد چند قدم پیچھے ہٹا اور پھر اس نے اپنے ایک ساتھی کو بلا کر آہستہ سے کچھ کہا ساتھی کے چہرے پر حیرانی کے آثار نمودار ہوئے لیکن اتنی ہم نہ تھی کہ وہ سردار کے حکم کی تعمیل کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی کرتا۔ وہ تیز سے پیچھے ہٹا اور دوسرے ساتھیوں کو کچھ ہدایات دینے لگا۔

اور پھر لوٹ کا مال ماہ رخ کے مکان کے سامنے ڈھیر کیا جانے لگا۔ پور بستی کا لوٹا ہوا مال' ماہ رخ کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔ شیرزاد نے ہاتھ سے کو اشارہ کیا اور ان لڑکیوں کو چھوڑ دیا گیا جسے اس نے منتخب کیا تھا لڑکیاں سہم کر او ادھر دبک گئیں پھر شیرزاد آہستہ آہستہ آگے بڑھا اس نے اپنی کمر سے پستول ن اور پیٹی سے کارتوس نکال کر چیمبر میں بھرنے لگا۔

تمام لوگ حیرت و خوف سے یہ عجیب کاروائی دیکھ رہے تھے۔ شیرزاد۔ پستول کو ایک نظر دیکھا اور پھر کچھ اور آگے بڑھ کر اس نے پستول ماہ رخ۔ پیروں کے پاس رکھ دیا اور پھر سیدھا ہو گیا۔

"میں پھر آؤں گا۔" اس نے آہستہ سے کہا اور پلٹ گیا۔ دوسرے۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور پھر آن کی آن میں گھوڑے ہوا ہو گئے۔

پوری بستی کے لوگ حیرت و خوف سے انھیں دیکھتے رہے اور جونہی آخری گھوڑا نگاہوں سے اوجھل ہوا بستی میں شور مچ گیا۔ لوگ اپنے اپنے عزیزوں کی لاشیں تلاش کرنے لگے۔ ماہ رخ کے باپ نے اپنی بیوی اور بیٹے کے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور واپس مکان کی طرف بڑھ گیا۔

"یہ کیا ہوا بابا؟" ماہ رخ نے حیرت سے پوچھا۔

"قیامت آئی اور گزر گئی۔ نہ جانے کتنے موت کا شکار ہوئے' دولت تو آنی جانی چیز ہے۔ آؤ اندر آؤ......" بوڑھے نے کہا۔ وہ ماہ رخ کو کیسے بتاتا کہ کیا ہوا؟ بستی کے لوگ بچ گئے تھے لیکن ماہ رخ محفوظ نہیں تھی۔ شیرزاد کی انوکھی حرکت وہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ وہ ماہ رخ کی محبت شکار ہو گیا تھا لیکن پریشانی کی بات یہ تھی کہ وہ پھر آنے کو کہہ گیا تھا۔

بستی میں ماتم ہو رہا تھا' چاروں طرف سے بین کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لوٹ کا مال بدستور ماہ رخ کے مکان کے سامنے ڈھیر تھا لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔

ماہ رخ کے مکان کا ایک حصہ بھی دستی بم سے تباہ ہو گیا تھا' لیکن مکان کافی بڑا تھا اور اس کے دوسرے حصے سالم تھے۔ ان سالم حصوں میں سے ایک حصہ میں ماہ رخ ایک بستر پر دراز تھی اور دوسرے کمرے میں اس کی ماں' بھائی اور باپ گردن جھکائے بیٹھے کسی سوچ میں غرق تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد بوڑھے نے گردن اٹھائی اور بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیوں نہ ہم یہ بستی چھوڑ دیں؟"

پھر کہاں جائیں گے بابا؟" گل زمان نے کہا۔

کسی اور بستی میں؟"

مجھے کسی ایسی بستی کا نام بتا دو جو شیرزاد کے ظلم سے آزاد ہو؟"

"تب پھر..... ممکن ہے بستی کے کسی آدمی کو شیرزاد سے کوئی نقصان نہ پہنچے' لیکن وہ بد بخت ہماری عزت کے درپے ضرور ہے' ہمیں وہ ضرور نقصان پہنچائے گا اور خدا نہ کرے وہ میری ماہ رخ کو......"

"ماہ رخ کو وہ اس وقت بھی اٹھا کر لے جا سکتا تھا بابا ممکن ہے خدا کوئی بہتر صورت نکال دے۔ ہمیں انتظار کرنا چاہئے۔"

بیٹے کی بات پر بوڑھا کافی دیر تک غور کرتا رہا اور پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر گردن ہلا دی۔

دوسری طرف ماہ رخ خیالات میں گم تھی۔ اس کے ذہن میں بھی شیرزاد کا تصور تھا اور وہ اس تصور سے لرز رہی تھی۔ کیسا بھیانک چہرہ تھا اور اس کے ساتھی کیسے خوفناک تھے' لیکن یہ انوکھی حرکت اس نے کیوں کی' وہ مجھے ایسے کیوں گھور رہا تھا اور میری وجہ سے اس نے اپنے ایک ساتھی کو کیوں مار دیا؟ پھر بستی کا لوٹا ہوا مال ہمارے سامنے ڈھیر کیوں کر دیا گیا اور وہ پھر آنے کا کہہ کر کیوں واپس چلا گیا؟

یہ سوالات اس کے ذہن میں چکرا رہے تھے اور وہ ان کا صحیح حل تلاش نہ کر پا رہی تھی۔ اس نے بابا سے بھی سوال کیا تھا' لیکن بابا نے بھی اسے ٹال دیا تھا۔ وہ سوچتی رہی بستی کے مصیبت زدوں کی مدد کے لئے اس کا دل تڑپ رہا تھا لیکن اس وقت اسے باہر جانے کی کون اجازت دے گا؟ وہ دور سے ان کی آوازیں سنتی رہی اور نہ جانے کب اسے نیند آ گئی۔

بستی کے دوسرے لوگوں کی طرح گل زمان بھی اپنے بیٹے کے ساتھ اپنے ٹوٹے مکان کی دیوار تیار کرنے لگا۔ ماہ رخ اور اس کی ماں بھی ان کی مدد کر رہی تھے لیکن بستی والوں کا رویہ ان کے ساتھ اچھا نہ تھا۔ نجانے کیوں بستی والے گل زمان سے اجنبیت سی برتنے لگے تھے۔ گل زمان اس بات پر بہت حیران تھا اگر ب

لوگ اس رات کے واقعے سے متاثر تھے تو پھر یہ اجنبیت کیسی؟ ماہ رخ کی وجہ سے تو ان کی عزتیں بچ گئیں تھی' ورنہ وہ لڑکیاں شیرزاد کے قبضے میں ہوتیں اور وہ انہیں حاصل نہ کر سکتے پھر کیا بات ہے' ان کا مال بھی انہیں واپس مل گیا ہے۔ گل زمان نے اس میں سے ایک ذرہ برابر چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ آخر گل زمان نے فیروز بابا کو روک کر ان سے یہ سوال کیا۔

"وہ تم سے بھی خوف زدہ رہنے لگے ہیں گل زمان شیرزاد نے تمہاری وجہ سے سب کا مال واپس کیا تھا۔ اب وہ تمہیں شیرزاد کا منظور نظر سمجھتے ہیں اور اسی لئے ان کے دلوں میں تمہارے لئے اجنبیت پیدا ہو گئی۔"

"کیا وہ سب پاگل ہیں' کیا میں نے ان کے ساتھ کوئی برائی کی ہے؟ اگر بستی والے مجھے ٹھکرائیں گے تو میں یہ بستی چھوڑ دوں گا۔ میں نے تمام مصیبت اپنے کندھوں پر لے لی ہے۔ اگر بستی کی دوسری بیٹیوں کی عزت بچانے کے لئے میری جان بھی کام آجائے تو میں جان دے دوں گا' پھر یہ اجنبیت کیسی؟ مجھ سے یہ بیگانگی برداشت نہیں ہوتی فیروز بابا۔"

"میں بستی والوں سے بات کروں گا۔" فیروز بابا نے کہا اور گل زمان ٹھنڈی سانس لے کر کچھ سوچنے لگا۔

☆☆☆☆☆☆☆

شیرزاد کانٹوں کے بستر پر لوٹ رہا تھا۔ وہ اپنی بوٹیاں نوچ رہا تھا.... اپنے بال نوچ رہا تھا۔ یہ کیا ہو گیا..... یہ کیا بات ہے.... کیا وہ پاگل ہو گیا ہے کیا وہ بزدل ہو گیا ہے؟ اگر نہیں تو یہ سب کیا ہے اس نے بستی کا مال کیوں واپس کیا؟ گو اسے لوٹے ہوئے مال سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ اسے خراج کی شکل میں اتنی دولت مل جاتی تھی کہ وہ اور اس کے ساتھی شہنشاہوں کی زندگی بسر کر رہے تھے لیکن یہ تو اس کا اور اس کے ساتھیوں کا شوق تھا۔ قتل وغارت گری' لوٹ مار.....

ان کی یہی تفریح تھی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کے چہروں پر بھی حیرت کے نقوش
دیکھے تھے۔ لیکن اتنی ہمت کسی کی نہیں تھی کہ وہ اس بارے میں اس سے سوال
کرتے۔

لیکن وہ خود سے سوال کر رہا تھا۔ یہ کون سا جذبہ تھا' کون سی خواہش تھ
کہ اس نے سب کچھ اس لڑکی کے قدموں پر نچھاور کر دیا۔ آخر کیوں؟ اگر وہ ا
پسند آگئی تھی تو دوسری لڑکیوں کی طرح اسے بھی حاصل کیا جا سکتا تھا۔ لیکن وہ ا
کیوں نہیں کر سکا۔ بلکہ جب اس کے ایک ساتھی نے لڑکی کے بازو پکڑ کر کھینچے
اسے بالکل ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی اس کے ساتھ زیادتی کر رہا ہو اور اس نے
دریغ اپنے ساتھی کو گولی مار دی۔

کیوں.....؟ وہ اس لڑکی سے کیا چاہتا ہے؟ اسنے بے چینی سے اپنا سر
اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ ایک طرف پانی سے بھرا ہوا ٹب رکھا تھا۔ اس نے
میں اپنا چہرہ ڈال دیا۔ ٹھنڈے پانی نے اسکی آنکھیں کھول دیں' لیکن دل کی آ
تب بھی سرد نہ ہوئی..... رہ رہ کر اس لڑکی کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے آ جا

اور پھر اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ ممکن ہے وہ اس کی منتظر ہو۔
ممکن ہے..... ممکن ہے۔ وہ سیدھا ہو گیا۔ اس نے ٹب کے پانی سے منہ دھویا۔
سنوارے اور پھر دوسرا لباس پہن کر اس نے ہتھیار سنبھالے اور انہیں اپنے ج
ڈال کر خاموشی سے غار سے نکل آیا۔ غار سے نکلنے کے لئے اس نے خفیہ ر
استعمال کیا۔

یہ اس کا مسکن تھا۔ پہاڑیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ جس میں میلوں دور
سرنگوں کے اس جال کے ذریعے کہیں سے کہیں پہنچا جا سکتا تھا۔ سرنگ کے د
سے نکل کر وہ گھوڑوں کے اصطبل تک گیا۔ اپنا گھوڑا کھولا اور باہر نکل
دوسرے لمحے اس کا گھوڑا ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ راستے اس کی نگاہوں

معدوم تھے۔ اس کی آنکھوں میں صرف ایک چہرہ تھا اور وہ اس چہرے کے تصور
میں سفر کر رہا تھا۔

اس کے دلی حالات شاید گھوڑے کو بھی معلوم ہو گئے تھے۔ اس نے
گھوڑے کو کسی خاص راستے پر ڈالنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن گھوڑا اسی
راستے پر جا رہا تھا۔ جہاں وہ جانا چاہتا تھا۔ گھوڑے کے سفر کو نہ جانے کتنا وقت لگ
گیا۔ وہ تو اس وقت چونکا جب گھوڑے کی رفتار سست ہو گئی اور اس نے سامنے
دیکھا تو کوئے یار سامنے تھا۔

اس نے گھوڑے کی پشت تھپتھپائی اور پھر عقل نے ساتھ دیا۔ وہ ڈاکو
ہے۔ لوگ اس سے خوفزدہ ہیں۔ نفرت کرتے ہیں' گو وہ اسے خراج ادا کرتے ہیں'
لیکن یہ خراج وہ خوشی سے نہیں دیتے۔ ایسی شکل میں اگر اس کے دشمن تنہا پا کر گھیر
لیں' وہ اکیلا ہی بہت سوں کے لئے کافی تھا لیکن پھر بھی شیرزاد کے خاتمے کے لئے
دس بیس اپنی جانیں دینے کے لئے فوراً تیار ہو جائیں گے۔

عقل روک رہی تھی' لیکن دل دیوانہ تھا۔ وہ کہہ رہا صرف چند قدم پر
موہنی صورت موجود ہے' جو ممکن ہے اس کی منتظر ہو۔ اس نے دل کی بات مان لی۔
گھوڑا دبے قدموں آگے بڑھنے لگا۔ شام ہو چکی تھی اور برف باری کے آثار تھے۔
جب وہ چھوٹی بستی کے سرے پر پہنچا تو برف کے ننھے ننھے ذرات گرنے لگے لیکن وہ
ان سے بے پرواہ آگے بڑھتا رہا۔ بستی سنسان ہو چکی تھی لوگ اپنے عزیزوں کو دفنا
چکے تھے اور اب صبر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تاہم کبھی کبھی کسی مکان سے
گریہ زاری کی آواز آجاتی تھی۔ شیرزاد ان آوازوں سے بے نیاز آگے بڑھ رہا تھا
اور پھر وہ اس مکان کے سامنے پہنچ گیا جو اس کی منزل تھا۔ اس نے ایک درخت
کے نیچے گھوڑے کو کھڑا کیا۔ مکان کی ٹوٹی دیوار پھر بن گئی تھی اور اس کے سامنے
صفائی بھی ہو گئی تھی۔ وہ مکان کے چاروں طرف منڈلانے لگا اور پھر اس کی نگاہ

ایک کھڑکی پر پڑی۔ کھلی ہوئی کھڑکی کے دوسری طرف چراغ روشن تھا اور چراغ کی پیلی روشنی میں ایک چہرہ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں رکھا ہوا کھڑکی کے باہر کے منظر میں گم تھا۔ یہ چہرہ وہی تھا جو شیرزاد کی آنکھوں کے راستے دل میں اتر گیا تھا۔ وہ بے اختیار ہو گیا اور اس کے قدم کھڑکی کی طرف بڑھ گئے۔ پھر جب اس نے اپنا چہرہ کھڑکی کے سامنے کیا تو اندر موجود لڑکی کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ حیرت و خوف سے اسے دیکھ رہی تھی۔

تم.....تم.....شیرزاد؟" اس کے منہ سے نکلا۔ "میں نے وعدہ کیا تھا کہ میں پھر آؤں گا۔" شیرزاد نے کہا اور کھڑکی کے راستے اندر کود گیا۔ اب وہ ہر خطرے سے بے نیاز تھا اس نے لڑکی کے چہرے کو دیکھا وہ اس سے خوف زدہ نہیں تھی۔

"میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔" اس نے کہا اور شیرزاد کا دل دھڑک اٹھا۔

"سچ"

"ہاں"

"کیوں انتظار کر رہی تھیں؟"

"میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتی تھی اس کا جواب نہ تو بابا نے مجھے دیا اور نہ ماں نے!"

"کون سی بات؟"

"تم ڈاکو شیرزاد ہو نا؟"

"ہاں لیکن تم صرف شیرزاد کہو۔"

"نہیں تم ڈاکو ہو' مگر تم نے ہماری بستی کا لوٹا ہوا مال کیوں واپس کر دیا؟ میری سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آئی۔"

"میں نے سب کچھ تمہاری نظر کر دیا تھا۔ میں نے اس پوری بستی کی جان بخشی اس لئے کر دی تھی کہ یہاں تم رہتی ہو۔ میں نے پوری بستی کو تمہارے زموں پر جھکا دیا ہے۔"

"میرے لئے یہ سب کچھ کیوں کیا تم نے؟"

"اس لئے کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ ایسی محبت جیسی میں نے سی سے نہیں کی۔ میں محبت سے ناآشنا تھا۔ میں نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی' نی ماں اور اپنے باپ سے بھی نہیں' ان دوستوں سے بھی نہیں جن کے ساتھ میں پن میں کھیلا ہوں۔ لیکن میں نے تم سے محبت کی ہے۔ میرا دل تمہیں چاہنے لگا ہے میرے ایک اشارے پر ہر حسین لڑکی میری خلوت میں پہنچ جاتی ہے اور پھر جب میرے بستر کی زینت ہوتی ہے تو ان کی آنکھوں میں خوف' ہونٹوں پر سکوت ہوتا ہے۔ وہ میری دست درازی پر ذرا بھی مدافعت نہیں کرتیں اور خود کو میرے الے کر دیتی ہیں۔ لیکن تمہیں دیکھ کر میرے دل میں ایک انوکھی خواہش پیدا ہوئی ہے۔ ایک عجیب خواہش میں چاہتا ہوں کہ میری سیج پر مسکراہٹ ہو' ادائیں ہوں' ف نہ ہو' چاہت ہو' سکوت نہ ہو' قہقہے ہو' سپردگی نہ ہو' جھلاہٹ ہو' انکار ......اور میری اس خواہش نے مجھے دیوانہ کر دیا ہے۔"

"تو.....تو تم نے یہ سب کچھ میرے لئے کیا ہے؟" ماہ رخ نے اس سے چھا۔

"ہاں.......بولو.........کیا تم میری محبت کا جواب محبت سے دو گی۔ میں ہیں پوری زندگی کا ساتھی بنا لوں گا۔ میں......میں.........شیرزاد کا جملہ پورا نہ سکا اور ماہ رخ نے اس کے چہرے پر تھوک دیا۔

شیرزاد ششدر رہ گیا۔ کیسا انوکھا تجربہ تھا۔ کسی نے اس کے چہرے پر رت سے تھوک دیا ہے۔ کسی کی حسین آنکھوں میں اس کے لئے خوف نہیں نفرت

تھی اس نے چہرہ صاف نہ کیا اور شکست خوردہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

تو........تو تم نے میری محبت کو ٹھکرا دیا۔ تت تو تو تم نے......"

"نکل جاؤ اس کھڑکی سے........اپنے ساتھیوں کو لے کر آؤ اور مجھے اٹھ
کر لے جاؤ........میں تم سے نفرت کرتی ہوں......بے پناہ نفرت! تم درندے ہو
محبت انسانوں سے کی جاتی ہے' چلے جاؤ یہاں سے......جاؤ اپنی وحشت کو آوا
دو........محبت والے دل تو درد سے لبریز ہوتے ہیں' وحشت کے پتلے محبت کے
مفہوم سے بھی نا آشنا ہوتے ہیں۔ پہلے دل کو ٹٹولو' اس میں محبت پیدا کرو' تب کس
کی محبت پیدا کر سکو گے۔ نکل جاؤ یہاں سے ورنہ میں خودکشی کر لوں گی۔" ماہ ر
نے غیظ و غضب سے لرزتے ہوئے کہا۔

اور شیرزاد پتھر کے بت کی طرح ساکت اسے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھو
میں اس وقت غضب کی چنگاریاں نہیں' غم کے آثار تھے۔ پھر وہ خاموشی سے م
اور کھڑکی سے باہر نکل گیا۔

ماہ رخ اس کے گھوڑے کو دیکھتی رہی اور جب وہ برف کی دھند میں غائ
ہو گیا تو اس نے نفرت سے کھڑکی بند کر دی۔ کھڑکی بند کر کے جب وہ مڑی تو ش
زمان اور گل زمان اس کے سامنے کھڑے تھے۔

گل زمان فخر سے بیٹی کو دیکھ رہا تھا اور پھر اس نے آگے بڑھ کر اسے
سے لگا لیا۔ "تو نے باپ کی گردن فخر سے بلند کر دی ہے بیٹی لیکن اب ہم یہاں نہ
رہیں گے شاہ زمان ضروری سامان باندھ لو۔ ہم کہیں بھی چلے جائیں گے۔ ایسی ج
جہاں شیرزاد کو ہمارے بارے میں کچھ نہ معلوم ہو۔" اور شاہ زمان خاموشی سے
کمرے سے باہر نکل گیا۔

"بیس آدمیوں پر مشتمل قافلہ ہے۔ سردار' لڑکیاں بھی ہیں اور سا
بھی' نہ جانے کون بدنصیب ہیں۔ میرا خیال ہے کسی اور ملک سے تعلق رکھتے ہی

لڑکیاں بہت خوبصورت ہیں سردار' کیا حکم ہے؟" مخبر نے خوشی سے بھرپور لہجے میں
کہا اور شیرزاد کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

لیکن شیرزاد لمبے چاقو سے نوکدار لکڑی کو چھیلتا رہا۔ وہ ایک چٹان پر
اداس سا بیٹھا تھا۔ ایک طویل عرصے کے بعد کچھ یادیں اس کے ذہن کے پردے پر
ابھر آئی تھیں۔ ان میں سے ایک بوڑھا چہرہ تھا' عبادت اور پاکیزگی سے پرنور
چہرہ' جس پر سفید براق داڑھی لہرا رہی تھی اور نرم ہاتھ اس کے بالوں میں کنگھی کر
رہے تھے اور یہ چہرہ زور آور خان کا تھا۔ اس کے باپ کا چہرہ......ایک اور
چہرہ' محبت اور ممتا سے لبریز آنکھیں جو اس کی شکل سے روشنی حاصل کر رہی تھیں
یہ ماں کی آنکھیں تھیں...... نہ جانے اسے یہ بھولی بسری کہانی کیوں یاد آ گئی تھی
اور اس کہانی نے اس کو سینے کے اندر دل کا احساس دلایا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ
دل بھی کوئی چیز ہے۔ ایسے وقت میں اس آدمی کی مداخلت اسے ناگوار گزری۔

"کیا حکم ہے سردار؟" مخبر نے پھر پوچھا۔ بھاگ جاؤ........جو دل چاہے
کرو۔" اس نے مخبر کو جھڑک کیا اور وہ خوشی خوشی چلا گیا۔ آن کی آن میں درجنوں
گھوڑے پہاڑ سے نیچے اترنے لگے۔ وحشت اور بربریت کا بازار گرم کرنے کے
لئے۔ لیکن وہ ہر چیز سے بے نیاز تھا۔ تمام باتوں سے بے خبر تھا۔ وہ تو اس وقت
چونکا جب گولیوں کی آوازیں اور انسانی چیخیں اسے سنائی دیں۔ وہ طلسم سے نکل آیا
اور پھر اسے احساس ہوا کہ اس نے اپنے ساتھی سے کیا کہہ دیا تھا۔

وہ تیزی سے ایک بلند چٹان پر پہنچ گیا اور وہاں سے نیچے کا منظر دیکھنے لگا۔
اس کے ساتھی قافلے پر ٹوٹ پڑے تھے۔ مار رہے تھے' مر رہے تھے' ظلم و بربریت
کا بازار گرم تھا' چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔

اور پھر اس کے کانوں میں ایک آواز ابھری "محبت کرنے والے دل تو درد
سے لبریز ہوتے ہیں' پہلے اپنے دل کو ٹٹولو' اس میں محبت پیدا کرو' تب کسی کی محبت

حاصل کر سکو گے۔ اور پھر یہ آوازیں تیز ہو گئیں' یہ آوازیں چٹانوں سے نکل رہی تھیں' پہاڑوں سے نکل رہی تھیں اور اس کے کان پھٹے جا رہے تھے اس نے دونوں ہاتھوں سے کان بند کر لئے لیکن آواز تو اس کے دل سے نکل رہی تھی۔

تب اس نے کانوں سے ہاتھ ہٹا لئے اور خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ وہ غار میں داخل ہوا اور وہاں سے اس نے بھاری مشین گن اٹھا کر کندھے پر رکھ لی۔ کارتوسوں کی پوری پیٹی دونوں ہاتھوں سے سنبھالی اور غار سے نکل آیا۔ اس کے ساتھی قافلے پر قابو پا چکے تھے اور اب گرفتار شدگان کو رسی سے باندھ رہے تھے ان میں لڑکیاں بھی تھیں' مرد بھی تھے۔ شیرزاد نے ایک بلند چٹان پر مشین گن فٹ کر لی اور اس پر ریل چڑھانے لگا اس کی آنکھوں میں خون تھا اور پھر اس کے ساتھیوں نے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔

شیرزاد غور سے انہیں دیکھ رہا تھا اور پھر اس کے دانت بھینچ گئے' جبڑوں کے مسلز ابھر آئے اور مشین گن کا دہانہ کھل گیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو نشانہ بنا رہا تھا۔ وہ بلندی پر تھا اور اس کے ساتھی کوشش کے باوجود اس کے نشانے سے نہیں بچ سکے تھے اور اس ناگہانی مصیبت سے گھبرا گئے۔ وہ سمجھ بھی نہ سکے کہ یہ مصیبت ان پر کہاں سے نازل ہو رہی ہے اور اسی حیرت میں وہ سب شکار ہو گئے۔ بندھے ہوئے لوگ سہمے ہوئے اس آفت خداوندی کو دیکھ رہے تھے جو ان کے دشمنوں پر نازل ہوئی تھی۔ آن کی آن میں ایک ایک ڈاکو موت کی آغوش میں پہنچ گیا اور آخری آدمی کو قتل کرنے کے بعد شیرزاد چٹان کے عقب سے نکل آیا۔ وہ نیچے اترنے لگا اور اپنے ساتھیوں کی لاشوں کے درمیان میں سے گزر کر ان کے پاس پہنچ گیا جو اسیر تھے وہ سب دہشت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے اس نے لمبا چاقو سیدھا کیا اور ان کی رسیاں کاٹنے لگا پھر اس نے ان سب کو آزاد کر دیا اور بھاری لہجے میں بولا۔

"میں تمہارے ساتھیوں کی زندگیاں نہیں لوٹا سکتا' مجھے ان کی موت کا افسوس ہے۔ ان پہاڑوں کے سب سے بلند حصے میں ایک غار ہے اس سے اندر چلے جاؤ وہاں بے شمار خزانہ موجود ہے اتنا خزانہ تم نے خواب میں بھی نہیں دیکھا ہو گا وہ سب تمہارا ہے' جاؤ اسے حاصل کر لو۔" اس نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

وہ سب اسے حیرت سے دیکھتے رہ گئے تھے اور اس وقت تک دیکھتے رہے جب تک وہ گھوڑے پر بیٹھ کر ان کی نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اسے اپنے راستے کی مشکلات کا احساس تھا وہ جانتا تھا کہ ڈاکو شیرزاد کی حیثیت ختم ہو جانے کے بعد اس کے دشمن اس کے خون کے پیاسے ہو جائیں گے اسے کسی چٹان کی پشت پر پناہ نہ مل سکے گی۔ لیکن اب وہ تمام خطرات سے بے نیاز ہو جانا چاہتا تھا۔ وہ اپنی محبوبہ کو خوشخبری سنانا چاہتا کہ اب وہ انسان بن گیا ہے۔ اس نے شیرزاد کی حیثیت ختم کر دی ہے اور اب وہ اس کی آغوش میں زندگی بسر کرنے کا خواہش مند ہے۔ اسے یقین تھا کہ ماہ رخ اتنی بڑی قربانی پر اسے گلے لگا لے گی۔

وہ تصور میں اپنی محبوبہ سے ہم آغوش' گھوڑا دوڑا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بستی میں پہنچ گیا۔ وہ والہانہ انداز میں اپنی محبوبہ کے مکان کی طرف بڑھ گیا۔ راستے میں نظر آنے والے لوگ دہشت زدہ ہو کر بھاگ رہے تھے۔ گھروں کے دروازے بند ہو رہے تھے لیکن وہ سب باتوں سے بے نیاز تھا۔ اپنی محبوبہ کے مکان کے سامنے پہنچ کر وہ گھوڑے سے اتر گیا۔ اس بار وہ کھڑکی کے راستے نہیں' دروازے کے راستے اندر جانا چاہتا تھا۔

اور وہ دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اسے دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔

لیکن...... مکان سنسان پڑا تھا...... کوئی انسان موجود نہ تھا۔ وہ ایک

ایک کمرے کو دیکھتا پھرا۔ تمام ضروری سامان غائب تھا صرف فالتو سامان پڑا تھا۔ اس کا دل لرز گیا۔ وہ پاگلوں کی طرح ایک ایک کونے کو تلاش کرتا رہا۔ اس نے تمام فرنیچر توڑ پھوڑ دیا اور پھر وہ وحشت زدہ انداز میں باہر نکل آیا۔ باہر بھی ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔ سڑکیں گلیاں خالی ہو گئی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ ایک مکان کی طرف بڑھا اور اس کے دروازے پر دستک دی۔ سہمے ہوئے لوگوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور اس نے دروازے پر ایک زوردار لات رسید کر دی۔ اندر سے کئی سہمی سہمی چیخیں سنائی دیں اور وہ اندر داخل ہو گیا۔ سہمے ہوئے لوگ ایک دوسرے سے چپکے بیٹھے تھے۔

اس نے انہیں گھورا اور وہ لرزنے لگے پھر اس کے منہ سے شکست خوردہ آواز نکلی "میں تم لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا' میں تم سے ایک بات معلوم کرنا چاہتا ہوں' سامنے والے مکان کے لوگ کہاں گئے؟"

سہمے ہوئے لوگوں کے منہ سے آواز نہ نکل سکی تو اسے غصہ آ گیا" جواب دو' وہ کہاں گئے؟" وہ دھاڑا۔

" چلے گئے...... چلے گئے....... پہاڑوں کے اس طرف کسی دوسری بستی میں....... وہ مکان چھوڑ کر چلے گئے۔" ایک سہمی ہوئی آواز نے کہا۔

"کسی کو نہیں معلوم وہ کہاں گئے؟"

"نہیں۔"

اور اس کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے باہر نکل آیا اور پھر گھوڑے پر سوار ہو کر آگے بڑھ گیا۔ اس کا ذہن تاریک ہو گیا تھا۔ وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں تھا۔ اسے صرف ایک لگن تھی، وہ ماہ رخ کو تلاش کرے اور وہ اسے تلاش کرنے لگا۔ پہاڑوں میں' چٹانوں میں ساری رات' اور پھر دوسری صبح اس کا گھوڑا پہاڑوں میں بھٹکتے بھٹکتے بے دم ہو گیا اور پھر ایک جگہ گھوڑا گر پڑا۔

د لمبے گہری گہری سانسیں لیتا رہا اور پھر دم توڑ دیا۔

" ماہ رخ....... " اس کے حلق سے وحشت زدہ آواز نکلی اور پہاڑوں ں گم ہو گئی۔ اس نے گھوڑے پر ایک نگاہ ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔ سورج بلند ہوتا ا۔ شام ہوئی اور رات ہو گئی۔ وہ چلتا رہا' شرابیوں کے سے انداز میں اور پھر بے ا ہو کر ایک جگہ گر پڑا۔ اس کے پاؤں سوج گئے تھے' حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے' ک اور تھکن سے نڈھال وہ اسی جگہ پڑا رہا۔ پھر چاند نکل آیا اور وہ بے بسی ے چاند کو تکنے لگا اور نہ جانے کیوں چاند نے کچھ عجیب سی شکلیں اختیار کر لیں۔ ے پاکیزہ چہرہ' لوگ جس کے تقدس کی قسم کھاتے تھے' ممتا بھری آنکھیں .....اور پھر...... اس نے دیکھا کہ چاند سرخ ہو گیا' خون کی طرح سرخ' اس ے خون ٹپکنے لگا اور اس نے اپنی پیشانی پر اس خون کی نمی محسوس کی' اس کا ہاتھ انی کی طرف بڑھ گیا۔

اور اسی وقت اسے ایک پھنکار سنائی دی۔ ایک خوفناک پھنکار۔ وہ دہشت ہ ہو کر اٹھ گیا ایک سانپ کا پھن اس کی پیشانی پر لہرا رہا تھا جونہی وہ اٹھا سانپ اس کی پیشانی پر کاٹ لیا اور وہ درد سے تڑپ اٹھا۔ اس نے چھلانگ لگانے کی شش کی اور چھلانگ لگا کر جس جگہ وہ گرا وہاں دوسرا سانپ موجود تھا۔ یہ وں کا جوڑا تھا جو چاندنی رات میں کسی کی مداخلت برداشت نہ کر سکا۔

شیر زاد تڑپتا رہا۔ سانپوں کا زہر رگ رگ کے پورے جسم میں درد بن کر دوڑ رہا ۔ زبان سوکھ کر کانٹا بن گئی تھی۔ آنکھیں حلقوں سے ابلی پڑ رہی تھیں۔

" ماہ رخ....... " اس کے منہ سے آخری الفاظ نکلے اور اس کے ساتھ ناک کانوں اور منہ سے خون کی پھوار ابل پڑی۔ آنکھیں دہشت زدہ انداز میں ا رہ گئیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ان کے پاس صرف دو گھوڑے تھے۔ انھیں پر سامان بھی لدا ہوا تھا۔ قدم قدم پر شیرزاد کے آدمیوں سے مڈبھیڑ کا خطرہ تھا۔ اس لئے وہ بہت احتیاط سے سفر کر رہے تھے۔ ماہ رخ، باپ کے ساتھ گھوڑے پر تھی اور شاہ زمان مال کو سنبھالے ہوئے تھا۔ تیز دھوپ ہونے کی وجہ سے گھوڑے بری طرح ہانپ رہے تھے۔

"وہ چٹان محفوظ ہے، ہم اس کی چھاؤں میں کچھ دیر آرام کریں گے اور جب دھوپ کی تمازت ختم ہو جائے گی تو پھر سفر کریں گے۔" گل زمان نے بیٹے سے کہا اور وہ چٹان کی طرف بڑھ گئے۔

جونہی وہ چٹان کے قریب، پہنچے ٹھٹک گئے۔ سامنے ہی کسی انسان کی لاش پڑی تھی۔

"اوہ، لاش ہے، نہ جانے کون بے چارہ ہے، ممکن ہے شیرزاد ہی کا شکار ہ، اس کی نظروں میں انسانی زندگی کی کیا قیمت ہے۔" بوڑھے گل زمان نے لاش ک طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ دوسرے لوگ بھی اس کے ساتھ سہمے ہوئے سے لاش ک قریب پہنچ گئے۔

لیکن اس کی شکل دیکھ کر ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور ماہ ر کے منہ سے نکلا۔

"یہ...... یہ تو شیرزاد ہے؟...... ہاں دیکھو بابا...... ؟ یہ شیر ہی ہے۔" اس کا لہجہ خوشی سے بھرپور تھا۔

"ہاں، شیرزاد ہی ہے۔ اوہ...... شاید اسے سانپ نے ڈس لیا ہے۔"

"ایک موذی کا انجام دوسرے موذی کے ہاتھوں ہوگیا۔" ماہ رخ نے نفرت سے کہا اور شیرزاد کے مردہ چہرے پر تھوک دیا۔

بے شمار افراد الوداع کہنے آئے تھے اور انہوں نے ان کے لئے نیک خواہشات کا اظہار کیا تھا۔

لیکن وہ تردد ان کے دل سے دور نہیں ہوا تھا، انہوں نے پھر ایک گہری سانس لی اور ائیر ہوسٹس کی طرف دیکھنے لگے۔

"یس پلیز" ائیر ہوسٹس ان کی طرف جھک آئی۔

"ایک گلاس پانی" انہوں نے آہستہ سے کہا۔

اور ائیر ہوسٹس گردن جھکا کر چلی گئی۔ چند منٹ کے بعد اس نے ایک خوب صورت بلوریں گلاس میں پانی پیش کر دیا۔ اور ڈاکٹر فیاض نے پانی پینے کے بعد گلاس واپس کر دیا۔ پھر انہوں نے گردن جھٹکی اور اس تردد کی وجہ دریافت کرنے لگے۔

آخر کیا وجہ ہے؟ کیوں وہ اس کیفیت کا شکار ہیں؟ اس طرح تو بلاوجہ کی ایک کوفت رہے گی۔ انہوں نے اپنی کیفیت کا تجزیہ کرنا شروع کر دیا۔ لیکن کوئی ایسی گرہ سامنے نہ آئی، جس نے انہیں اس تردد میں مبتلا کیا تھا اور پھر انہوں نے ایک ہی اندازہ قائم کیا۔ یہ حد سے زیادہ بڑھی ہوئی خوشی کی وجہ ہے جس کا اظہار وہ کسی پر نہیں کر سکے۔ عالم خوشی میں انسان مختلف کیفیات کا شکار ہو جاتا ہے اور بہر حال یہ کیفیت ایسی نہیں ہے جس پر وہ قابو نہ پا سکیں۔ انہیں خود پر کنٹرول کرنا ہو گا ورنہ وہ اس کانفرنس میں شریک نہیں ہو سکیں گے اور نہ جانے ان کے بارے میں کیا کیا تاثر قائم کیا جائے گا۔ چنانچہ وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگے۔

پھر انہوں نے اپنے بریف کیس سے اپنی دوا نکالی جو ان کے پاس موجود تھی۔ یہ دوا وہ اکثر سکون کے لئے استعمال کرتے تھے۔ دوا کی دو گولیاں کھا کر وہ اپنی سیٹ کی پشت سے ٹک گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔ نجانے کتنے گھنٹے وہ مسلسل سوتے رہے، پھر ائیر ہوسٹس نے ہی انہیں جگایا تھا۔ جہاز ایک درمیانی ملک

میں اتر رہا تھا۔

اس ملک میں چند گھنٹے قیام کے بعد جہاز آگے بڑھ گیا لیکن اب ڈاکٹر فیاض خود کو پر سکون محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی اس کیفیت پر قابو پالیا تھا۔ بالاخر ان کا طویل سفر ختم ہو گیا۔ اس وقت اس ملک میں رات کے پونے بارہ بجے تھے۔ پورا ایئرپورٹ کہر میں ڈھکا ہوا تھا' تیز روشنیاں بھی کہر میں ڈوبی ہوئی ٹمٹما رہی تھیں۔ سردی کا احساس شدید تھا۔ ڈاکٹر فیاض نے اترنے سے قبل اوور کوٹ پہن لیا اور پھر فلیٹ میٹ ہیٹ سر پر جما کر وہ دوسرے مسافروں کے ساتھ جہاز کی سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگے۔

رن وے پر جہاز کے نزدیک ہی چند افراد' اس سردی کے باوجود ان کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ انہوں نے ان کا پر جوش استقبال کیا اور پھر اپنا تعارف کرانے لگے۔ ڈاکٹر فیاض خوش اخلاقی سے ان سے ملے اور پھر استقبال کرنے والے انہیں ایک خوبصورت لمبی کار میں لے کر چل پڑے۔ ڈاکٹر فیاض اب پوری طرح مطمئن تھے اور اپنی کچھ عرصہ قبل والی کیفیت پر مسکرا رہے تھے۔

لمبی کار سفر کرتی رہی اور ڈاکٹر کا استقبال کرنے والے ان کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگے۔ ڈاکٹر ان کی عقیدت پر ممنون تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک اعلی درجے کی خوبصورت کوٹھی کے آہنی گیٹ پر پہنچ گئے۔ یہ کوٹھی شہر سے باہر ایک پر فضا مقام پر تھی۔ اس کے اطراف کے مناظر گو صاف نظر نہیں آ رہے تھے لیکن اندازے سے بہت حسین معلوم ہوتے تھے۔ کار پورچ میں لگ گئی اور چند حسین لڑکیوں نے ڈاکٹر کو گل دستے پیش کئے۔

ڈاکٹر فیاض کے میزبان انہیں لئے ہوئے ایک خوبصورت کمرے میں پہنچ گئے۔ ایک بج چکا تھا۔ ان لوگوں نے ڈاکٹر سے آرام کرنے کے لئے کہا اور پھر

انہیں اسی کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے۔ ایک خوبصورت سی ملازمہ ڈاکٹر کے لئے مخصوص کر دی گئی تھی۔ ڈاکٹر فیاض نے لباس تبدیل کیا۔ اب ان کی بے چینی بالکل رفع ہو چکی تھی۔ گرم کمرے کے گرم بستر پر انہیں نیند آئی اور وہ اطمینان سے سو گئے۔

دوسرے دن کافی دن چڑھے جاگے۔ ملازمہ نے ضروری انتظامات کر لئے تھے۔ چنانچہ گرم پانی سے عمدہ غسل کے بعد وہ ترو تازہ ہو گئے۔ چند ڈاکٹران سے ملاقات کے لئے پہنچ گئے تھے۔ جنہوں نے ان کے ساتھ ناشتا کیا۔ کچھ اخباری نمائندے بھی موجود تھے۔ جنہوں نے ڈاکٹر کے تاثرات قلمبند کئے اور اس کے بعد افسر مہمان نوازی نے انہیں دن بھر کا پروگرام بتایا۔ اس پروگرام میں چند ثقافتی اداروں کی سیر اور چند ہسپتالوں کا معائنہ شامل تھا۔ کانفرنس کا انعقاد چوتھے دن تھا۔

ڈاکٹر فیاض نے بہترین دن گزارا' بہت سے لوگوں سے ملے۔ جدید ترین ہسپتال دیکھے۔ کچھ دماغی مریضوں کا معائنہ کر کے ان کے معالجوں کو مفید مشورے دیئے اور پھر رات کو کچھ ثقافتی پروگرام دیکھنے کے بعد وہ واپس اپنی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ اس گہما گہمی میں ان کا دل لگ گیا تھا اور اب وہ پوری دلجمعی سے کانفرنس میں شرکت کی تیاریاں کر رہے تھے۔

لباس تبدیل کرنے کے بعد وہ آرام کرنے لیٹ گئے اور حسب معمول آرام کی نیند سوئے۔ دوسرے دن کے لئے بھی مقامی لوگوں نے پروگرام ترتیب دیا تھا۔ اس دن وہ ان غیر ملکی ڈاکٹروں سے ملے' جو دوسرے ممالک سے کانفرنس میں شرکت کرنے آئے تھے۔ تمام ڈاکٹران سے بڑی عقیدت کے ساتھ ملے۔ اور پھر تیسرا دن بھی دلچسپ مصروفیات میں گزرا۔ چوتھے دن انہیں کانفرنس میں شریک ہونا تھا۔ چنانچہ اس رات وہ جلد واپس آ گئے۔ انہیں اپنے طور پر کچھ تیاریاں کرنا تھیں۔ رات کو گیارہ بجے تک وہ ان تیاریوں میں مصروف رہے۔ اور پھر آرام

کرنے کے لئے لیٹ گئے۔ وہ جلد سو جانا چاہتے تھے تاکہ دوسرے دن چاق و چوبند رہیں۔

بستر پر لیٹنے کے بعد انہیں عالیہ یاد آئی۔ عالیہ ان کی اکلوتی بچی تھی جو چھ سال کی عمر میں ماں سے محروم ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر فیاض اس کے باپ ہی نہیں بلکہ اس کے لئے ماں کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ یوں تو عالیہ کے لئے کئی عورتیں ملازم تھیں جو ہر طرح اس کا خیال رکھتیں۔ لیکن اس کے باوجود ڈاکٹر فیاض خود بھی عالیہ کی دیکھ بھال کرتے تاکہ اسے کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔

حالانکہ عمر زیادہ نہیں تھی، لیکن ان کے ذہن میں دوسری شادی کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ سوتیلی ماں کا وجود عالیہ کے لئے برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس طرح انہوں نے پوری زندگی تج دی اور اب عالیہ بائیس سال کی تھی۔ باپ پر جان چھڑکتی تھی۔ ان کی شکل دیکھ دیکھ کر جیتی تھی۔

اور جب ڈاکٹر کے لئے عالمی اعزاز تجویز ہوا تو عالیہ خوشی سے پھولی نہیں سمائی تھی۔ اس نے اپنے عزیز دوستوں کی شاندار دعوت کی تھی اور اس پارٹی میں ڈاکٹر کو بھی شریک کیا تھا۔ پھر اس نے باپ کو خوب صورت تحفہ پیش کیا۔ اور درحقیقت ڈاکٹر فیاض کے لئے بیٹی کا یہ تحفہ اس عالمی اعزاز سے برتر تھا جو انہیں ملنے والا تھا۔

انہوں نے مس عالیہ فیاض کا دلی شکریہ ادا کیا تھا اور یہ محفل قہقہوں پر ختم ہو گئی تھی۔

ڈاکٹر فیاض کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ان کا پروگرام ایک ہفتے کا تھا اور وہ ایک ہفتہ جلد از جلد گزار لینا چاہتے تھے۔ تاکہ اپنی بیٹی سے جا ملیں۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے طویل عرصہ سے بیٹی سے جدا ہوں اور انہیں یقین تھا کہ عالیہ بھی ایسا ہی محسوس کر رہی ہو گی۔

حالانکہ وہ ایک ماڈرن فیملی رکھتے تھے۔ بے جا پابندیاں انہیں پسند نہیں تھیں لیکن مشرقی انداز کے قائل ضرور تھے۔ شوکت خانہ کو رونق محفل بنانا انہیں پسند نہیں تھا ورنہ عالیہ کو ساتھ بھی لا سکتے تھے۔ عالیہ بھی ان کے جذبات کا احترام کرتی تھی۔ اور اس نے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔

ڈاکٹر فیاض نے گہری سانس لی اور کروٹ بدل کر سونے کی تیاریاں کرنے لگے۔ اور نہ جانے کب انہیں نیند آ گئی۔ اس وقت رات کا ایک بجا تھا، جب کسی کھٹکے سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہمیشہ کچی نیند سوتے تھے۔ چند لمحات تک ان کا ذہن سویا رہا اور پھر وہ بیدار ہو گئے۔

کوئی وجہ ضرور تھی جس کی وجہ سے آنکھ کھلی تھی؟ انہوں پلٹ کر دروازے کی طرف نگاہ ڈالی اور وجہ سامنے تھی۔ چار قوی ہیکل آدمی ان کے سامنے موجود تھے۔ سیاہ چست لباسوں میں ملبوس، ان کے چہرے سیاہ نقابوں سے ڈھکے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھوں میں سیاہ ہی رنگ کے پستول تھے۔ جن کی نالیں ڈاکٹر کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

ڈاکٹر فیاض کا منہ حیرت سے پھیل گیا۔

"اٹھو" ان میں سے ایک آدمی نے سخت لہجے میں کہا اور ڈاکٹر فیاض تھوک نگل کر رہ گئے۔ تب ایک سیاہ پوش نے دوسرے کو اشارہ کیا اور دوسرے سیاہ پوش نے ایک چھوٹا سا سانفن ڈاکٹر کے چہرے کے سامنے کر دیا۔ سانفن سے ایک پھوار سی نکلی اور ڈاکٹر کی ناک سے ٹکرائی۔ وہ اچھل پڑے تھے۔ لیکن پھر ان کے دماغ میں گنجان لہریئے رقص کرنے لگے۔ اور آہستہ آہستہ ان کا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

"اٹھاؤ" دوسرے سیاہ پوش نے پھر کہا اور دو آدمیوں نے پستول ہولسٹر میں لگا لئے اور پھر انہوں نے اطمینان سے ڈاکٹر کو اٹھایا اور باہر لے چلے۔

پوری کوٹھی سائیں سائیں کر رہی تھی۔ پورٹیکو میں ایک بند وین کھڑی ہوئی تھی۔ سیاہ پوش ڈاکٹر کو اٹھائے ہوئے وین کے قریب پہنچے اور پھر وین میں بیٹھے ہوئے دو آدمیوں نے انہیں ایک اسٹریچر پر ڈال کر اسٹریچر ہک پر رکھ دیا۔ چاروں سیاہ پوش وین میں آبیٹھے اور وین اسٹارٹ ہو کر چل پڑی۔

تاریک راستوں پر اس کا سفر کافی دیر تک جاری رہا اور پھر وہ ایک اور کوٹھی میں داخل ہو گئی۔ سفید رنگ کی یہ عمارت خاصی پراسرار لگ رہی تھی۔ وین اس کے پورٹیکو میں رک گئی اور اندر بیٹھے ہوئی لوگ پھرتی سے نیچے آئے اور پھر ڈاکٹر کا اسٹریچر اندر لے جایا گیا۔ کئی راہداریوں سے گزر کر وہ ایک ہال میں پہنچ گئے۔ ہال میں دن کا منظر تھا۔ چاروں طرف انتہائی طاقتور سرچ لائیٹیں لگی ہوئی تھیں۔ مختلف ساخت کی سائنسی مشینیں چاروں طرف نصب تھیں۔ ایک گوشے میں ایک سپئیر ٹیبل کے گرد پڑے ہوئے صوفوں پر کچھ لوگ سفید لباس میں ملبوس بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے کافی کی پیالیاں رکھی تھیں جواب خالی ہو چکی تھیں۔

آنے والوں کو دیکھ کر وہ کھڑے ہو گئے۔ سیاہ پوش کے ساتھیوں نے اسٹریچر ایک جگہ رکھ دیا اور خاموشی سے باہر نکل گئے۔ اب ہال میں سفید لباسوں والوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ سفید لباس والوں میں سے ایک نے ہال کا دروازہ بند کر دیا اور ان سب نے چہروں پر آپریشن ماسک پہن لئے اس کے بعد انہوں نے اسٹریچر ٹرالی دھکیلی اور ایک طرف لے جانے لگے۔ ہال کے ایک حصے میں پہنچ کر ان میں سے ایک نے دیوار پر لگا ہوا بٹن دبایا اور دیوار میں ایک چوکور دروازہ کھل گیا۔

ٹرالی کو لئے ہوئے وہ دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ دوسری طرف بھی ایک پوشیدہ کمرہ تھا۔ اس کمرے میں چھت پر ایک بہت بڑی سرچ لائٹ لگی ہوئی تھی، جس کے نیچے ایک جدید ترین آپریشن ٹیبل موجود تھی۔ آپریشن ٹیبل کے نزدیک تین نرسیں کھڑی ہوئی تھیں اور کمرے کے ایک کونے میں سفید رنگ کی میز پر ایک خوفناک گوریلا مردہ......یا بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ ڈاکٹر فیاض کو سرچ لائٹ کے نیچے آپریشن ٹیبل پر منتقل کر دیا گیا اور پھر سرچ لائٹ روشن ہو گئی۔ اس کی تیز روشنی ڈاکٹر کے جسم پر پڑ رہی تھی۔

"سب کچھ تیار ہے نرس؟" ایک ڈاکٹر نے پوچھا۔ "یس ڈاکٹر" نرس نے جواب دیا۔

"کیا خیال ہے ڈاکٹر کوہل۔ پہلے گوریلے کو دیکھیں؟"

"یہی ضروری ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر کے برین کو نکالنے کے بعد گوریلے کا آپریشن مناسب نہ ہو گا۔ اتنی دیر ڈاکٹر کا برین اسپس خالی نہیں رہنا چاہئے"

"بالکل ٹھیک، نرس اس ٹرالی کو یہاں سے ہٹا دو" اور تینوں نرسوں نے مل کر ڈاکٹر والی آپریشن ٹیبل دھکیل کر دوسری طرف سرکا دی اور پھر وہ گوریلے والی میز کو سرچ لائٹ کے نیچے لے آئیں۔ تب ڈاکٹروں نے دستانے پہنے اور پھر ایک ڈاکٹر نے ایک چوکور بکس اٹھا لیا۔ اس نے ایک پتلی سی ڈوری گوریلے کے سر پر باندھی اور بکس میں لگا ہوا ایک سوئچ آن کر دیا۔ گراریوں کے چلنے کی کراہٹ گونج اٹھی اور بکس سے ایک آری نکل آئی۔

"اوکے" ڈاکٹر نے کہا اور پھر اس نے آری گوریلے کے سر پر رکھ دی۔ جسے ایک چھوٹے سے اسٹینڈ پر اوپر اٹھا دیا گیا تھا۔ تیز کرکراہٹ کے ساتھ آری گوریلے کے سر کی ہڈی کاٹنے لگی۔ ڈاکٹر چابکدستی سے اپنا ہاتھ گھما رہا تھا اور چند ساعت کے اندر اس نے نہایت صفائی سے گوریلے کے سر کا اوپری خول علیحدہ کر دیا۔ اس کے بعد اس نے آری رکھ دی۔ نرس ایک بڑی ٹرے میں سرجری آلات سجائے کھڑی تھی۔ اس نے ایک باریک قینچی اٹھا کر ڈاکٹر کے سامنے کر دی اور ڈاکٹر قینچی لے کر گوریلے کے دماغ کی باریک نسیں کاٹنے لگا۔ نہائیت مشکل کام تھا لیکن...

ہوسیار ڈالٹر نے گوریلے کی ایک ایک جھلی کاٹ کر اپنا کام مکمل کر لیا۔ پھر اس نے آلات کی مدد سے گوریلے کا مغز اس کے سر نکال لیا اور اسی وقت ایک نرس ایک چھوٹی سی ٹرالی لے کر اس کے قریب پہنچ گئی۔ جس میں ایک طشت رکھا ہوا تھا۔ طشت میں بادامی رنگ کا سیال بھرا ہوا تھا۔ ایک سیال میں گوریلے کے مغز کو رکھ دیا گیا اور ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لی۔ اس نے چہرے سے ماسک ہٹا لیا اور نرسیں گوریلے کی میز کو دھکیل کر دور لے گئیں۔

"کیا آپ مجھے ایک سگریٹ پینے کی اجازت دیں گے ڈاکٹر کوہل؟" آپریشن کرنے والے ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے دوسرے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"ضرور ڈاکٹر" دوسرے ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر وہ خود بھی اس کے ساتھ کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"آپ لوگ تیاریاں کریں" اس نے چلتے ہوئے دوسرے لوگوں سے کہا اور پھر وہ دونوں باہر نکل آئے۔ رات خاموش تھی۔ وہ پر اسرار تاریکی میں کھڑے ہو کر سگریٹ کے گہرے گہرے کش لیتے رہے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے گفتگو نہیں کی تھی۔ پھر سگریٹ ختم کرنے کے بعد واپس ہال میں چل پڑے اور ہال سے گزر کر اس کمرے میں واپس آگئے۔

یہاں نرسیں اور دوسرے ڈاکٹر اپنا کام کر چکے تھے۔ ڈاکٹر فیاض کی میز آپریشن لائٹ کے نیچے تھی۔ اور دوسرے تمام لوازمات بھی تیار تھے۔ ایک مخصوص انجکشن کے ذریعہ ڈاکٹر کو ہوش میں لے آیا گیا تھا کیونکہ یہ ضروری تھا اور ڈاکٹر ان پر سوالات کی بھرمار کئے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں میز سے کسے ہوئے تھے جن کی وجہ سے وہ ہل بھی نہیں سکتا تھا۔

اس نے ان دونوں کو گردن گھما کر دیکھا اور دونوں ڈاکٹر مسکراتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گئے۔

"تم لوگ بھی نہیں بتاؤ گے، تم کون ہو اور کیا کرنا چاہتے ہو؟" ڈاکٹر فیاض ے متوحش لہجے میں پوچھا اور ڈاکٹر کوہل مسکراتا ہوا سامنے آگیا۔

"ڈاکٹر فیاض، بلاشبہ تم برین اسپیشلسٹ ہو، بلاشبہ تمہارے کارنامے اندار ہیں، لیکن ہمارے خیال میں جو عالمی اعزاز تمہیں ملنے والا ہے وہ تمہیں نہیں نا چاہئے۔ کیونکہ ایشیا ابھی اس قابل نہیں ہوا کہ یورپ پر سبقت لے جائے۔ ہم اعزاز تمہیں نہیں ملنے دیں گے، یہ ہماری توہین ہو گی۔"

"لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے؟ میں نے تو یہ اعزاز نہیں مانگا"

"تمہارا یہی قصور کیا کم ہے ڈاکٹر! کہ تم نے ایک ایشیائی ہوتے ہوئے رب پر سبقت لے جانے کی کوشش کی ہے۔ ہم لوگ کسی میدان میں تمہیں آگے یں دیکھنا چاہتے"

"یہ تمہاری کم ظرفی ہے ڈاکٹر! میں نے کسی کو نیچا دکھانے کے لئے کچھ یں کیا ہے جو کچھ کیا ہے انسانیت کی بھلائی کے لئے کیا ہے" ڈاکٹر فیاض نے ہونٹ وڑ کر کہا۔

"جو کچھ بھی کہہ لو ڈاکٹر بہر حال تم مغرب سے یہ اعزاز نہ لے جا سکو ے"

"میں ہر قسم کے اعزاز پر لعنت بھیجتا ہوں۔ مجھے جانے دو میں اپنے وطن پس جاؤں گا"

"یہ بھی اب ممکن نہیں ہے ڈاکٹر" کوہل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پھر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"ایک دلچسپ تماشہ" ڈاکٹر کوہل نے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کے لہجے اور ندگی پر ڈاکٹر فیاض کے جسم میں خوف کی لہریں دوڑنے لگیں۔

"کک..... کیسا تماشہ؟" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا

بدقسمتی سے وہ تماشہ تم نہ دیکھ سکو گے۔ ہاں وہ اخبارات تم تک ضرور
پہنچا دیئے جائیں گے' جن میں اس تماشے کی تفصیل ہو گی کیوں ڈاکٹر" کوبل نے
مسکراتے ہوئے دوسرے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

"ہاں بے چارے ڈاکٹر فیاض کو اس تفصیل سے تو محروم نہ رکھا جائے"

"اچھا ڈاکٹر تم سے دوبارہ ملاقات ہو گی۔ فی الحال رخصت۔" ڈاکٹر کوبل
نے کہا اور پھر ان دونوں نے چہروں پر ماسک لگا لئے۔

کوبل نے ایک نرس کے ہاتھ سے سرنج لے لی جس میں ایک سیال بھرا ہوا
تھا پھر اس نے سرنج کا سیال ڈاکٹر فیاض کے بازو میں اتار دیا اور ڈاکٹر کا جسم ساکت
ہو گیا۔ اس کا ذہن جاگ رہا تھا۔ لیکن وہ بے حس و حرکت تھا۔ اس کے حواس
تحریک کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ تب دوسرے ڈاکٹر نے آری لی اور پھر آری ایک
تیز کرکراہٹ کے ساتھ چل پڑی۔ اور ڈاکٹر کی پیشانی سے خون رسنے لگا۔ اس ک
سر کی ہڈی کٹتی جا رہی تھی یہاں تک کہ اس کا پورا کاسہ سر علیحدہ ہو گیا۔ اور ڈاک
اس کی باریک نسیں کاٹنے لگا۔ کام انتہائی ہوشیاری سے جاری تھا۔ ڈاکٹر کے ہاتھوا
کی پھرتی قابل دید تھی۔ پھر اس نے ڈاکٹر فیاض کا قیمتی دماغ نکال لیا اور اسے بھ
ایسے ہی سیال میں ڈال دیا جس میں گوریلے کا دماغ پڑا ہوا تھا۔ پھر اس نے نرس
اشارہ کیا اور نرس وہ ٹرالی لے آئی جس مین گوریلے کا دماغ رکھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر۔
آلات کی مدد سے گوریلے کا دماغ ڈاکٹر کے سر میں رکھ دیا۔ پھر وہ ایک خاص سیا
کی مدد سے ڈاکٹر کے سر کی نسوں کو گوریلے کے دماغ کی نسوں سے جوڑنے لگا
انتہائی مشکل اور مہارت کا کام تھا جسے ڈاکٹر پورے اعتماد کے ساتھ کر رہا تھا۔

تمام لوگ سانس روکے کھڑے تھے یہاں تک کہ آخری نس بھی پیوست
گئی اور پھر ڈاکٹر نے سر کا پیالہ دوبارہ ڈاکٹر فیاض کے سر پر رکھ دیا۔ اس دورا
نرس ایک ٹرالی دھکیل لائی۔ جس پر ایک عجیب ساخت کی مشین رکھی ہوئی تھ

اکٹر نے ایک کپڑے سے ہاتھ صاف کئے اور پھر مشین سے ایک پائپ نکال لیا۔
س نے مشین کا بٹن آن کیا اور پائپ سے ایک غیر محسوس سا دھواں خارج ہونے
گا۔ ڈاکٹر پائپ کے سرے کو ڈاکٹر فیاض کے سر کے جوڑ پر گھمانے لگا اور جوڑ کا
ون غیر معمولی طریقے سے خشک ہونے لگا۔ چند لمحات کے بعد ایک خفیف سا نشان
بھی نہیں رہا تھا اور ڈاکٹر کے سر کا پیالہ مضبوطی کے ساتھ جڑ چکا تھا۔

"ڈاکٹر کوبل پلیز" اس نے ڈاکٹر کوبل سے کہا اور ڈاکٹر نے نرسوں کو
اشارہ کیا۔ نرسیں اس ٹرالی کو دھکیل کر لے گئیں اور پھر ڈاکٹر کوبل نے ایک اور
مشین میں لگی ہوئی نلکیاں ڈاکٹر فیاض کی نسوں میں پیوست کر دیں۔ نلکیوں کے
ذریعہ ایک چمکدار سرخ خون ڈاکٹر فیاض کے دماغ میں منتقل ہونے لگا یہ خاص قسم کا
خون تھا جو دماغ کو فوری تقویت بخشنے کے لئے تھا اور جس سے آپریشن کا احساس بھی
چند ساعت کے بعد فنا ہو جاتا تھا۔

اس کام سے فارغ ہو کر ڈاکٹر کوبل پھر اس دوسرے ڈاکٹر کے پاس پہنچ گیا
جو صوفے پر آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔

"کیا آپ تیار ہیں ڈاکٹر؟"

"ہاں وقت کم ہے اور کام زیادہ" ڈاکٹر مستعدی سے کھڑا ہو گیا۔ اس
دوران گوریلے والی ٹرالی آپریشن لائٹ کے نیچے لے آئی گئی تھی اور ڈاکٹر دوبارہ
اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر فیاض کا دماغ گوریلے کے
جسم میں منتقل ہو گیا تھا۔

عظیم الشان عمارت پر بہت سے ممالک کے پرچم لہرا رہے تھے۔ عمارت کے
سامنے خوبصورت وردی میں ملبوس بہت سے خصوصی پولیس کے جوان پہرہ دے
رہے تھے۔ اخباری نمائندوں کی جماعت سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ کانفرنس کے
خاتمے کے بعد ڈاکٹروں سے سوالات کرے۔ البتہ اسے کانفرس میں شریک ہونے

سے نہیں روکا گیا تھا۔ چنانچہ پریس گیلری کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ ملک ملک کے ڈاکٹر اپنی سیٹوں پر پہنچ چکے تھے۔ ان کی سیٹوں کے سامنے ان کے ملک کا چھوٹا سا پرچم اور اس ملک کا نام تحریر تھا۔ تقریباً تمام سیٹیں پر تھیں۔ صرف چند مقامی ڈاکٹر نہیں آئے تھے۔ لیکن ان کے بارے میں اطلاع ملی تھی کہ وہ کانفرنس چیمبر سے ملحقہ روم میں موجود ہیں۔

ڈاکٹر فیاض بھی نہیں آئے تھے جو آج کی اس کانفرنس کے ہیرو تھے۔ لوگ بے چینی سے ان کے منتظر تھے۔ پھر مقامی ڈاکٹر بھی کانفرنس ہال میں آ گئے اور ایک میزبان ڈاکٹر افتتاحی تقریر شروع کی۔ اس نے کہا۔

"معزز مہمانوں کی آمد پر' میں اپنے ملک کی طرف سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں خاص طور پر ایشیا کے مایہ ناز ڈاکٹر فیاض جالی کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اس سال دماغ کی دنیا میں حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے ہیں۔ بلاشبہ ہم ان کے ہم پیشہ ہونے کی حیثیت سے ان پر فخر کر سکتے ہیں۔ اور سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ پسماندہ ایشیا میں ایسی عظیم شخصیت نے جنم لیا۔ ہم بھی ایشیائی بھائیوں کی ترقی کے خواہش مند ہیں' ہم انہیں ہر میدان میں آگے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر انسانیت کی بھلائی کے لئے پیدا ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں جو بھی جہاں بھی جو کچھ بھی کرے۔ وہ پوری ڈاکٹر برادری کے لئے کار آمد ہوتا ہے۔ ہم اپنے معزز مہمان سے بہت کچھ سیکھنے کے خواہشمند ہیں اور انہیں اس سال کے سب سے بڑے ڈاکٹری اعزاز ملنے پر مبارک باد پیش کرتے ہیں"

افتتاحی تقریر کے خاتمے پر تالیاں گونج اٹھیں لیکن لوگوں کی نگاہیں ڈاکٹر فیاض کو تلاش کر رہی تھیں۔ اسی وقت کانفرنس ہال کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر فیاض چند لوگوں کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ اخباری نمائندوں نے دھڑا دھڑ تصویریں بنانا شروع کر دیں۔ لیکن ڈاکٹر فیاض کی کوئی تصویر سامنے سے نہیں لی جا سکی۔ و

ساتھ آنے والوں میں گھرے ہوئے تھے اور اگر نہ گھرے ہوتے تم ان کے چہرے کی وحشت صاف نظر آ جاتی۔ لوگوں میں گھرے ہوئے وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں ان کی سیٹ تھی اور پھر انہیں لانے والے منتشر ہو گئے۔

"میں ڈاکٹر فیاض سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ مہمانوں کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔" مقامی ڈاکٹر نے کہا اور لوگوں کی نگاہیں ڈاکٹر فیاض کی طرف اٹھ گئیں۔ جن کی آنکھیں انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں اور جن کے چہرے سے وحشت عیاں تھی۔

"ڈاکٹر فیاض پلیز" میزبان ڈاکٹر نے پھر درخواست کی لیکن ڈاکٹر فیاض وحشت زدہ نگاہوں سے ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ لوگوں کے کے چہروں سے حیرت عیاں ہونے لگی۔ میزبان بھی حیران نظر آ رہا تھا۔

"سب لوگ آپ کے منتظر ہیں ڈاکٹر" میزبان نے کہا ڈاکٹر فیاض کے منہ سے ایک عجیب سی آواز نکلی۔ وہ اچھل کر کھڑے ہوئے اور پھر انہوں نے میزبان کا گریبان پکڑ لیا۔ دوسرے لمحے ایک زور دار جھٹکے سے انہوں نے میزبان ڈاکٹر کی قمیض پھاڑ دی اور تمام لوگ بوکھلا کر کھڑے ہو گئے۔

میزبان ڈاکٹر کی آنکھیں شدید حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

ڈاکٹر فیاض اپنی سیٹ کے پیچھے سے نکل کر آئے تھے اور وہ مائیک کے سامنے کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں سے سینہ پیٹ رہے تھے۔ پھر وہ بے ہنگم انداز میں اچھلنے کودنے لگے۔ اور فوٹو گرافروں نے ان کی تصویریں کھینچنا شروع کر دیں۔

میزبان اور مہمان ڈاکٹر ششدر کھڑے ہوئے تھے۔ پھر میزبان ڈاکٹر آگے بڑھے اور انہوں نے جھک کر کہا۔

"ڈاکٹر فیاض پلیز کیا آپ کچھ طبیعت خراب محسوس کر رہے ہیں؟"

اور جواب میں ڈاکٹر فیاض نے میزبان کی گردن پکڑ لی اور اسے سر سے

اوپر اٹھانے کی کوشش کرنے لگے، مہمان چیخ پڑے تھے۔ اسی وقت چند سیکورٹی گارڈز اندر آ گئے۔ اور انہوں نے ڈاکٹر فیاض کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ڈاکٹر فیاض بمشکل ان کے قابو میں آ سکے تھے۔ اور سیکورٹی گارڈز انہیں ملحقہ روم میں لے گئے۔

ہم معزز مہمانوں سے معذرت خواہ ہیں۔ نہ جانے ڈاکٹر فیاض کو کیا ہو گیا ہے۔ صبح وہ ٹھیک تھے ہم نے ان سے فون پر بات چیت کی تھی۔ ہم کوشش کریں گے کہ ڈاکٹر کی حالت نارمل ہو جائے۔ براہ کرم چند مہمان میرے ساتھ آئیں۔"

اور بہت سے لوگ میزبان ڈاکٹر کے ساتھ اندر داخل ہو گئے۔

لیکن اندر ڈاکٹر فیاض کی کیفیت پہلے سے بھی خراب تھی۔ انہوں نے ایک سیکورٹی گارڈ کو زخمی کر دیا تھا اور ہر ایک کی طرف پھاڑ کھانے کو دوڑ رہے تھے۔ ڈاکٹر حیران کھڑے انہیں دیکھ رہے تھے تب میزبان ڈاکٹروں میں سے ایک نے کہا کہ

"اب کیا کیا جائے؟ ایسی صورت میں تو اعزاز کا اعلان بھی نہیں کیا سکتا"

"یقیناً" ایک مہمان ڈاکٹر نے تائید کی اور ڈاکٹر کمرے سے نکل آئے

اخباری نمائندوں میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ سب حالات جاننے کے لئے بے چین تھے

چنانچہ میزبان ڈاکٹر نے کہا

"مجھے افسوس ہے کہ ڈاکٹر فیاض شدید خوشی کے عالم میں ذہنی توازن بیٹھے ہیں۔ ہم انہیں صحیح پوزیشن میں لانے کی سرتوڑ کوشش کریں گے اس ساتھ ہی یہ تقریب منسوخ کر دی گئی ہے"

اخباری نمائندوں نے بہت سے سوالات کئے۔ لیکن ان کے جواب میزبان ڈاکٹروں نے معذوری کا اظہار کیا اور کہا:

"ہم سب سخت پریشان ہیں براہ کرم ہماری پریشانیوں میں اضافہ نہ کریں"

اور اس طرح یہ تقریب سنسنی خیز اختتام کو پہنچی۔ دوسرے روز اخبارات سرخیوں نے تہلکہ مچا دیا تھا۔ ڈاکٹر فیاض کے سفارتخانے کے ذریعہ ان کے ملک اس سانحہ کی اطلاع دی گئی۔

سب حیران تھے کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ڈاکٹر فیاض کو اسپتال نچا دیا گیا۔ جہاں مقامی ڈاکٹران کی دیکھ بھال کرنے لگے۔ چند غیر ملکی ڈاکٹروں نے ی اپنی خدمات پیش کر دیں لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ پھر ڈاکٹر فیاض کے ملک ے ایک خصوصی ٹیم اس سلسلہ کی تحقیقات کرنے پہنچی۔ میزبان ملک نے ان کے اتھ بھرپور تعاون کیا تھا۔ باہر سے آنے والوں کے بھی بیانات لئے گئے۔ سب نے ی بتایا کہ ڈاکٹر پچھلی رات کو ٹھیک تھے نہ جانے ایک دم انہیں کیا ہو گیا۔

بہرحال پوری دنیا کو ایک مایہ ناز ڈاکٹر سے محروم ہو جانا پڑا تھا۔ مہمان رخصت ہونے لگے۔ میزبان ملک نے پیشکش کی تھی کہ وہ ڈاکٹر کے دماغ کا اپریشن کرنا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے کچھ کار آمد نتائج بر آمد ہوں۔

اجازت دے دی گئی اور ڈاکٹر فیاض کے دماغ کے تین اپریشن کئے گئے۔

یکن نتیجہ صفر رہا تب میزبان بھی مایوس ہو گئے۔

اور اس واقعے کے پورے ایک ماہ بعد غمزدہ عالیہ فیاض، ڈاکٹر کو ایک خصوصی طیارے سے لے کر اپنے وطن واپس آ گئی۔ ڈاکٹر اسے بھی نہیں پہچان سکے تھے۔ وہ انسانوں کی سی ایک بات بھی نہ کرتے۔ عالیہ کو بھی انہوں نے دو دفعہ نقصان پہنچایا اور اس طرح انہیں انہی کی کوٹھی کے ایک مخصوص حصے میں قید کر دیا گیا

عالیہ کی دنیا تاریک ہو گئی۔ شفیق باپ کو کھو بیٹھی تھی۔ معمولی بات نہیں تھی۔ ملکی طور پر اس سلسلہ میں خاصی تگ و دو کی گئی اور پھر ڈاکٹر کو ناقابل علاج

قرار دے دیا گیا۔ ایک ہی بات سامنے آئی تھی وہ یہ کہ ڈاکٹر شدید خوشی کے عا
میں ذہنی توازن کھو بیٹھے ہیں اور اب یہی توقع کی جا سکتی تھی کہ کوئی اور ذہنی جھ
ان کے حواس درست کر سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆ دور کہیں پانی گرنے کی پر شور آواز سنائی د
رہی تھی جو ذہن کو ناگوار محسوس ہوتی تھی۔ ڈاکٹر فیاض کی آنکھ کھلی تو ذہن
عجیب سناٹا محسوس ہوا۔ لیکن پھر اس سناٹے کو چیرنے والی آواز ان کے کانوں ت
پہنچنے لگی اور ان کے حواس جاگنے لگے۔ آنکھوں کے سامنے گنجان لہریئے رقص
تھے اور سر چکرا رہا تھا۔

انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور حواس درست کرنے کی کوشش کرنے
لگے۔ جب قدرے حواس بہتر ہوئے تو انہوں نے حالات پر غور کیا اور آہستہ آہستہ
انہیں سب کچھ یاد آنے لگا انہیں غاصب یاد آئے جو انہیں اعزاز سے محروم رکھ
چاہتے تھے۔ انہیں وہ اپریشن روم یاد آیا جہاں انہیں اغواء کر کے لایا گیا تھا اور و
اچھل پڑے۔

کیا وہ ان کے چنگل سے بچ گئے؟ انہوں نے سوچا لیکن کس طرح؟ کیا
پہنچ گیا تھا وہاں؟ اور اب وہ اب کہاں ہیں؟ کیا انہی کی قید میں۔ انہوں نے متوح
نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ عجیب سا کمرہ تھا۔ بالکل کسی پرانے قلعے کی مانند
دیواریں سخت کنکریٹ کی بنی ہوئی تھیں۔ کسی قدر بلندی پر ایک روشندان تھا ج
سے دھوپ کا ایک سفید دھبہ اندر رینگ آیا تھا۔ دیواروں پر سیاہ رنگ کی کاہی
ہوئی تھی۔

اگر وہ اپنوں میں ہوتے تو اس خطرناک جگہ پر نہ ہوتے۔ انہوں نے ا
کمرے کا دروازہ تلاش کیا اور دروازہ انہیں نظر آگیا۔ پتھر کے ٹکڑوں سے ترا
ہوئے کواڑ تھے جو یقیناً باہر سے بند ہوں گے۔

انہوں نے ایک گہری سانس لی یقیناً وہ ان لوگوں کی قید میں تھے۔ لیکن وہ
ن سے کیا چاہتے تھے اس طرح؟..... انہوں نے ہاتھ اٹھا کر گردن کھجائی۔ اور اس
ت انہوں نے اپنی کلائی کو غور سے دیکھا اور ان کے جسم پر چیونٹیاں رینگنے لگیں۔
ن کی کلائی پر لمبے لمبے بال تھے تب انہیں ایک ناگوار سی بو محسوس ہوئی۔ اور یہ بو
نہیں کے نتھنوں سے آرہی تھی۔ انہوں نے وحشت زدہ نگاہوں سے اپنے جسم کو
یکھا اور ان کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔

یہ ان کا جسم تو نہ تھا یہ تو کسی گوریلے کا جسم تھا یہ تو..... آہ یہ کیا ہوا..... یہ
یا ہوا؟ وہ وحشت بھری آواز میں چیخے لیکن ان کے حلق سے ایک بھیانک چنگھاڑ
ل کر رہ گئی۔ یہ ان کی آواز نہیں تھی۔

آہ۔ ظالمو یہ تم نے کیا کیا۔ مجھے اعزاز کی ضرورت نہیں تھی۔ میں تو
مرف اپنے ملک کی سربلندی کے لیے یہاں آگیا تھا۔ ورنہ مجھے تو میری چھوٹی سی
نیا ہی پسند تھی۔ یہ اعزاز دیا ہے تم نے انسانیت کی بھلائی کے لیے کام کرنے کا؟ یہ
ملہ دیا ہے تم نے مجھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ انہیں سفید فام ڈاکٹر
کے الفاظ یاد آگئے جو نہیں چاہتا تھا کہ یہ اعزاز نہیں ملے۔ وہ بلک بلک کر روتے
رہے۔ ان کا سینہ شدت غم سے پھٹا جارہا تھا۔ انہیں عالیہ یاد آرہی تھی جو ان کی
منتظر ہوگی۔ عالیہ ان کی اکلوتی بچی۔ کیا حال ہوگا اس کا جب وہ اس سے نہیں ملیں
گے۔ انہیں وہ کیفیت یاد آئی۔ جب وہ اپنے ملک سے روانہ ہو رہے تھے۔ ان کا
دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ سفر کریں لیکن وہ اپنے ملک کے لئے اعزاز لینے جا رہے
تھے۔ اس موقع پر وہ کسی کوتاہی کمزوری کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن ان کا دل
کہہ رہا تھا کہ:

یہ عالیہ سے آخری ملاقات ہے۔ یہ سفر ان کے لئے منحوس ہے۔ کاش دل
کی بات ہی مان لی جاتی۔ وہ ایک دیوار کے سہارے بیٹھے روتے رہے۔

اور نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ پھر اچانک انہیں بائیں سمت ایک چوکو
کھڑکی کھلتی نظر آئی اور وہ چونک پڑے۔ کھڑکی سے ایک بڑی ٹرے اندر آ گئی
جس پر کھانے کا سامان سجا ہوا تھا۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے نہ اٹھے۔ ان کا دل ک
کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ کیسے غم کی بات تھی ایک ذہین ترین انسان اور جانور کے
جسم میں۔ وہ جس نے انسانیت کی بھلائی کے لئے زندگی وقف کر دی تھی او
انسانوں نے اس کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا۔ کھانے کی ٹرے کئی گھنٹے رکھی رہی ا
ہٹالی گئی۔

پورے دو دن تک انہوں نے کچھ نہیں کھایا۔ ان کا ذہن ناکارہ ہوتا جا
تھا۔ وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ بھوک پیاس نے ان کے قو
مضمحل کر دیئے تھے۔ اب وہ کھڑے بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ کھانے کی ٹرے ا
مخصوص وقت پر اسی خانے میں رکھی نظر آتی اور پھر چند گھنٹوں کے بعد ہٹالی جا
آج تیسرا دن تھا۔ ڈاکٹر فیاض کی حالت بہت خراب تھی۔ وہ سکتے کے عالم میں
اور موت کا انتظار کر رہے تھے۔ آنکھوں کے سامنے عالیہ کی سوگوار صورت تھ
اس کے سفید ہاتھ الوداعی انداز میں ہلتے نظر آ رہے تھے۔ اور ان کی آنکھوں
آنسو بہہ رہے تھے۔

دفعتاً" پتھروں کی جڑی ہوئی سلیں اپنی جگہ سے کھسکنے لگیں۔ یہ درواز
جو کھل رہا تھا۔ لیکن فیاض اپنی جگہ سے بھی نہ ہل سکے۔ وہ خاموشی سے پڑے
ہوئے دروازے کو دیکھ رہے تھے۔ پھر دروازہ پوری طرح سے کھل گیا اور
چار آدمی اند آ گئے۔ ان سب کے ہاتھوں میں اسٹین گنیں تھیں۔ وہ چاروں ا
گنیں ان کی طرف تان کر کھڑے ہو گئے۔ تب تین آدمی اور اندر آ گئے۔ ان
جسموں پر اعلی تراش کے سوٹ تھے۔
اور ڈاکٹر فیاض ان میں سے ایک کو پہچان گئے۔ یہ ڈاکٹر کوہل تھا جس

ے آپریشن میں حصہ لیا تھا۔ وہ تینوں ڈاکٹر فیاض کو دیکھتے رہے۔ ڈاکٹر فیاض
وشی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔
''ہم آپ سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں ڈاکٹر فیاض'' کوہل کے ساتھی ڈاکٹر نے
۔ ''آپ بول تو نہیں سکتے لیکن میرا خیال ہے لکھ تو بخوبی سکتے ہوں گے۔ اگر پسند
یں تو لکھ کر گفتگو کریں''
اس نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا اور اس نے ایک پیڈ اور قلم ڈاکٹر فیاض
سامنے رکھ دیا۔ ڈاکٹر فیاض نے اپنے بھدے ہاتھ میں بمشکل قلم پکڑا اور پھر پیڈ
یڑھے میڑھے الفاظ میں لکھا
''اب کیا گفتگو کرنا چاہتے ہو؟''
کوہل نے یہ تحریر پڑھی اور بولا:۔
''آپ نے حالات کا بخوبی اندازہ لگا لیا ہو گا ڈاکٹر فیاض۔ اب آپ ہمارے
ے میں ہیں۔ آپ کی دیوانگی کی تحقیقات ہو رہی ہیں۔ لیکن ہمارا پروگرام مکمل
۔ اس میں کوئی جھول نہیں ہے۔ کوئی ہمارے اوپر شبہ نہیں کر سکتا۔ پھر ایک نہ
دن یہ معاملہ دب جائے گا۔ لوگ آپ کو بھول جائیں گے۔ اس وقت ہم آپ
ے ایک سمجھوتہ کر سکتے ہیں''
ڈاکٹر فیاض نے سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا اور ڈاکٹر مسکراتے ہوئے
لا:۔

''ہم آپ کا ایک اور آپریشن کریں گے اور آپ کا ذہن ایک ایسے انسان
ے ذہن سے بدل دیں گے جو ہمارا اپنا آدمی ہو گا۔ اس کے بعد آپ سے کام لیں
ے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ آپ ہمارے وفادار ہوں گے۔ اور اگر آپ نے
ارے ساتھ تعاون کیا تو آپ کی لڑکی کو بھی آپ سے ملا دیا جائے گا۔ ورنہ دوسری
ورت میں ہم آپ کو ہر وہ تکلیف پہنچائیں گے جو پہنچا سکتے ہیں۔ اگر آپ ہم سے

تعاون کریں گے تو آپ کی لڑکی کو زندگی دی جاسکتی ہے۔"

"میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا گیا ہے؟" ڈاکٹر فیاض نے لکھا۔

"اس کی وجہ آپ کو بتائی جا چکی ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ آپ مغر
ڈاکٹروں پر سبقت لے جائیں۔"

"تب مجھے میرا جسم واپس کر دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی بیٹی کو لے کر
گمنامی کی زندگی میں چلا جاؤں گا اور پھر کبھی انسانیت کی بھلائی کے لئے کوئی اقدا
نہیں کروں گا۔" ڈاکٹر نے لکھا۔

"یہ اب ممکن نہیں ہے۔ ڈاکٹر جو ہم کہہ رہے ہیں وہی کیا جائے۔ اگ
آپ نے اس کے خلاف کیا تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ خاموشی سے ا
ویرانے میں مرجائیں گے اور ہم آپکی لاش نہایت احترام سے دفن کر دیں گے او
سب کچھ بھول جائیں گے۔"

ڈاکٹر فیاض سوچنے لگے۔

بے شک وہ مکار دشمن کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے۔ انہوں نے آ
تک کسی انسان کو دکھ نہیں پہنچایا تھا۔ وہ ہمیشہ انسانیت کی بھلائی کے لئے سرگرد
رہے تھے لیکن انہیں احساس ہو رہا تھا کہ وہ دنیا سے پیچھے رہے ہیں۔ اس دور
لوگ ظالم ہیں' سفاک ہیں۔ انہیں صرف خود سے غرض ہے وہ اپنے وقار کے
سب کچھ کرتے ہیں۔

تو پھر...... اس دنیا میں زندہ رہنے کے لئے کیوں نہ ان جیسا بنا جا
مکاری کے جواب میں مکاری سے کیوں نہ کام لیا جائے اور انہوں نے فیصلہ کرلی
وہ مکاری سے کام لیں گے چنانچہ انہوں نے قلم لے کر لکھا:

"مجھے سوچنے کی مہلت دو۔"

"ضرور...... میرا خیال ہے آپ عقلمند انسان ہیں اور سوچ سمجھ کر فی

یں گے۔ ہم اب آپ کے جواب کا انتظار کریں گے۔ جواب کے لئے عرصہ کا
ن آپ کی مرضی پر ہے۔ یہ پیڈ اور قلم آپ کے پاس موجود ہے آپ ہمیں جب
ہیں' جواب لکھ دیں اور ہاں زندہ رہنے کے لئے خوراک ضروری ہے۔ آپ کو
پ کی پسند کی خوراک مہیا کی جائے گی۔"

ڈاکٹر فیاض خاموش رہے اور وہ لوگ مسکراتے ہوئے باہر نکل گئے۔
وازہ بند ہوگیا اور ڈاکٹر فیاض اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ وہ کچھ فیصلے کر چکے تھے۔
ر اب ہوشیاری سے ان فیصلوں پر عمل کرنا چاہتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد لذیذ
انوں کی ٹرے پھر اس خانے کے اندر آگئی۔ انہوں نے ٹرے اٹھالی اور کھانے
ں مصروف ہوگئے۔

تین دن کے بعد کھانا ملا تھا۔ پانی کی بوتل سے پانی پینے کے بعد وہ آرام
رنے لیٹ گئے۔ جسم بے جان ہوگیا تھا کئی گھنٹے تک وہ خاموش پڑے رہے۔ پھر
ب چائے کی ٹرے آئی تب ہی وہ اٹھے تھے۔

اس دن کے بعد وہ باقاعدگی سے روزمرہ کی مصروفیات میں مصروف ہو
ئے۔ کسی خاص چیز کی ضرورت ہوتی' تو وہ پرچہ لکھ کر ٹرے میں رکھ دیتے اور ان
ی ضرورت پوری ہو جاتی تھی۔

چالاک دشمنوں کو زیر کرنے کے لئے اس سے زیادہ چالاکی کرنا ہوتی ہے۔
لد بازی ہمیشہ کام بگاڑ دیتی ہے۔ ڈاکٹر فیاض کو ان باتوں کا پورا پورا احساس تھا۔
نانچہ وہ خاموشی سے وقت کے منتظر تھے۔ وہ ان لوگوں کو اپنے بے قرار ہونے کا
قین نہیں دلانا چاہتے تھے۔ حالانکہ عالیہ علیہ سے دور ان کا ہر لمحہ اذیت سے گزر رہا
تھا۔ لیکن وہ دل پر جبر کئے ہوئے تھے۔

اور پھر تقریباً" ایک ماہ سے زیادہ گزر گیا۔ وہ دنوں کا صحیح حساب نہیں رکھ
کے تھے۔ اور پھر انہوں نے اپنی اسکیم پر عمل درآمد کا فیصلہ کرلیا۔

ایک دوپہر کھانا آیا تو انہوں نے ٹرے نہیں اٹھائی اور خاموش پڑے رہے۔ ٹرے واپس لے جانے والے نے جب ٹرے اسی جگہ بھری ہوئی پائی تو وہ حیران رہ گیا۔ پہلے کی بات دوسری تھی۔ لیکن اب تو ڈاکٹر باقاعدگی سے کھانا کھا لیتے تھے۔ اس نے ٹرے ہٹائی اور خانے سے اندر جھانکنے لگا۔ ڈاکٹر فرش پر اوندھے سیدھے پڑے تھے۔ ٹرے لے جانے والا خانہ بند کرنا بھی بھول گیا اور پھر کئی آدمی خانے سے اندر جھانکنے لگے۔ پھر ایک آواز سنائی دی:

"ڈاکٹر فیاض کیا بات ہے' آپ خیریت سے تو ہیں؟" لیکن ڈاکٹر فیاض نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے پڑے رہے۔ تب خانہ بند ہو گیا اور وہ سب خانے کے سامنے سے ہٹ گئے۔ پھر طویل عرصہ میں دوسری بار دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی اور چار آدمی اندر آ گئے۔ ڈاکٹر فیاض کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ لیکن انہوں نے سانس روک لی تھی اور ان کے جسم میں ہلکی سی جنبش بھی نہیں تھی۔ اس وقت کامیاب اداکاری ہی کام آ سکتی تھی۔ کھلی ہوئی آنکھوں سے انہوں نے دیکھ لیا کہ ان میں سے ایک کے پاس اسٹین گن موجود ہے جسے اس نے سیدھا کر رکھا ہے لیکن پھر ڈاکٹر کی حالت دیکھ کر وہ چونک پڑے:

"ارے یہ کیا ہوا؟" ان میں سے ایک نے کہا۔

"ک ک کیا ہوا؟" دوسرے نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"یہ......یہ تو مر گیا۔"

"مگر کیسے؟"

"کیا معلوم" پہلے نے کہا اور پھر وہ چاروں تیزی سے ڈاکٹر کے قریب پہنچ کر جھک گئے۔ ڈاکٹر اب بھی بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔ وہ صرف اسٹین گن والے کا جائزہ لے رہے تھے اور اندازہ لگا رہے تھے کہ کس پوزیشن میں آنے سے اسٹین گن پر قبضہ کیا جا سکتا ہے۔ پہلا ہی حملہ کامیاب ہونا چاہئے ورنہ کھیل بگڑ

ائے گا۔

"بالکل زندگی نہیں ہے' مگر یہ تو بہت برا ہوا' ہم سے جواب طلب کیا ائے گا۔" اس نے سراسیمہ لہجہ میں کہا اور اسی وقت ڈاکٹر کو موقع مل گیا۔ انکے نوں ہاتھ اٹھے اور دوسرے لمحے انہوں نے پوری قوت سے اسٹین گن والے کی ں پر ہاتھ مارا دوسرا ہاتھ اسٹین گن کو گرفت میں لے چکا تھا۔

ڈاکٹر فیاض کے جسم میں گوریلے کی پوری توانائی موجود تھی۔ ہاتھ کھانے لے کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وہ عجیب سی آوازیں حلق سے نکالتا ہوا زمین پر ٹنے لگا۔ دوسرے لوگ بھونچکے رہ گئے۔ لیکن اتنی دیر میں ڈاکٹر فیاض اسٹین گن لے کر کھڑے ہو گئے تھے اور پھر اسٹین گن کی غراہٹ کے ساتھ ہی سامنے موجود ں آدمیوں کی دلدوز چیخیں ابھریں اور وہ زمین پر تڑپنے لگے۔ زخمی نے اٹھ کر گنے کی کوشش کی لیکن اسٹین گن کی گولیاں اسے بھی چاٹ گئیں۔ دوسرے لمحے لٹر فیاض دروازے کی طرف بڑھے۔ انہیں خدشہ تھا کہ باہر اور لوگ موجود نہ ں اور دروازہ بند ہو جائے۔ لیکن باہر خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ اس کا لب تھا کہ وہاں ان چاروں کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔

اس طرف سے مطمئن ہو کر ڈاکٹر فیاض نے اس عمارت کا جائزہ لیا اور پھر کے ایک ایک کمرے کی تلاشی لینے لگے۔ کھانے پینے کا سامان ہتھیار' فرسٹ ایڈ سامان اور دوسری ایسی ہی چیزیں وہاں موجود تھیں۔ ایک وائرلیس سیٹ بھی نظر ۔ لیکن ان میں کوئی چیز ڈاکٹر کے کام کی نہیں تھی۔ پھر وہ عمارت کے باہری حصے نکل آئے اور انہوں نے پورے ماحول کا جائزہ لیا۔

ایک طویل عرصہ کے بعد کھلی ہوا ملی تھی۔ ڈاکٹر فیاض گہری گہری سانسیں لگے۔ عمارت ایک بلند پہاڑی پر واقع تھی۔ نیچے تک کچی سڑک گئی تھی اور ا کے بعد ذیلی سڑک ایک اور چوڑی سڑک سے جا ملی تھی۔

عمارت کے کمپاؤنڈ میں ایک چھوٹا ٹرک کھڑا تھا۔ انھوں نے ایک اسٹین گن اور اس کا ایمونیشن' ایک فرسٹ ایڈ بکس اٹھایا اور باہر آئے۔ یہ تمام چیزیں انھوں نے ٹرک پر رکھیں اور پھر اسٹیرنگ پر جا بیٹھے۔ انہیں خوف تھا کہ گوریلے کے جسم میں وہ کہیں ٹرک ڈرائیو نہ کر سکیں۔

لیکن ٹرک اسٹارٹ کر کے آگے بڑھانے میں انہیں کوئی دقت نہ ہوئی اور انہیں نے سکون کی سانس لی۔ انہیں اپنی مخدوش پوزیشن کا احساس تھا۔ انسانی شکل میں ہوتے تو کہیں چھپنے کی آسانی ہوتی۔ لیکن موجودہ شکل ان کے لئے پریشان کن تھی' تاہم اس اذیت ناک قید سے نجات مل جانے پر وہ خوش تھے۔ اب حالات جو بھی شکل اختیار کریں۔

ٹرک پہاڑی ڈھلان سے نیچے اترنے لگا اور پھر وہ ذیلی سڑک پر پہنچ گئے۔ ذیلی سڑک پر ٹرک دوڑاتے ہوئے وہ سوچ رہے تھے کہ وہ اب کس طرف جائیں۔ شہر کا رخ کریں' جنگلوں میں روپوش ہونے کی کوشش کریں۔ ایسی شکل میں تو کسی انسان کے قریب بھی نہیں جا سکتے تھے۔ انسان انہیں دیکھ کر دہشت زدہ ہو جاتے۔ وہ کس کی ہمدردی حاصل کریں۔

ٹرک نے ذیلی سڑک طے کر لی۔ اور پھر وہ بڑی سڑک پر مڑے ہی تھے کہ انہیں فائر کی آوازیں سنائی دیں اور وہ چونک پڑے۔ دوسرے لمحے انھوں نے ٹرک کو نیچے اتار دیا اور اسٹین گن لے کر خاموشی سے نیچے اتر گئے۔

☆☆☆☆☆☆☆

آرماک کا قصور صرف یہ تھا کہ اس کا رنگ کالا تھا۔ خدوخال بھدے تھے۔ لیکن اس میں اس کا کیا قصور تھا۔ وہ خود تو اس رنگ کا ذمہ دار نہیں تھا۔ لیکن سفید فام اس سے نفرت کرتے تھے۔ بے پناہ نفرت' اسے بچپن سے حقارت ملی تھی۔ اس کی نسل کے دوسرے لوگوں نے اس حقارت کو تقدیر سمجھ لیا تھا۔ لیکن آرماک نے یہ حقارت قبول نہیں کی تھی۔ اسے یاد تھا کہ

اس نے ایک سفید فام خاندان میں آنکھ کھولی تھی۔ اس کا باپ اس سفید خاندان کا ایک ادنی ملازم تھا۔ ماں اور باپ دن رات اپنے آقاؤں کی خدمت کرتے لیکن اس خدمت کے بدلے میں انہیں ہمیشہ نفرت ملی تھی۔ یہ اس کی آنکھوں کے سامنے کی بات تھی کہ ایک شام سفید فام آقا اس کے باپ سے سخت ناراض ہو گیا۔ اسنے چمڑے کے ہنٹر مار مار کر اس کے باپ کو زخمی کر دیا اور اس کا باپ ہسپتال جا کر چل بسا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی ماں اسے لئے ہوئے اسی خاندان کی خدمت کرتی رہی اور بالاخر ایک رات سردی سے ٹھٹھر کر مر گئی۔ تب سفید خاندان نے اس ننھے بچے کو گھر سے نکال دیا وہ ان کے لئے بیکار تھا اور ننھے آرماک نے سیاہ فاموں کے یتیم خانے میں پرورش پائی۔

لیکن اس کے دل میں سفید نسل سے نفرت پروان چڑھ رہی تھی۔ اس نے ان تمام حالات کو تقدیر نہیں سمجھ لیا تھا اور یہ نفرت پرورش پاتی رہی۔ وہ یتیم خانے میں جوان ہو رہا تھا ایک مجہولی اور حسرت زدہ ماحول میں۔ لیکن نفرت کے پودے جڑ پکڑتے جا رہے تھے۔ یتیم خانے کے دوسرے سیاہ نوجوان چند ہی روز میں اسے اپنا لیڈر ماننے لگے اور رات کی تاریکیوں میں وہ انہیں نفرت کا سبق دیتا رہتا۔ اس نے اپنے اجداد پر مظالم کی ایک ایک تفصیل انہیں سنائی اور ان میں ہر نوجوان قہر بن گیا۔

اور پھر بظاہر حسرت زدہ یتیم خانے کے اندر ایک عظیم تحریک ابھری۔ اس کا نام "بلیک بیگ" تھا۔ یہ تنظیم دہشت پسند تھی اور اس کا مقصد صرف سیاہ فاموں کے حقوق کی حفاظت تھی۔

بلیک بیگ کے پاؤں مضبوط ہوتے گئے اور پہلی بار ایک بارونق بازار میں آٹھ سفید فاموں کو کتے کی طرح مار دیا گیا۔ جنہوں نے ایک سیاہ فام سیلز گرل کو قتل کر دیا تھا۔ سیاہ فام سیلز گرل نوجوان تھی۔ اس کا جسم بے حد حسین تھا۔ آٹھ

نوجوان کا ایک گروہ جنرل اسٹور میں داخل ہو کر اس سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ سیلز گرل نے ان میں سے ایک نوجوان کے تھپڑ مار دیا۔ تو دوسرے نوجوان نے پستول نکال کر اسے گولی مار دی۔ پولیس آگئی سفید فام نوجوانوں سے صرف بیان لے کر انھیں چھوڑ دیا گیا' لیکن ابھی سیلز گرل کی لاش بھی نہ اٹھی تھی کہ کہ سیاہ رنگ کی ایک وین بازار میں رکی اور ان اٹھ نوجوانوں کو بھون کر رکھ دیا گیا۔ وین سے بلیک بیگ کا نعرہ لگایا گیا اور پھر دہ ہوا ہو گئی۔

بات معمولی نہیں تھی۔ بڑے پیمانے پر فسادات شروع ہو گئے۔ کالوں کی بستیوں پر حملے ہوئے' بے شمار لوگ قتل کر دیئے گئے' لیکن اس بار سفید فاموں کو انتہائی تلخ تجربات ہوئے۔ ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ان فسادات کا ایسا سخت رد عمل ہو گا۔ بلیک بیگ نے پورے شہر میں تباہی مچا دی' بڑی بڑی عمارتوں کو آگ لگا دی گئی بہت سے ہوٹلوں میں بم کے دھماکے کئے گئے' بے شمار سفید فاموں کو بر سر عام گولی سے اڑا دیا گیا۔ یہاں تک کہ حکومت کو فوجی امداد طلب کرنی پڑی۔

تب کہیں جا کر فسادات رکے۔ سیاہ فام لیڈروں سے گفتگو ہوئی' تحقیقات ہوئی' لیکن جو لوگ سامنے تھے' بے قصور ثابت ہوئے اور پھر شہر کی دیواروں پر بڑے بڑے پوسٹر نظر آئے' جن میں مطالبہ کیا گیا کہ ملک میں موجود ایک ایک سیاہ فام کے حقوق کی حفاظت کی جائے۔ ان کی بہبود کے پروگرام بنائے جائیں اور انہیں بھی معزز شہری تسلیم کیا جائے ورنہ بلیک بیگ پورے ملک میں تباہی مچا دے گی۔

کانفرنسیں ہوئیں' تشویش کا اظہار کیا گیا۔ نفرت کے بل پاس ہوئے لیکن بات سفید فاموں کی سوچ سے کہیں آگے تھی۔ بلیک بیگ کی تلاش کی ہر کوشش ناکام رہی۔ اسکے سرغنہ کے بارے میں کچھ پتا نہ چل سکا۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ پودا کہاں سے ابھرا ہے۔ بلیک بیگ نے ایک ہفتے کا نوٹس دیا تھا۔ جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ ایک ایک سیاہ فام کے حقوق کی فہرست جاری کی جائے۔ ان حقوق کی تفصیل

بھی درج تھی اور یہ ایسے مطالبے تھے جو ناقابل عمل تھے چنانچہ انہیں مسترد کر دیا گیا۔ اور ایک ہفتہ پورا ہوتے ہی قیامت آگئی۔ ایئرپورٹ بموں سے اڑا دیا گیا۔ سرکاری عمارتوں پر خوفناک حملے ہوئے۔ بڑی بھیانک صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ مجبوراً حکومت کو چند اعلانات کرنے پڑے۔ سیاہ فاموں کی بستیوں کی حفاظت کی ذمہ داری لی گئی۔ ان پر ظلم نہ کرنے کے وعدے ہوئے اور ان پر بادل نخواستہ عمل ہوا' سفید فاموں کے ہوش ٹھکانے آگئے تھے۔

لیکن وہ اس چوٹ کو بھول نہیں سکتے تھے۔ اس تنظیم کی جڑوں کی تلاش جاری رکھی گئی۔ خفیہ طور پر ایک محکمہ ترتیب دیا گیا جس کے ممبران انتھک محنت سے اس تنظیم کے ہیڈ کوارٹر کو تلاش کرنے لگے۔ لیکن ان کے لئے سخت مشکلات درپیش تھیں۔ اب سیاہ فاموں پر ہاتھ ڈالنا اس قدر آسان نہ تھا جب تک ان کے بارے میں مکمل یقین نہ ہو جائے یقین ہونے کی صورت میں بھی وہ خفیہ طور پر سے گرفتار کر کے ہلاک کر دیتے تھے اور اس کی لاش اس طرح غائب کرتے کہ اس کا نام نشان نہ رہے۔

آرماک اب یتیم خانے سے بہت دور تھا۔ سیاہ فاموں کی تنظیم بلیک بیگ کا ہیڈ کوارٹر اب یتیم خانے کے نیچے تعمیر ہونے والی خفیہ عمارت میں تھا۔ لیکن اس کے سرگرم ممبر اس سے الگ ہی رہتے۔ انتہائی خاص موقعوں پر ہی وہ سب لوگوں جمع ہوتے تھے۔

آرماک اپنی کاروائیوں میں مصروف تھا کہ ایک دوپہر اسپیشل محکمے والوں کی نگاہوں میں آگیا۔ ہرچند وہ اس کی حقیقت سے واقف نہیں تھے۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ تنظیم کا سربراہ ہے۔ انہیں بس اس پر شبہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ آرماک کی فورڈ چلی اور ان کی جیپ بھی اس کے پیچھے لگ گئی' جس کا احساس ارماک کو بہت جلد ہو گیا۔

وہ خفیہ محکمے کی کاوشوں سے غافل نہیں تھا۔ ان کے طریقہ کار کا بھی اندازہ لگا چکا تھا۔ اس لئے اس نے ان کے نرغے سے نکل جانا ہی مناسب سمجھا۔ اس کی کار کی رفتار تیز ہو گئی کیونکہ اس وقت وہ اپنے ہمدردوں سے بہت دور تھا۔ ان سے رابطہ قائم کرنا بھی ناممکن تھا' چنانچہ نکل جانے ہی میں عافیت تھی۔

بھری پری سڑکوں پر تعاقب آسان تھا اور نکل جانے میں دشواری تھی۔ اس لئے ایک چوراہے سے اس نے رخ بدل دیا اور ایک سڑک پر لگ گیا جو سنسان تھی اور شہر سے باہر جاتی تھی۔ یہاں وہ اپنی بہترین ڈرائیونگ کا مظاہرہ کر سکتا تھا۔ ان لوگوں سے بھڑنا مناسب نہیں تھا کیونکہ ان کی تعداد زیادہ تھی اور اس وقت اس کے ساتھی اس کی مدد کو نہیں آسکتے تھے۔

سنسان سڑک پر آتے ہی اس نے کار کی رفتار بڑھا دی لیکن جہاں اس سنسان سڑک سے اسے فائدہ ہوا تھا وہیں اس کے دشمن کو بھی خاطر خواہ فائدہ ہوا تھا یہاں انہیں چیک کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اور بہت جلد آرماک کو بھی احساس ہو گیا کہ اس نے سنسان سڑک پر آنے کا فیصلہ غلط کیا تھا۔

بھرے پرے بازار میں وہ کم از کم اس پر گولیاں نہیں چلا سکتے تھے۔ رہا تیز ڈرائیونگ کر کے نکل جانے کا سوال تو جیپ والے بھی شاندار ڈرائیور ہو سکتے تھے اور اس کا اندازہ اسے جلد ہو گیا جیپ بھی برق رفتاری سے آ رہی تھی اور فاصلہ بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا' جیپ بھی شاید خاص قسم کی تھی۔

پھر جیپ والوں نے پہلا فائر کیا اور آرماک کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی آج شاید ستارے ہی گردش میں ہیں' ورنہ غلط فیصلہ نہ ہوتا۔ بہرحال وہ انتہائی جدوجہد کرنا چاہتا تھا۔ اگر موت ہی مقدر ہے تو یہی سہی۔ اسے خوشی تھی کہ اس مشن جڑ پکڑ چکا ہے۔ اور اب اس کی موت کے بعد بھی سیاہ فاموں کی وہ کیفیت نہیں ہو سکتی جو تھی۔ اب اس جیسے درجنوں لیڈر ہو سکتے تھے۔ کالے جاگ اٹھے تھے

اور انہوں نے اپنی طاقت کا لوہا منوا لیا تھا۔

آرماک اب کار کو اس انداز میں دوڑا رہا تھا کہ جیپ سے کئے گئے فائروں کے نشانے غلط ہو جائیں ابھی تک وہ اس میں کامیاب تھا۔ جیپ سے اب لگاتار فائر ہونے لگے تھے۔ لیکن ایک بھی گولی کارآمد نہیں ہوئی تھی۔ البتہ اس سے آرماک کو یہ نقصان پہنچا تھا۔ اسے کار لہرانے کے لئے رفتار سست کرنی پڑتی تھی جبکہ جیپ بدستور اسی رفتار سے چلی آ رہی تھی اور فورڈ سے اس کا فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا اور پھر جب جیپ اور کار کا فاصلہ کم ہو گیا تو آرماک نے فائرنگ کے خطرے کو نظرانداز کر دیا اس نے کار کو سیدھا دوڑایا۔ ایکسیلیٹر پر اس کے پاؤں کا دباؤ آخری حد تک ہو گیا اور فورڈ بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح آگے بڑھ گئی۔ جیپ کافی پیچھے رہ گئی تھی اور اب جیپ والوں کو بھی نئے سرے سے تگ و دو کرنا پڑی۔ فاصلہ اچانک حد سے زیادہ ہو گیا تھا۔ اب فائرنگ بھی بیکار تھی کیونکہ کار گولیوں کی پہنچ سے باہر تھی۔ چنانچہ جیپ کی رفتار بھی تیز ہونے لگی۔ وہ طوفانی انداز میں آگے بڑھ رہی تھی۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ شہر سے کتنی دور نکل آئے ہیں۔ بس اندھا دھند دوڑ ہی ہو رہی تھی اور پھر یہ آنکھ مچولی کافی طویل ہو گئی۔ کار کئی موڑوں پر گھوم کر کافی دور نکل گئی تھی۔

دفعتاً کار کے انجن سے چیخیں بلند ہونے لگیں اور آرماک کی نگاہیں پٹرول میٹر پر جا پڑیں۔ پٹرول کی مقدار بتانے والی سوئی زیرو پر لرز رہی تھی۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اب کچھ کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اونچی نیچی پہاڑیاں چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں۔ کار اب جھٹکے کھانے لگی تھی۔ جیپ بالکل قریب آتی جا رہی تھی اور اب اس سے دوبارہ فائرنگ ہونے لگی تھی۔ فورڈ کی چیخیں ناقابل برداشت ہونے لگیں۔ آرماک نے اسے آخری حد تک دوڑایا اور ایک بار پھر جیپ سے دور ہونے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

انجن بند ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی آرماک نے کار کا دروازہ کھول دیا۔ پھر جونہی
کار رکی وہ نیچے کود گیا۔

لیکن اس کے دشمن غافل نہیں تھے بیک وقت بہت سی گولیاں چلیں اور
آرماک سڑک کے نشیب میں اترنے کی کوشش کرنے لگا۔ فائرنگ پھر ہوئی اور اس
بار وہ کامیاب ہو گئے۔ یوں بھی جیپ آرماک کے قریب پہنچ گئی تھی۔ آرماک کی
داہنی ران میں انگارے اتر گئے' وہ اوندھے منہ گرا اور جیپ اس کے سر پر پہنچ گ

اس وقت اگر اس کے دشمن چاہتے تو اسے جیپ سے کچل بھی سکتے ت
لیکن انہوں نے یہ مناسب نہیں سمجھا اور جیپ اس کے قریب آ کر رک گئی۔ ا
میں بیٹھے ہوئے چاروں آدمی بھی چھلانگیں لگا کر نیچے آ گئے۔ ان کے ہاتھوں
پستول تھے انہوں نے آرماک کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ آرماک کی ران ۔
خون کا فوارہ بلند ہو رہا تھا۔ اس نے چاروں طرف کھڑے ہوئے خونخوار وحشیو
دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایک طرف کھڑے ہوئے آ
نے بوٹ کی ٹھوکر اس کے منہ پر رسید کی اور اس کی مسکراہٹ خون میں ڈو
گئی۔

"کھڑے ہو جاؤ" اس نے دوسری ٹھوکر آرماک کی داہنی پنڈلی پر ر
کرتے ہوئے کہا۔

"مشکل ہے۔" آرماک نے خون تھوکتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں
اب سکون تھا۔

"بلیک بیگ کا ہیڈ کوارٹر کہاں ہے؟"

"میں جانتا تھا۔ میں جانتا تھا۔ آج کل تم لوگوں کے ذہنوں پر بلیک ب
بھوت سوار ہے۔" آرماک نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جواب دو۔ ورنہ زبان کاٹ لوں گا"

"میں جانتا ہوں! دوستو تم مجھے زندہ نہیں چھوڑو گے اگر میں کچھ نہ بتا سکا
ب بھی نہیں کیونکہ تم خوفزدہ ہو۔ تم جانتے ہو کہ اگر تمہارے اس سلوک کی
لاع ہماری تنظیم کو مل جائے تو وہ تم سے انتقام لے گی۔"

"ہوشیار ہو۔ بہر حال تم تسلیم کرتے ہو کہ تمہارا تعلق بلیک بیگ سے
ہے؟"

"اس مقدس تنظیم سے تعلق ہمارے لئے عبادت ہے۔"

"تب پھر اپنی عبادت گاہ کا پتا بتا دو۔" سفید فام نے اس کی پیشانی پر گھونسہ
ید کرتے ہوئے کہا اور آرماک پھر گر پڑا۔

"ہر صاحب مذہب اپنی عبادت گاہوں کو ناپاک قدموں سے محفوظ رکھنے کی
شش کرتا ہے۔" آرماک نے کہا اور سفید فام لاجواب ہو گئے۔ "گولی
ر دو ٹیلر۔ ہم شہر سے کافی دور نکل آئے ہیں واپس بھی جانا ہے۔ اسے گولی مار کر
س کی لاش کار میں ٹھونس دو اور پھر کار کو کسی کھڈ میں دھکیل دو۔" ایک سفید فام
نے پستول سیدھا کر لیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

اور اسی وقت ان پر قیامت ٹوٹ پڑی' اسٹین گن کی آواز تھی۔ سفید
کرناک چیخیں سنائی دیں اور انہوں نے جیپ کی طرف دوڑ کر شاید اس کی آڑ لینے
ی کوشش کی لیکن اسٹین گن کی گولیوں نے انہیں موقع نہ دیا اور وہ اوندھے
یدھے ایک دوسرے کے اوپر گر پڑے۔ آرماک ان کے نیچے دب گیا تھا۔ لیکن
اس کے چہرے سے مسرت پھوٹ پڑی تھی یقیناً اسکی تنظیم کے کچھ لوگ ادھر آ نکلے
تھے۔ اس نے اپنی مخصوص سیٹی بجا کر اپنی زندگی اور ان لوگوں کی ہلاکت کی اطلاع
دی لیکن چند لمحات تک کوئی تحریک نہ ہوئی۔ اس کے آدمی حالات کا جائزہ لے
رہے تھے۔ اس نے لائن کلیئر ہونے کی دوسری سیٹی بجائی۔ قاعدے سے اس سیٹی کا

جواب ملنا چاہئے تھا لیکن جواب نہ ملا۔ تب اس نے حیرت سے گردن گھمائی۔ اس
مطلب ہے کہ اس کے محسن اس کے آدمی نہیں ہیں پھر کون ہے؟

اس نے سفید فاموں کی لاشیں خود پر سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن اس
ران سے کافی خون بہہ گیا تھا۔ اس لئے وہ کامیاب نہ ہوسکا۔ تب اس نے ای
عجیب سی کھڑکھڑ کی آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی ایک غیر انسانی چاپ بھی محسوس
رہی تھی اور پھر اپنا محسن اسے نظر آگیا۔ لیکن وہ جو کوئی بھی تھا اسے دیکھ
آرماک ششدر رہ گیا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایک طو
القامت گوریلا تھا۔ خوفناک گوریلا لیکن اس کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی اور گو
اسی نے چلائی تھیں۔

آرماک نے پھر اسے غور سے دیکھا، ممکن ہے گوریلے کی کھال میں
انسان ہو لیکن قدو قامت.....قدو قامت کسی انسان کا نہیں تھا۔ وہ سو فیصد گور
تھا۔ ست رفتاری سے چلتا ہوا وہ اس کے قریب پہنچ گیا اور آرماک کسی قدر خ
ہوگیا۔ نہ جانے وہ اس کے ساتھ کیسا سلوک کرے

لیکن گوریلے نے اس پر پڑی ہوئی لاشیں اٹھا اٹھا کر ایک طرف پھی
دیں اور پھر اس نے کسی انسان ہی کی طرح اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس
زندگی کے آثار تلاش کئے۔ آرماک حیرت کی گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔
گوریلے کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں نے اسے دیکھا اور آرماک کو اپنے ذہن
سنسناہٹ محسوس ہونے لگی۔ تب گوریلے نے جھک کر اسے اٹھا لیا اور پھر وہ ا
دونوں ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے چل پڑا۔ آرماک نے خاموشی اختیار کر رکھی
اس کے علاوہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ نہ جانے گوریلا اسے کہاں لے جا رہا

گوریلا سڑک سے اتر گیا اور پھر آرماک کو ایک ٹرک نظر آیا۔ جو
کے نشیب میں کھڑا ہوا تھا۔ گوریلا اسی ٹرک کی طرف بڑھ رہا تھا۔

" اوہ شاید ٹرک میں وہ لوگ ہوں جنہوں نے اس گوریلے کو ٹرینڈ کیا
" آرماک نے سوچا۔ گوریلے نے اسے ٹرک پر ڈال دیا۔ لیکن ٹرک پر اس کے
وہ اور کوئی نہیں تھا۔ گوریلا واپس ہوگیا اور پھر آرماک نے ڈرائیونگ سیٹ کا
روازہ کھلتے ہوئے محسوس کیا۔ پھر ٹرک اسٹارٹ ہو کر چل پڑا۔

آرماک کو اپنے ذہن پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ ران کے زخم کی تکلیف
شدت کو وہ اب تک نظر انداز کئے ہوئے تھا لیکن ٹرک سے لگنے والے جھٹکے
قابل برداشت تھے۔ اس کے حواس گم ہوئے جا رہے تھے۔ اگر اس حیرت انگیز
ورلیے کو دیکھ کر اس کا ذہن نہ ہٹ گیا ہوتا تو شاید اب تک وہ تکلیف سے اور
زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے بے ہوش بھی ہوگیا ہوتا۔

ٹرک نے ایک مختصر سفر کیا۔ اس دوران آرماک سوچتا رہا کہ اٹھ کر
گوریلے کو ڈرائیونگ کرتے ہوئے دیکھے۔ بڑا حیرت انگیز اور ناقابل یقین منظر
ہوتا۔ لیکن وہ اتنی ہمت نہ کر سکا اور اسی طرح پڑا رہا۔ پھر ٹرک رک گیا اور گوریلا
نیچے اتر آیا۔ پھر وہ ٹرک کے پچھلے حصے میں پہنچ گیا اور اس نے ٹرک میں رکھے
ہوئے سامان کو ٹٹولا۔ پھر اس میں سے فرسٹ ایڈ بکس نکال لیا۔ آرماک اب بھی
پوری دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ گوریلے نے سامان سے کاغذ اور ایک پیڈ اور قلم
بھی نکال لیا۔

آرماک کی بند ہوتی ہوئی آنکھیں پھر کھل گئیں۔ اب گوریلا کاغذ پر کچھ لکھ
رہا تھا اور پھر اس نے اپنی تحریر آرماک کی طرف بڑھا دی۔

آرماک نے جلدی سے کاغذ لیا اور پھر وہ اس ٹیڑھی میڑھی رائٹنگ کو
دیکھنے لگا۔ لکھا تھا:

"اگر تمہیں زیادہ تکلیف ہو تو میں آپریشن کر کے گولی نکال بھی سکتا
ہوں۔ یا پھر صرف وقتی ڈریسنگ کر دوں؟"

آرماک کی آنکھیں شدید حیرت سے پھیل گئیں۔ ایسا عجیب و غریب گوریلا اس نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ جو رائفل چلا سکتا ہو۔ ٹرک ڈرائیور کر سکتا ہو اور انگلش کی غلطی کیئے بغیر لکھ بھی سکتا ہو۔

"جب تم لکھ سکتے ہو تو بات سمجھ بھی سکتے ہو گے؟"

اس نے دریافت کیا اور گوریلے نے گردن ہلا دی۔

"مجھے بتاؤ تم کون ہو؟"

"دلیر نوجوان تمہاری ہمت قابل داد ہے۔ یوں سمجھ لو میں بھی خطرے میں ہوں۔ میرے بارے میں جاننے کے بجائے یہ بتاؤ کہ تمہارا کوئی ٹھکانہ بھی ہے؟" گوریلے نے کاغذ پر لکھ کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

"ہاں میرا ٹھکانہ موجود ہے۔ پہلے تم مجھے فرسٹ ایڈ دو۔ اس کے بعد ہم گفتگو کریں گے۔ ہاں ذرا سی برانڈی مل جائے گی؟" اور گوریلے نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"خیر کوئی بات نہیں" آرماک نے کہا اور پھر وہ گوریلے کو فرسٹ ایڈ بکس کھولتے دیکھنے لگا۔ شاید اس حیرت انگیز واقعے پر کوئی یقین نہ کرے۔ اب اس بات میں شبہ نہیں تھا کہ وہ گوریلے کی کھال میں کوئی انسان نہیں بلکہ درحقیقت گوریلا ہی تھا۔ لیکن وہ کون ہے' کہاں سے آگیا' اسٹین گن اس کے پاس کہاں سے آئی؟ یہ تمام باتیں حیرت انگیز تھیں۔

گوریلے نے باقاعدگی سے اس کا زخم صاف کر کے ضروری ادویات لگائیں اور پھر عمدہ قسم کی بینڈیج کر دی ۔ پھر اس نے آرماک کو کھانے کی ایک گولی دی جسے آرماک نے نگل لیا۔ اس کے بعد اسٹین گن سنبھال کر بیٹھ گیا۔ پیڈ اور قلم اس کے پاس رکھا ہوا تھا۔ آرماک خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"میں تمہارے بارے میں سخت حیرت زدہ ہوں؟"

آرماک نے بالآخر کافی دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

"فی الحال تم مجھے اپنا ادنی دوست سمجھو۔ بعد میں میں تمہیں اپنے بارے سب کچھ بتادوں گا۔ یہ بتاؤ یہ جگہ خطرناک تو نہیں ہو گی۔ کیا ان کے ساتھی ری تلاش میں یہاں آ سکتے ہیں؟" گوریلے نے لکھا اور کاغذ اس کی طرف بڑھا

"ممکن ہے نکل آئیں۔ یہاں سے دور نکل چلو' میں اب بالکل ٹھیک ں" آرماک نے کاغذ پڑھنے کے بعد کہا۔

"تمہارے ٹھکانے کی طرف ہم رات کو چلیں گے۔ دن میں کھلی سڑکوں پر ڈرائیونگ کرنا ٹھیک نہیں ہے۔" گوریلے نے لکھا اور ٹرک سے نیچے اتر گیا۔ ماک گردن ہلانے لگا تھا۔

تقریباً آدھی رات کو ٹرک شہر میں داخل ہوا۔ آرماک اس وقت گوریلے پاس بیٹھا اسے راستہ بتاتا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ پولیس کی طرف سے بھی شیار تھا لیکن راستے میں پولیس سے کوئی ٹکراؤ نہ ہوا اور وہ بلیک بیگ کے ہیڈ ارٹر پہنچ گئے۔ بہت سے سیاہ فام دوڑ پڑے۔ اور گوریلے کو دیکھ کر ان کی بھی ی حالت ہوئی جو آرماک کی ہوئی تھی۔ گوریلے نے آرماک کو سہارا دے کر اتارا اور پھر آرماک کے دوسرے ساتھیوں نے اسے سنبھال لیا۔

تھوڑی دیر کے بعد آرماک اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا انہیں اپنی کہانی رہا تھا اور ہیڈ کوارٹر میں موجود ڈاکٹر اس کی ران کے آپریشن کی تیاریاں کر رہے ے۔

"یہ میرا بہت بڑا محسن ہے دوستو! اس کی ہیئت پر نہ جاؤ۔ اس کی شخصیت ت پر اسرار انداز میں سامنے آئے گی۔ میں فی الوقت اتنا ہی کہوں گا کہ اس کے تھ وہی سلوک کرو جو محسن کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ارماک نے اپنے ساتھیوں سے

کہا اور اس کے ساتھی اس کی داستان پر انگشت بدنداں رہ گئے۔ بہر حال وہ ایک جانور کا احترام کر رہے تھے۔ آرماک کے آپریشن کے وقت ڈاکٹر فیاض اس کے کمرے سے نکل گئے۔ مبادا انہیں دیکھ کر آپریشن کرنے والے ڈاکٹروں کا دھیان نہ بٹے، لیکن آپریشن کے بعد آرماک نے فوراً انہیں بلایا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک خاصی ساخت کی کرسی اور میز ڈال دی گئی تھی۔ میز پر پیڈ رکھا ہوا تھا۔ قلم بھی موجود تھا۔

آرماک ایک آرام وہ بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اور اس کے نزدیک ہی ایک سیاہ فام لڑکی موجود تھی جو شاید اس کی سیکریٹری کے فرائض انجام دے رہی تھی۔

"میں تمہاری کہانی سننے کے لئے بے چین ہوں دوست! آپریشن بھی میں نے بمشکل کرایا ہے، جب تک میں تمہارے بارے میں معلوم نہ کر لوں گا۔ سکون سے نہیں سو سکوں گا۔"

"میرا خیال ہے تمہارے جسم سے کافی بہہ گیا ہے، رات بھی خاصی گزر گئی ہے۔ آرام کرو میں صبح کو اپنی کہانی لکھ دوں گا۔" گوریلے نے لکھا۔

"میں رات بھر نہ سو سکوں گا۔ ہاں اگر تمہاری کہانی سن لوں تو پھر سکون کی نیند آئے گی"۔ آرماک نے کہا اور گوریلے نے قلم اور پیڈ سنبھال لیا۔ پھر ایک ایک شیٹ لکھ کر سیکریٹری کو دینے لگا۔ سیکریٹری اسے پڑھ پڑھ کر آرماک کو سنانے لگی۔ سیاہ فام لڑکی حیرت سے گوریلے کو لکھتا دیکھ رہی تھی۔ لیکن پہلی شیٹ پڑھنے کے ساتھ ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ گوریلے نے لکھا تھا:

"آرماک... میں بھی تمہاری طرح انسان ہوں۔ میرا جسم گوریلے کا۔ لیکن اس میں انسانی دماغ موجود ہے۔ میں ایک ایشیائی ڈاکٹر ہوں۔ جس نے انسانیت کی بھلائی کے لئے بہت کچھ کیا تھا، لیکن انسانوں نے اس کا صلہ یہ دیا

جو وہ شکل میں تمہارے سامنے ہے۔"

سیاہ فام سیکریٹری گوریلے کی تحریر کردہ شیٹس سناتی رہی اور آرماک کے ے کے تاثرات بدلتے رہے۔ پوری کہانی سننے کے بعد اس کے تاثرات بالکل ل گئے تھے۔ اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئی تھیں۔ پھر اس نے غیظ کے عالم ں کہا۔

"ہاں میرے دوست یہ گوری چمڑی والے ایسے ہی سنگدل ہیں۔ صرف نگ کی بنیاد پر انہوں نے انسانیت کی تذلیل کی ہے۔ میں بھی رنگ ہی کا شکار وں۔ میرے دوست میری اور میرے ساتھیوں کی شخصیت بھی مسخ کر دی گئی تھی۔ میری کہانی بھی تم سے تھوڑی سی مختلف ہے۔ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، نسانیت اسے کبھی معاف نہیں کرے گی۔ سنو دوست میں تمہارے لیے کچھ کرنا پاہتا ہوں ان ڈاکٹروں کی نشان دہی کر سکو گے جنہوں نے تمہارا ذہن تبدیل کیا ہے؟ سنو آرماک وعدہ کرتا ہے میری پوری تنظیم اس کام کے لئے کام کرے گی اور س وقت تک چین کا سانس نہ لے سکے گی جب تک تمہیں تمہاری شخصیت واپس نہ دلا دے گی۔"

گوریلے کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے لکھا:

"میری بچی میرے لیے تڑپ رہی ہوگی۔ نہ جانے انہوں نے میرے جسم کو کیا کیا ہو گا۔ اگر تم میری مدد کر سکو، تو انسانیت سے بدظن نہ ہوں گا۔"

"میں تمہارے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔" کیا تمہارے پاس افرادی طاقت ہے؟"

"ہاں۔ اب میں تمہیں اپنی تنظیم کے بارے میں بتانے میں عار نہیں سمجھتا۔" آرماک نے بلیک بیگ کے بارے میں پوری تفصیل اسے بتا دی اور گوریلے کی آنکھیں چمکنے لگیں:

"تب تو بہت کچھ کر سکتے ہو۔" اس نے لکھا۔ "یقیناً مجھے بتاؤ میں کس انداز میں کام کروں؟" اور گوریلا ایک طویل تحریر لکھنے لگا۔☆☆☆☆☆☆☆☆

ہوم منسٹر مسٹر ڈگلس پارکر، سلیپنگ سوٹ پہن کر جونہی خواب گاہ میں داخل ہوئے پشت سے ان کے سر پر ایک زوردار ضرب پڑی اور اس سے قبل کہ ان کی چیخ بلند ہو۔ ایک چوڑا ہاتھ ان کے منہ پر آجما اور پھر ان کے حواس تاریکی میں ڈوب گئے تو دونوں سیاہ فاموں نے انہیں اٹھایا اور احتیاط سے باہر نکل آئے۔ لوگوں کی نگاہوں سے بچتے ہوئے خوبصورت عمارت کی عقبی چاردیواری سے باہر نکل آئے جہاں سیاہ رنگ کی ایک وین ان کی منتظر تھی۔ ان کے لواحقین کو احساس بھی نہ ہوا کہ انہیں اس خاموشی سے اغوا کر لیا گیا ہے۔ پھر جب ان کی مسز سولہ سنگھار کر کے اور خود کو ضرورت سے زیادہ پر کشش بنا کر خواب گاہ میں داخل ہوئیں تو شوہر کو نہ پا کر حیران رہ گئیں۔ انہوں نے سوچا کہ شائد وہ باتھ روم میں ہوں۔ چنانچہ وہ قوم کی مسہری پر رنگین لحاف میں گھس گئیں۔ ان کی آنکھیں باتھ روم کے دوازے کی طرف اٹھ گئیں۔ لیکن کافی دیر گزرنے کے بعد جب ڈگلس پارکر باتھ روم سے باہر نہ آئے تو انہیں تشویش ہوئی۔ وہ گرم لحاف سے نکل کر باتھ روم کے دروازے پر پہنچیں اور انہوں نے مترنم آواز میں پکارا:

"کیا تم اندر ہو ڈارلنگ ؟"

لیکن ڈارلنگ اندر نہیں باہر تھے:

☆☆☆☆☆☆☆☆

پلاننگ کمیشن کے سیکریٹری آؤ جر کن کلب کی تفریحات سے فرصت پا کر اپنی لمبی کار میں آبیٹھے۔ ان کے ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ مسٹر آؤ جر کن نے پشت سے ٹیک لگائی ہی تھی کہ ان کی کھوپڑی میں ستارے ناچ گئے۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور پھر ان کی آنکھوں کی روشنی

آہستہ آہستہ گم ہو گئی کار اسی رفتار سے دوڑ رہی تھی پھر ایک سنسان سی سڑک پر پہنچ کر رکی اور اسی وقت ایک سیاہ وین ان کی کار کے قریب رک گئی۔ مسٹر آؤ جر کن کو ان کے ڈرائیور نے ایک آدمی کی مدد سے وین میں پہنچادیا اور وین اسٹارٹ ہو کر چل پڑی۔ مسٹر آؤ جر کن کی کار کو اسی جگہ چھوڑ دیا گیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

اٹامک انرجی کمیشن کے سربراہ مسٹر گولبے ایک اہم پراجیکٹ کا معائنہ کر کے واپس لوٹ رہے تھے۔ خاصی رات گزر چکی تھی انہیں سخت بھوک لگ رہی تھی اور وہ دل ہی دل میں اپنی مصروفیات کو کوس رہے تھے جن کی وجہ سے وہ وقت پر کھانا بھی نہیں کھا سکتے تھے۔ ان کا ڈرائیور برق رفتاری سے کار چلا رہا تھا۔ بریف کارڈن کے چوراہے سے جیسے ہی ان کی کار مڑی، اچانک ایک زوردار آواز ہوئی ور اگر ان کا ہوشیار ڈرائیور کار کو کنٹرول نہ کر سکتا تو یقیناً وہ الٹ جاتی۔

"اچھلتی ہوئی کار سڑک سے نیچے اتر گئی اور مسٹر گولبے بدحواس ہو گئے۔

"کیا ہوا!؟" انہوں نے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"ٹ.... ٹائر برسٹ ہو گیا ہے۔" ڈرائیور نے جواب دیا۔

"لعنت ہے.... اس وقت".... مسٹر گولبے دانت پیس کر بڑبڑائے "اب کیا و گا؟"

لیکن اس سے قبل کہ ڈرائیور انہیں اس بات کا جواب دیتا سڑک پر کسی ار کی ہیڈ لائٹ نظر آئیں اور مسٹر گولبے چونک پڑے۔

جاؤ کار روک کر لفٹ لو میں کسی مناسب جگہ پر اتر جاؤں گا۔ جہاں ٹیکسی ں جائے۔ تم ٹائر بدل کر گھر پہنچ جانا۔"

"یس سر۔" ڈرائیور نے جواب دیا اور سڑک پر کھڑے ہو کر کار روکنے ا۔ کار ان کے بالکل قریب پہنچ گئی اور اس نے لفٹ کی استدعا کی۔

"ضرور" اندر سے شائستہ لہجے میں کہا گیا۔ اندھیرے کی وجہ سے ڈرائیور کی شکل نظر نہیں آئی تھی۔ مسٹر گولبے شکریہ ادا کر کے اندر بیٹھ گئے اور کار چل پڑی۔ دوسرے لمحے مسٹر گولبے کی گردن کی پشت پر ایک ضرب پڑی اور ان کے حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکلنے لگیں۔ لیکن پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے انہیں دبوچ لیا تھا۔

غرض یہ حادثوں کی رات تھی۔ پورے شہر سے تقریباً پون درجن افراد کو اغوا کیا گیا تھا۔ اور اس رات کی صبح بڑی سنسنی خیز تھی۔ حکومت کے اہم ستون نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ پولیس ہیڈ کوارٹر کو ایک کے بعد ایک اطلاع مل رہی تھی۔ غائب ہونے والے ایسی اہمیت رکھتے تھے کہ حکومت کے ہوش اڑ گئے۔

آہنی پنجروں میں ان کی آنکھ کھلی تھی۔ یہ پنجرے ایک دوسرے سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔ وہ آپس میں گفتگو کر سکتے تھے۔ ان سب کو رات ہی میں ہوش آ گیا تھا لیکن دن کی روشنی میں وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر چونک پڑے۔ تقریباً سب ہی ایک دوسرے کے صورت آشنا تھے۔ ایک دوسرے سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ سب ہی حکومت کے اہم ستون تھے۔ لیکن اغوا کا مقصد ان کے لئے نامعلوم تھا۔ "ایک بات میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں....!" چیف پلاننگ آفیسر نے سیکورٹی ڈائریکٹر سے کہا۔

"یہ حرکت بلیک بیگ کے علاوہ کسی کی نہیں ہے۔ مجھے اغوا کرنے والے سیاہ فام تھے۔"

"تب تو..... تب تو ہم سخت مصیبت میں ہیں۔ ان لوگوں کے چنگل سے نکلنا آسان نہ ہو گا۔" سیکورٹی ڈائریکٹر نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"شاید یرغمال کے طور پر وہ ہمارے بدلے کوئی بڑا مطالبہ کریں گے۔" پلاننگ آفیسر نے کہا۔

"شاید".... سیکورٹی ڈائریکٹر نے ٹھنڈی سانس لی۔ اور پھر وہ دونوں چونک کر سامنے دیکھنے لگے۔ چار آدمی ان کی طرف آ رہے تھے' وہ چاروں سیاہ فام تھے۔ آنے والوں کو دیکھ کر ان کی روحیں قبض ہونے لگیں اور پھر وہ چاروں ایک پنجرے کے قریب پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک نے پنجرے کا دروازہ کھولا اور سیکورٹی ڈائریکٹر کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ سیکورٹی ڈائریکٹر خاموشی سے باہر نکل آیا اور وہ اسے لئے ہوئے ایک طویل راہداری سے گزر کر ایک دروازے پر پہنچ گئے اور پھر وہ دروازے سے ایک ہال میں داخل ہو گئے۔ سیکورٹی ڈائریکٹر منہ پھاڑے ہال کا منظر دیکھ رہا تھا۔

کسی ہسپتال کا چھوٹا سا آپریشن تھیٹر معلوم ہو رہا تھا۔ چاروں سیاہ فاموں نے اسے ایک سفید رنگ کی میز پر لٹا کر کس دیا۔ سیکورٹی ڈائریکٹر وحشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

"ک.... کیا کر رہے ہو تم لوگ؟" اس نے خوف سے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"وہی...... جو تم کر چکے ہو؟" سیاہ فام نے زہریلے لہجے میں کہا اور پھر میز کے پاس سے ہٹ گیا۔ سیکورٹی ڈائریکٹر کے حواس گم ہوئے جا رہے تھے۔ پھر ایک طرف کا دروازہ کھلا اور اس سے ایک خوفناک مخلوق اندر گھس آئی۔ سیکورٹی ڈائریکٹر کے حلق سے ایک گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس طویل القامت گوریلے کو دیکھ رہا تھا۔ گوریلے کے پیچھے چند سیاہ فام نرسیں ایک بڑی ٹرالی گھسیٹتی ہوئی لا رہی تھیں جس میں نہ جانے کیا کیا رکھا ہوا تھا۔ گوریلا اس کے بالکل قریب پہنچ گیا اور پھر ایک ماسک چہرے پر چڑھا لیا۔ اس کے بعد ایک اور ٹرالی اسٹریچر لایا گیا جس پر ایک کتا بندھا ہوا تھا۔

سیکورٹی ڈائریکٹر پاگل پن کی حدود میں داخل ہو گیا تھا۔ اس کا ذہن یہ سب

کچھ برداشت نہیں کر رہا تھا۔ گوریلا اس کے پاس سے ہٹ کر کتے کے پاس پہنچ گیا۔ پھر اس نے اوزار اٹھائے اور کتے کی کھوپڑی کا آپریشن کرنے لگا۔ سیکورٹی ڈائریکٹر تھوک نگلتے ہوئے اس خوفناک گوریلے کو کام کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

☆☆ ☆☆

تیرہ دن تک اخبارات عجیب عجیب قیاس آرائیاں کرتے رہے۔ خصوصی پولیس نے درجنوں جگہوں پر چھاپے مارے۔ بہت سے بے گناہ کو پکڑ کر ان پر مظالم کی انتہا کر دی تھی لیکن ابھی تک کوئی سراغ نہیں پا سکی تھی۔ پورے ملک میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ اغوا ہونے والے ملک کے ستون تھے۔ ان کا نقصان کسی طور پر برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔

پھر چودھویں روز پولیس ہیڈ کوارٹر کو ایک چونکا دینے والی اطلاع ملی۔ سیکورٹی ڈائریکٹر پر اسرار طور پر اپنے مکان کی خواب گاہ میں پہنچ گئے تھے۔ ان کی سوگوار مسز، صبح کو جاگیں تو وہ ان کے برابر کے بستر پر موجود تھے۔ آن کی آن میں یہ اطلاع بجلی کے کرنٹ کی طرح دوسرے محکموں تک دوڑ گئی۔ اور بڑے بڑے افسروں کی گاڑیاں سیکورٹی آفیسر کی رہائش گاہ پر پہنچ گئیں۔ سیکورٹی ڈائریکٹر کی مسز نے ان سب کا استقبال کیا تھا۔ وہ بے حد خوش نظر آ رہی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ ڈائریکٹر صاحب گہری نیند میں سو رہے ہیں۔ انہیں جگانے کی کوشش نہیں کی گئی۔

افسران کا انتظار کرنے لگے۔ کافی دیر کے بعد ایک ملازم دوڑا ہوا آیا اور اس نے اطلاع دی کہ ڈائریکٹر صاحب جاگ اٹھے ہیں۔ لیکن وہ ایک ایک کو دیکھ کر منہ سے "کوں کوں" کر رہے ہیں۔ شاید ان کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے۔

افسران خواب گاہ کی طرف چل پڑے جب وہ خواب گاہ میں داخل ہوئے تو انہوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ڈائریکٹر صاحب چاروں ہاتھوں پیروں کے بل کھڑے ہوئے تھے اور اپنی بچیوں کے سامنے کوں کوں کر رہے تھے۔ وہ شاید

تصوراتی دم ہلانے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کا پچھلا حصہ باقاعدگی سے مٹک رہا تھا۔ انہوں نے افسران کی طرف دیکھا اور ان کے ہونٹ چڑھ گئے۔ وہ زور زور سے غرانے لگے اور پھر انہوں نے اگلے دونوں ہاتھ اٹھا کر زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا۔

افسران گھبرا کر دروازے پر ہی رک گئے۔ وہ پھٹی پھٹی سی نگاہوں سے سیکورٹی ڈائریکٹر کو دیکھ رہے تھے اور پھر انہوں نے ایک دوسرے کی شکل دیکھی۔ ڈائریکٹر کی اہلیہ کا چہرہ بھی دھواں دھواں ہو گیا تھا۔ پھر کچھ افسران گہری سانس لے کر ایک دوسرے سے کانا پھوسی کرنے لگے تھے۔ پھر ان میں سے ایک ڈاکٹر کو فون کرنے چلا گیا۔ اسی دن کی دوسری اطلاع اس سے بھی زیادہ چونکا دینے والی تھی۔

پولیس کے کچھ نوجوانوں نے پلاننگ کمیشن کے سیکریٹری مسٹر آؤ جر کن کو یک سڑک سے پکڑا تھا۔ مسٹر آؤ جر کن منہ میں ایک ہڈی دبائے سڑک پر سرپٹ ڑ رہے تھے۔ ان کے پیچھے بچوں کی ایک ٹولی لگی ہوئی تھی جو ہنستی قہقہے لگاتی رہی تھی۔ پولیس کے نوجوانوں نے جب مسٹر آؤ جر کن کو پکڑا تو وہ زور زور سے ن پر بھونکنے لگے۔ انہوں نے کئی نوجوانوں کی کلائی پر کاٹا بھی تھا۔

حکومت بوکھلا اٹھی۔ ایک ہی نوعیت کے دونوں کیس تھے۔

لیکن بات یہیں ختم ہوئی اٹامک انرجی کمیشن کے سربراہ مسٹر گولبے بھی پس آ گئے تھے اور پورے گھر میں "میاؤں میاؤں" کرتے پھر رہے تھے۔ انہوں ے باورچی خانے میں رکھا ہوا گوشت منہ میں دبایا تھا اور مسہری کے نیچے گھس گئے ے۔ وہاں وہ دونوں ہاتھوں میں گوشت دبا کر دانتوں سے نوچتے رہے تھے۔ روالے انہیں مسہری کے نیچے سے نکالنے میں کسی طور پر کامیاب نہ ہوئے تھے۔

بیسویں دن تک آخری اغوا شدہ آدمی بھی واپس آ گیا۔ ان سب کو ایک وصی ہال میں جمع کر دیا گیا اور ڈاکٹروں کی کئی ٹیمیں ان کا معائنہ کر رہی تھیں۔ ان

میں کوئی کتے کی طرف بھونکتا، کوئی بلی کی طرح میاؤں میاؤں کرتا، کوئی دنبے کی طرح ڈکرتا۔ عجیب مضحکہ خیز صورت حال تھی لیکن حکومت کے ذمہ داروں کے دل ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ اس کیفیت سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے تھے۔ ڈاکٹروں کی ٹیم کے ایک خصوصی اجلاس میں مشترکہ معائنے کے بعد اعلان کر دیا گیا کہ ان لوگوں کے دماغ بدل دیئے گئے ہیں۔ ان سب کے ذہنوں کے آپریشن کر دیئے گئے ہیں اور پھر یہ متفقہ فیصلہ حکومت تک پہنچا دیا گیا اور حکومت کے ایوان ہلنے لگے۔

تب اکیسویں دن وزیر داخلہ کو ایک خط ملا۔ ایک آدمی یہ خط لے کر آیا تھا جو وزارت داخلہ ہی کا ایک ممتاز رکن تھا۔ اس نے بتایا کہ علی الصبح کوئی اس کے چوکیدار کے پاس آیا اور اسے یہ خط دیتے ہوئے کہا کہ اسے اپنے مالک تک فوراً پہنچا دے۔ حکومت کا خط ہے۔ بہرحال وزیر داخلہ نے خط کھولا اور پھر وہ خط کی تحریر پڑھ کر سکتے میں رہ گئے۔

لکھا تھا

"غاصب اور بدکردار انسانو! میں ڈاکٹر فیاض جالی! تم سے مخاطب ہوں۔

"تم نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ میں تمہارے ان ساتھیوں کو پوری زندگی اسی طرح رہنے دوں۔۔ لیکن میں آج بھی انسانیت بہی خواہ ہوں۔ میں اب بھی نہیں چاہتا کہ تمہارے ساتھی زندگی بھر بلی کتوں ک زندگی گزاریں۔ چنانچہ میں تم سے ایک سودا کرنا چاہتا ہوں۔ ان دونوں ڈاکٹروں میرے حوالے کر دو، جنہوں نے میرا دماغ تبدیل کیا تھا۔ میرا جسم انہیں دے دو تا وہ آپریشن کر کے مجھے میرا دماغ واپس دے دیں۔ اگر تم نے میرا جسم تلف کر ہے۔ تو پھر یاد رکھو! میں تمہارے ساتھیوں کے دماغ ضائع کر دوں گا جو میرے پا محفوظ ہیں۔ دوسری صورت میں اپنا جسم حاصل کرنے کے بعد میں ان لوگوں محفوظ دماغ تمہارے حوالے کر دوں گا۔

تمہیں یہ بھی احساس ہو گا کہ میں ٹھیک ہونے کے بعد تمہارے کرتوت دنیا پر واضح کر دوں گا۔ لیکن میں کسی کو تمہاری حرکت کے بارے میں نہیں بتاؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ میں اس کام کے لئے تمہیں صرف تین دن دے رہا ہوں۔ کل صبح کے اخبارات میں تم ایک چھوٹا سا اشتہار دے دو۔ جس میں تمہیں اپنی منظوری کا اظہار کرنا ہے۔ ایک سیاہ حاشیے کے اندر لفظ "منظور ہے" لکھ دو اور وقت لکھ دو میں فون پر تم سے رابطہ قائم کر لوں گا۔

ڈاکٹر فیاض جالی" ایک بار پھر کھلبلی مچ گئی۔ دو گھنٹے کے اندر اندر ملک کے بڑے بڑے افسران وزارت داخلہ کے کانفرنس ہال میں جمع ہو گئے سب کے رنگ اڑے ہوئے تھے۔

بادل نخواستہ طے کیا گیا فوری طور پر ایک طیارہ ڈاکٹر فیاض کے ملک جائے اور وہاں سے ڈاکٹر کے جسم کو لے آئے۔ پھر دونوں ڈاکٹروں کو ان کے کہنے کے مطابق ان کے حوالے کر دیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ وہ ان سے پورا تعاون کریں۔ یہ بحث چھوڑ دی گئی تھی کہ ڈاکٹر فیاض نے یہ سب کچھ کیسے کیا؟ ان کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔

ان سنسنی خیز واقعات کے پورے ایک ماہ کے بعد ڈاکٹر فیاض جالی مقامی حکام کے ساتھ ایئرپورٹ پہنچ گئے۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرا رہے تھے۔ ان کے ساتھ آنے والوں کے چہرے ندامت سے لٹکے ہوئے تھے۔

"ہم آپ سے وعدے کی پابندی کی امید رکھتے ہیں ڈاکٹر۔" پروٹوکول آفیسر نے دبی زبان سے کہا۔

"یقیناً"......میں ایک باوقار ملک کا باشندہ ہوں۔ طیارے کے پرواز کرنے کے ٹھیک سات گھنٹے کے بعد ان لوگوں کے دماغ تمہیں مل جائیں گے کیونکہ اس وقت میں اپنے ملک کی حدود میں داخل ہو چکا ہوں گا۔" ڈاکٹر فیاض نے حقارت

آمیز مسکراہٹ سے کہا۔
"ہم آپ سے کوئی دغا بازی نہیں کریں گے ڈاکٹر۔" "میں جانتا ہوں تم اے
نہ کرنے پر مجبور ہو۔" ڈاکٹر نے حقارت سے کہا کوئی کچھ نہ بولا۔
"آپ اپنا دوسرا وعدہ بھی یاد رکھیں گے ڈاکٹر؟" "ہاں' ہاں۔ مجھے تما
وعدے یاد ہیں' فکر نہ کرو" ڈاکٹر نے کہا اور پھر وہ طیارے کی سیڑھیوں کی طرف
بڑھ گئے۔ پروٹوکول آفیسر اور دوسرے لوگ ہاتھ ہلا رہے تھے۔ انہوں نے ہاتھ ہل
کر کے لہرایا لیکن یہ الوداعی پیغام رن وے پر کھڑے ہوئے لوگوں کے لئے نہیں
تھا۔ بلکہ دور عام لوگوں کی گیلری میں کھڑے ہوئے آرماک کے لئے تھا' جس کی
سے ڈاکٹر نے اپنی کھوئی ہوئی زندگی واپس حاصل کر لی تھی۔ آرماک نے ان
احسان کا بھرپور صلہ دیا تھا۔

برف کے قیدی

قید کے دن قید کی راتیں ہزاروں داستانوں کی راتیں ہیں۔ عمر رفتہ پر نگاہ
ڈالنے کے لئے زندگی کے ایک ایک واقع کو یاد کرنے کے لئے اس سے عمدہ اور
کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ میں برطانوی فوج کا ہندوستانی میجر تھا جنگ عظیم کے سات
سال سات صدیوں کی مانند گزرے تھے۔ نجانے کہاں کہاں سرگرداں رہا نجانے
کہاں کہاں جرمنوں سے جنگ کی تھی۔ بالاخر ان کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا۔ غالباً یہ
انیس سو بیالیس کی بات ہے پورا سال جرمنوں کی قید میں گزار چکا تھا۔ نئے سال کی
پہلی تاریخ کو ایک سو بارہ قیدی ٹرانسپورٹ طیاروں میں بھر کر کسی نا معلوم مقام کو
روانہ کر دیئے گئے۔ میرے ساتھیوں میں دو ہندوستانی تھے۔ کچھ برطانوی بلجیم کے
ہند باشندے تھے کچھ فرانسیسی تھے اور کچھ افریقی ہم سب ایک دوسرے سے نا آشنا
تھے۔ اس ٹرانسپورٹ طیارے میں ایک دوسرے سے شناسائی کسی طور ممکن نہیں
تھی۔ بھیڑ بکریوں کی طرح ہم لوگ تنگ جگہ میں بھرے ہوئے تھے۔ لیکن ہماری
منزل آگئی۔ یہ ایک ویران پہاڑی علاقہ تھا۔ کس جگہ تھا اس کے بارے میں شاید
ان ایک سو بارہ قیدیوں میں سے کسی کو معلوم نہیں تھا۔ ہم لوگ کیمپوں میں
گزرنے والی زندگی کے بارے میں اچھی طرح جانتے تھے۔ یہاں بھی دھوپ سے
بنی ہوئی لکڑی کی بیرکوں میں ہمیں منتقل کر دیا تھا جن کے اطراف خار دار تاروں کی
باڑھ تھی۔ دوسرے ہی دن ہمیں معلوم ہوگیا کہ ہمیں یہاں مزدوروں کی حیثیت
سے لایا گیا ہے اور یہاں اس علاقے میں ہمیں ایک رن وے تیار کرنا ہے بہت سے
بڑی پہلے سے اس جگہ موجود تھے ان میں رن وے تیار کرنے کے ماہرین بھی تھے
نہیں ہمارا سربراہ مقرر کر دیا گیا۔ اور اس کے بعد کام کا آغاز ہوگیا۔

ایک جرمن افسر نے غلط سلط انگریزی میں لمبی چوڑی تقریر کر کے ہمیں
بتایا کہ اس رن وے کو ہمیں مختصر عرصہ میں تیار کرنا ہے۔ اور اس کی تکمیل ہماری
زندگی کی ضامن ہے۔ جرمن افسر نے یہ بھی کہا کہ خوراک کی کمی کی وجہ سے ان
دنوں یہ ہدایت جاری کر دی گئی ہیں کہ فالتو گھاس کاٹ دی جائے اور خوراک بچائی
جائے۔ تم لوگ فالتو گھاس کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہو گے لیکن رن وے
کی تعمیر و تکمیل تمہاری زندگی کی ضمانت دے گی اور تمہیں اس کے معاملے میں
زندگی دی جائے گی کوئی بھی فالتو گھاس کی مانند کتنا پسند نہیں کرتا تھا اور اس کے
لیے بہترین طریقہ کار یہی تھا کہ رن وے کی تعمیر میں پوری پوری دلچسپی لی جائے۔

قیدیوں کی زندگی سخت افسردگی اور بے چینی کے عالم میں گزر رہی تھی
سب کے چہرے قیدیوں کے چہرے نظر آ رہے تھے اور ان کے لئے اتنے ہی الفا
کافی تھے۔ سارا دن شدید دھوپ اور سخت تپش میں کام کرنا پڑتا تو شام تک ا
سکت ہی نہ رہتی کہ ایک دوسرے سے گفتگو کی جائے لیکن رفتہ رفتہ جب ہم ا
موسم کے عادی ہو گئے تو قیدیوں میں تھوڑی سی زندگی بیدار ہوئی۔ لیکن اپنی
کے بارے میں وہ ایک ہی تاثر کا اظہار کرتے تھے۔ وہ یہ کہ اب موت ہی انہیں
اس قید سے نجات دلائے گی۔ سب کے انداز میں مایوسی پائی جاتی تھی۔

دو ہندوستانی قیدیوں میں سے ایک، ایک چٹان اڑاتے ہوئے حادثے
شکار ہو کر مر گیا تھا۔ دوسرا اس کا سگا بھائی تھا، وہ شدید بیمار ہو گیا تھا اور کوئی بھی
اس کی موت کا لمحہ بن سکتا تھا۔ دوسرے لوگ اکثر ایک دوسرے سے ملاقات
کرتے تھے اور دل بہلانے کی کوشش کرتے تھے۔ کرنل جے تھامس بہت نفیس
انسان تھا اور کچھ ایسے لوگوں کا شناسا جنہیں میں بھی جانتا تھا۔ چنانچہ اس کی ا
میری گاڑھی چھن رہی تھی۔ اکثر جے تھامس کہتا۔

"اگر ہمیں اسی قید میں مرجانا ہے مسٹر کریم خان تو کیوں نہ یہاں سے

کی کوشش کریں"۔

"یعنی فرار"۔ میں نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"ہاں، جو ہم قیدیوں کی زندگی ہے"۔

"کاش یہ ممکن ہوتا"۔

" ہر ناممکن کو ممکن بنانا پڑتا ہے۔ ورنہ ناممکن ، ناممکن ہی رہتا ہے "میں
نے پھیکی سی ہنسی کے ساتھ جے تھامس کی بات ٹال دی تھی۔ بھلا ان نامعلوم
علاقوں سے فرار کس طرح ممکن تھا اور جرمنوں کا اصول بھی مجھے معلوم تھا۔ وہ کسی
مفرور کو زندگی دینے کے قائل نہیں تھے۔ وہ کسی مفرور کو زندگی دے کر الجھنوں
میں پھنسنا نہیں چاہتے تھے۔

اکثر اس طرح کے واقعات دوسرے کیمپوں میں پیش آئے تھے۔ ایک دو،
میں، میں نے بھی دلچسپی لینے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ان کے نتائج میرے لئے
انتہائی بھیانک تھے جن کی وجہ سے میں نے اپنے آپ کو خدا کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا
میں زمیندار گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ والد صاحب کو خان بہادر کا خطاب ملا ہوا
تھا۔ پھر جب برطانوی فوج کو جان فروشوں کی ضرورت ہوئی تو بھلا خان بہادر کا لڑکا
ان میں شریک کیوں نہ ہوتا۔ مجھے میری مرضی کے خلاف فوج میں بھیج دیا گیا تھا اور
میں نے اس مستقبل کو اپنا لیا تھا اور اس کے بعد یہ بات بھول گیا تھا کہ میں اپنی
مرضی کے خلاف فوج میں شامل ہوا ہوں۔ بہت سے لوگ تھے بہت سے شناسا تھے
بہت سی یادیں تھیں۔ جنہیں قید کی زندگی میں لاتعداد مرتبہ یاد کر چکا تھا۔ لیکن ان
سے کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا بے شمار قیدیوں سے فرار کے موضوع پر گفتگو ہوئی۔
لیکن سب ہی کے چہرے لٹک جاتے تھے۔ کسی میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس
پرہول ویرانے سے نکل جانے کی کوشش کرے لیکن ایک رات میری زندگی میں
بھی انقلاب آیا۔

وہ بوسیدہ سے لباس میں ملبوس عجیب سے چہرے والا نوجوان تھا۔ نجانے کس طرح میری بیرک میں داخل ہو گیا تھا اور میرے نزدیک ہی لیٹ گیا تھا۔ رات کے دوسرے پہر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ نوجوان دراصل کوئی عورت ہے۔ ایک نوجوان اور پرکشش عورت' جس نے رات کی تنہائیوں میں مجھے اچھی طرح خود سے روشناس کرا دیا۔ لیکن بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ان کیمپوں میں عورت کا وجود نہیں تھا۔ لیکن یہ حسین دلکش اور نوجوان عورت مجھے تو کوئی بد روح معلوم ہوئی تھی۔ لیکن اس کی کوئی بھی حرکت بد نہیں تھی۔ رات کے چوتھے پہر اس نے مجھ سے کہا۔

"اگر تم اس بات کے خواہشمند ہو کہ ہماری یہ خلوتیں حسین اور تابناک بن جائیں تو تمہیں فرار میں میرا ساتھ دینا ہو گا۔ اس عورت کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ مجھے اس وقت احساس ہوا تھا۔ جب میں نے کسی حد تک مایوسی کا اظہار کیا تو اس نے مجھے غیرت دلاتے ہوئے کہا کہ میں فرار ہونے میں تنہا نہیں ہوں گا۔ بلکہ کچھ اور جیالے بھی میرے ساتھ ہی ہوں گے رات کے آخری پہر وہ چلی گئی۔ لیکن واقعہ کے تیسرے دن کرنل جے تھامس نے آہستہ سے مجھ سے کہا۔

"ہم لوگ فرار ہونے کا منصوبہ بنا چکے ہیں۔"

"اوہ کرنل کس طرح۔"

"یہ بات ابھی منظر عام پر نہیں آئی ہے۔ لیکن ایک انوکھا واقعہ ہوا ہے جس کی وجہ سے میں تیار ہو گیا ہوں۔"

"کیا واقعہ۔؟" میں نے پوچھا۔

"اس روز میں اپنی بیرک میں تنہا تھا۔ رات کے تقریباً پونے دو بجے تھے کہ میں نے اپنے قریب ایک انسانی وجود کو محسوس کیا اور یہ صنف مخالف کا وجود تھا

یک انتہائی دلکش اور خوبصورت عورت تھی وہ۔ اس نے مجھے تیار کر لیا کہ میں زار کے منصوبے میں اس کا ساتھ دوں۔"

میں حیرت سے کرنل جے تھامس کی صورت دیکھتا رہ گیا تھا۔ پھر میجر یڈورڈ نے بھی وہی کہانی سنائی اور اس کے بعد دوسرے چند افراد نے بھی جن میں ائلٹ اینڈریو بھی تھا۔ ہم لوگ بالکل ایک جیسے واقعات کا شکار تھے لیکن دلچسپ ات یہ تھی۔ کہ کسی نے دوسرے کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اس سے پہلی رات وہ خود س واقعہ سے دوچار ہو چکا ہے۔ ہم سب ایک دوسرے کی باتوں پر مسکراتے تھے یکن فرار کا منصوبہ بہرحال پایہ تکمیل کو پہنچ گیا تھا۔ رن وے کی تیاری مکمل ہونے و تھی اور جو منصوبہ کرنل جے تھامس کی زبانی دوسرے لوگوں تک پہنچا۔ وہ یہ تھا کہ رن وے کے پہلے آزمائشی دن جب ایک طیارہ اس رن وے پر اترے گا۔ تو ینڈریو اسے اڑانے کے لئے تیار ہو گا۔ جے تھامس ایسا ماحول پیدا کر دے گا کہ یارے تک رسائی ہو سکے' باقی افراد اس کے لئے دوسری تمام چیزوں کا انتظام کریں گے الغرض یہ منصوبہ انتہائی ذہانت اور ہوشیاری سے پایہ تکمیل کو پہنچا اور خری رات جس کی دوسری صبح جرمن ٹرانسپورٹ طیارے کی آمد متوقع تھی وہی ورت ہم سب سے آملی' اس نے اپنا نام جینس بتایا۔ اس سے زیادہ اس نے کچھ کہنے سے انکار کر دیا تھا کہ وہ خود بھی ہمارے ساتھ فرار کے منصوبے میں شریک ہو گی۔ علی الصبح ہم آپریشن کے لئے اپنی بیرکوں میں تیار تھے۔ ایڈورڈ نے بہت سی یٹن گنیں اور دستی بم حاصل کر لئے تھے جو ہمارے مقصد کی تکمیل کے لئے تھے۔ ہمارے کام بیان کرنا تو آسان محسوس ہو رہا ہے۔ لیکن جس انداز میں ہمیں انجام ینا پڑے ہم ہی جانتے ہیں۔

طیارہ صبح سوا سات بجے رن وے پر اترا اور اس کا تالیوں کی گونج میں خیر قدم کیا گیا۔ لیکن اس کے فوراً بعد ہی تالیاں بجانے والے خاک وخون میں ڈوب

گئے پائلٹ اینڈریو نے طیارے کا کنٹرول سنبھال لیا ایک اور نوجوان کو پائلٹ بنا او
باقی تمام لوگ جن کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ گولیاں اور بم برساتے ہوئے باآلاخر
طیارے میں داخل ہوئے۔ طیارے کا انجن اسٹارٹ ہوا اور نیچے آگ اور دھوئیں
کے بادل چھوڑ کر ہم فضا کی بلندیوں میں پرواز کر گئے۔

کرنل جے تھامس کے پاس نقشہ موجود تھا یہ فرار ہمیں بہت حیرت انگیز
لگ رہا تھا۔ لیکن بہر طور اب ہمارا طیارہ فضا کی وسعتوں میں محو پرواز تھا۔ بشرطیکہ
دوسرے جہاز اس کا تعاقب نہ کریں۔ لیکن یہ کس طرح ممکن تھا دو جرمن فائٹرز ار
ٹرانسپورٹ طیارے کا تعاقب کرنے لگے اور اینڈریو اپنی فضائی مہارت استعمال کر
کے انہیں چکر دیتا رہا۔ لیکن ہم لوگ راستہ بھٹک گئے تھے۔ اور اب ہمارے چاروا
طرف برف ہی برف پھیلی ہوئی تھی۔ پتہ نہیں خطہ زمین کے کون سے علاقے میر
تھے۔ لیکن یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم برف کی دنیا میں سفر کر رہے ہوں۔

جرمن فائٹر شائد کسی خاص وجہ سے واپس چلے گئے تھے۔ کیونکہ کافی د
سے ہمیں ان کی صورت نظر نہیں آئی تھی۔ لیکن پھر اینڈریو کی خوفزدہ آواز۔
ہمارے دل دہلا دیئے اس نے فیول ختم ہونے کا اعلان کیا تھا اور کہا تھا کہ اب
طیارے کو یہیں اتارنا پڑے گا۔ خواہ اس کا نتیجہ کچھ بھی ہو۔

علاقہ بالکل ویران تھا۔ ہر رخ سے سمندر کی جانب ڈھلوان، گلیشیر، سمند
کی طرف کھسکتے جا رہے تھے اور ان کی وجہ سے سمندر کی سطح پر بڑی بڑی مہیب
دراڑیں پڑ جاتی تھیں ان دراڑوں پر کہیں برف کی ہلکی ہلکی تہیں جم گئی تھیں جنکی
وجہ سے یہ بے حد خطرناک تھیں۔ یہ سطح اتنی کمزور تھی کہ اگر اس کے کسی حصے پ
پاؤں پڑ جاتا تو وہ ٹوٹ سکتی تھیں، یہ دراڑیں گلیشیئر کی مسلسل حرکت کیوجہ سے بنتی
اور بگڑتی رہتی ہیں۔ اینڈریو نے جب طیارہ اس علاقے میں اتارا تو دودھیا رنگ کی
دبیز کہر پھیلی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے زمین کے نشیب و فراز نظر نہیں آرہے

ھے۔ اوپر نیلا اور صاف آسمان تھا اور نیچے سفید کہر ایک جمے ہوئے سمندر کی مانند
ظر آئی تھی۔ لیکن اینڈریو۔۔ ہر خطرے کو مول لینے کا فیصلہ کر چکا تھا کیونکہ اس
ے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ لیکن نیچے اترتے ہوئے وہ اس کہر کی وجہ سے صحیح
لندی کا اندازہ نہیں لگا سکا۔ یکایک جہاز کو زبردست جھٹکا لگا اور اس کا دایاں بازو
یک برفانی تودے سے ٹکرا گیا۔ گڑگڑاہٹ کی شدید آواز بلند ہوئی اور لیفٹیننٹ
یڈورڈ اپنی نشست سے اچھل کر گر پڑا میجر مکلیش کھڑکی کے شیشے سے ٹکرا کر باہر
ف پر جا گرا اور اس کی دونوں کلائیاں ٹوٹ گئیں۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی
ی طرح کے واقعات پیش آئے تھے۔

کو پائلٹ شکستہ کیبن سے گھسٹتا ہوا باہر نکلا لیکن باہر کا منظر دیکھ کر اس کے
ش اڑ گئے۔ طیارہ جس تودے سے ٹکرایا تھا اس کے قریب ہی ایک انتہائی گہرا
ہ منہ کھولے جہاز کو نگلنے کے لئے تیار تھا اور طیارے کی دم کے پاس ایک اور
اڑ بنتی جا رہی تھا اور طیارہ آہستہ آہستہ دڑے کی جانب پھسل رہا تھا۔

بمشکل تمام ہوش و حواس بحال کئے گئے تو اس خوفناک بات کا انکشاف ہوا
ر ماہرین جہاز سے باہر نکل آئے۔ انہوں نے صورتحال کا جائزہ لینے کے بعد اس
ت کا اعلان کیا کہ جہاز کے غار میں گرنے کا کوئی امکان نہیں ہے کیونکہ وہ برف
ا بری طرح دھنس گیا ہے۔ اس طرح تھوڑا بہت سکون ہوا۔ زخمیوں کو ٹوٹے
ئے جہاز کے اندر لے آیا گیا تھا۔ تاکہ سرد ہوا اور برف سے بچاؤ ہو سکے۔ جو
مان باہر گر گیا تھا اسے بھی اندر لے آیا گیا۔

ٹرانسپورٹ طیارے میں اس برفانی جہنم سے بچاؤ کا بہت معقول بندوبست
ل تھا لیکن خوش بختی یہ تھی کہ وہ یہاں موجود فوجیوں کے لئے تحائف لے کر آیا
جو کھانے پینے کی چیزوں اور دوسری اشیا کی شکل میں تھا اور ہم نے اسے اسی
ت میں اغوا کر لیا تھا۔ جہاز کا وائرلیس ٹوٹ چکا تھا اور اب ہمارے پاس نہ تو

روشنی کا کوئی انتظام تھا اور نہ ہی کوئی اور ایسی شے جس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا۔ سب سے ہولناک بات یہ تھی کہ ہمیں اس جگہ کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں تھا۔ منجمد کر دینے والی ہوائیں طیارے کے کھلے حصوں سے ٹکرا ٹکرا کر اندر داخل ہو رہی تھیں۔ چنانچہ اس سے بچنے کے لئے ترپال کے ٹکڑوں سے کھلے ہوئے حصے اچھی طرح ڈھک دیئے گئے۔ پیراشوٹوں کے انبار اپنے جسموں کے گرد لپیٹ لئے گئے تاکہ بدن گرم رہ سکیں لیکن اس کے باوجود برف کے باریک ذرات جہاز کے ہر سوراخ اور دراڑ سے اندر آرہے تھے۔

ہم ایک دن اور ایک رات اسی طرح جہاز کے اندر قیام پذیر رہے۔ جینس ہمارے ساتھ تھی۔ جب موسم کسی قدر صاف ہوا تو ہم نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ لیکن صورت حال بڑی مایوس کن تھی۔ چاروں طرف برفانی سطح پر ناقابل عبور دراڑیں بکھری ہوئی تھیں اور جہاں تک نظر جاتی' برف کا بیکراں سمندر نظر آتا۔ ہم یہ اندازہ بھی نہیں لگا سکے کہ کسی مناسب جگہ پہنچنے میں کتنا وقت لگ سکتا ہے۔ لیکن بہرحال متفقہ طور پر فیصلہ کیا گیا کہ اس جہاز میں زندگی نہیں گزاری جا سکتی بلکہ زندگی کی تلاش میں سفر کرنا ہی پڑے گا اور اس کے بعد ہم لوگ باہر نکل آئے۔ لمبی چوڑی دراڑیں منہ پھاڑے ہمیں نگلنے کے لئے تیار تھیں۔ بہت کوشش کے بعد ایک طرف سے ایک مخدوش سا راستہ ملا جو ان دراڑوں کی زد سے باہر تھا اور ہم اسی سمت چل پڑے۔

لیکن یہ ہماری خام خیالی تھی۔ ابھی ہمارے سفر کے آٹھ گھنٹے پورے بھی نہیں ہوئے تھے۔ ہم ایک قطار کی شکل میں چل رہے تھے۔ آخری آدمی ایڈورڈ تھا۔ وہ باتیں کرتا ہوا چلا آرہا تھا اس سے آگے میں اور پائلٹ اینڈریو تھے۔ ہمارے آگے میجر مکلفشن اور جے تھامس اس سے آگے جینس اور دوسرے چند افراد چل رہے تھے کہ دفعتاً ایڈوڈ کی ہلکی سی آواز سنائی دی اور ہم پلٹ کے دیکھنے لگے لیکن

ایڈورڈ غائب تھا اور جہاں اب سے کچھ دیر پہلے ہم لوگ موجود تھے وہاں ایک غار منہ کھولے موجود تھا۔ ہمارے بدن دہشت سے سن ہو گئے۔ میں نے جلدی سے پیٹ کے بل لیٹ کر اس گڑھے میں جھانکا۔ نیلی برف اس کے اندر دور تک نظر آ رہی تھی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا اور ایڈوڈ کو تلاش کرنے لگا۔ دفعتاً گہرائیوں میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایڈورڈ ایک چٹان سے ٹکرا کر رک گیا ہے اور ہاتھ پاؤں پھیلائے پڑا ہے میرے ساتھی اینڈریو نے چیخ چیخ کر دوسرے افراد کو اس حادثے کی اطلاع دی اور ہم سب ایڈورڈ کی جان بچانے میں مصروف ہو گئے۔ پیراشوٹ کی رسیوں سے ایک مضبوط رسہ بنایا گیا اور اسے گہرائیوں میں لٹکا دیا گیا۔ یہاں تک کہ رسہ ایڈورڈ تک پہنچ گیا۔ ایڈورڈ کی کاروائی اب ہم صاف دیکھ سکتے تھے۔ رسے کا ایک پھندہ اس نے کمر میں باندھا اور دوسرا کلائی میں اور اس کے بعد ہمارے ساتھیوں نے اسے کھینچنا شروع کر دیا۔ ایک ایک فٹ کر کے ہم نے اسے تقریباً سو فٹ اوپر کھینچا۔ لیکن اب ایک اور مصیبت آ پڑی۔ اس گہرے کنوئیں کا منہ چھوٹا تھا اور برف کی ایک چٹان آگے جھکی ہوئی تھی۔ ایڈورڈ کو کھینچنے کے دوران برف کی چٹان سے کٹ گئی اور اب ایڈورڈ اس چٹان کے عین نیچے آ کر رک گیا۔ اسے مزید اوپر نہیں کھینچا جا سکتا تھا کیونکہ سر پر لٹکی ہوئی برف کی چٹان راستہ روکے ہوئے تھی۔ جے تھامس نے مشورہ دیا کہ ایڈورڈ کو تھوڑا اور نیچے لٹا دیا جائے تاکہ وہ چٹان سے کچھ اور دور ہو جائے پھر ایک رسی میں چھرا باندھ کر ایڈورڈ کے پاس پہنچا دیا گیا اس چھرے کی مدد سے ایڈورڈ نے آہستہ آہستہ وہ چٹان کاٹی جو اس کے اوپر آنے کا راستہ روکے ہوئے تھی اور اسے باہر کھینچ لیا گیا۔

لیکن اس حادثے نے سب کے حوصلے پست کر دیئے تھے۔ چنانچہ سب ہی پژمردہ نظر آنے لگے تھے اور یہ تو ابتداء تھی۔ آگے نجانے ہمارے لیے کیا کیا تھا۔ چنانچہ سب ہی ہمت ہار گئے اور واپس اس غار نما جگہ کو پھلانگ کر

طیارے کی طرف چل پڑے۔

برفانی طوفان مسلسل اپنا رنگ دکھا رہا تھا۔ جے تھامس کے پاؤں میں برف کی ٹھنڈک کی وجہ سے کچھ تکلیف ہو گئی تھی لیکن بہر حال کسی نہ کسی طرح وقت کاٹا گیا ہمارے ایک ساتھی ریڈیو آپریٹر نے شکستہ ریڈیو کو اس قابل بنا لیا تھا کہ اس سے کسی اتحادی پارٹی سے بات کی جا سکے‘ ہم لوگوں نے انتہائی محنت کے بعد آگ جلانے کے ایسے بندوبست بھی کر لئے تھے۔ جس سے برف میں جمی ہوئی خوراک کو قابل استعمال بنایا جائے۔ یوں کئی تاریک اور بھیانک راتیں گزر گئیں۔ ہم سب ایک دوسرے سے چپکے لاشوں کی مانند پڑے رہتے جینس عموماً خاموش ہی تھی اور کسی سے کوئی گفتگو نہیں کرتی تھی۔ سب لوگ اس کے ساتھ گزارے ہوئے حسین لمحات کو بھول گئے تھے۔

بہر طور طوفانی ہواؤں کے دباؤ سے طیارے کی کیلیں ٹوٹنے کی وحشتناک آوازیں ابھرنے لگیں اور رفتہ رفتہ طیارے کا پچھلا دھڑ اگلے سے علیحدہ ہو کر گڑھے کی جانب پھسلنے لگا۔ اس خوفناک عذاب سے بچنے کے لئے ہم نے اسے رسیوں اور تاروں کی مدد سے باندھا اور عارضی طور پر اسے روکنے میں کامیاب ہو گئے۔ ریڈیو آپریٹر اب ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر سگنل لے رہا تھا۔ غالباً اس برف زار میں قیام کے ساتویں دن کی بات ہے کہ ہم نے ایک جہاز دیکھا۔ لیکن سخت برفانی موسم کی وجہ سے ریڈیو کنٹرول پر اس سے رابطہ قائم نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم لوگ مایوس ہو گئے جہاز ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اسی دوران طوفان زوروں پر آ گیا اور انتہائی خوفناک تباہی پھیلی جس میں ہم اپنے دو آدمیوں کو کھو بیٹھے۔ لیکن بہر طور ان تمام ہولناک واقعات سے نمٹنا ہی تھا جو کچھ بھی ہو گا دیکھا جائے گا۔ ہم زندگی سے بیزار ہوتے جا رہے تھے کبھی کبھی تو دل چاہتا تھا کہ خود کو اسی حال میں چھوڑ کر موت کا انتظار کریں۔ لیکن ایسے موقعوں پر جینس مردانہ وار

ی ہو جاتی تھی وہ ہم مردوں کو بزدلی کا طعنہ دیتی اور خود ہمیں چھوڑ کر آگے بڑھ
ی میجر ایڈورڈ ہمیشہ اس کا ساتھ دیتا تھا۔ اور اس کے بعد سب ہی سنبھل جاتے
نئے سرے سے زندگی کی جدوجہد کا آغاز کر دیتے۔ پھر ایک اور بھیانک شام
جینس آگے آگے چل رہی تھی کہ دفعتاً اس کے قدموں کے نیچے برف نکلی اس
ادھر ادھر سہارہ لینا چاہا لیکن ہاتھوں چڑھے دستانوں کی وجہ سے کناروں پر
فت نہ کر سکی اس کے حلق سے ایک دل خراش چیخ نکلی اور پھر اوپر سے منوں
پھسل کر اس دراڑ میں گرنے لگی آن کی آن میں جینس برف کی اتھاہ گہرائیوں
دفن ہو چکی تھی۔

اس حادثے نے ہمیں نڈھال کر دیا۔ سب ہی مایوس ہو گئے تھے لیکن
ت کے آخری حصے میں دفعتاً" میجر ایڈورڈ کی چیخوں سے ماحول گونج اٹھا اس پر
شت کا دورہ پڑا تھا وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر جینس جینس چلا رہا تھا۔ شائد اسکا ذہنی
زن بگڑ گیا تھا۔ لیکن پھر جو کہانی اس نے سنائی اس نے ہمارا ذہنی توازن خراب کر
۔ اس نے کہا۔ "کسی زمانے میں جینس میری بیوی تھی ہم دونوں کے درمیان
ید محبت تھی اور ہماری شادی محبت کا نتیجہ ہی تھی لیکن پھر ہمارے درمیان
وٹے چھوٹے اختلافات ہوئے۔ زیادتی میری ہوتی تھی بیشک زیادتی میری ہوتی
ی۔ جینس کچھ دن برداشت کرتی رہی پھر وہ بپھر گئی اور ہمارے درمیان طلاق ہو
ئی جینس مجھ سے الگ ہو گئی کچھ دن تک وہ الگ رہی لیکن پھر اس نے مجھ سے
اقات کی اور کہا کہ میں اسے معاف کر دوں وہ میرے بغیر نہ رہ سکے گی۔ میں نے
ے نفرت سے ٹھکرا دیا اور پھر میں اپنی کمپنی کے ساتھ نہ جانے کہاں کہاں پہنچا اور
نیس کو بھول گیا۔ لیکن وہ مجھے نہ بھول سکی۔ صرف میری وجہ سے اس نے بھی
وج میں شمولیت اختیار کی اور مجھے تلاش کرتی رہی۔ پھر ایک ایسی جگہ وہ جان بوجھ
کر گرفتار ہوئی جہاں میں بھی قیدی تھا اور وہ کیمپ میں آ گئی۔ اس نے مجھ سے کہا

کہ وہ مجھے نکال کرلے جائے گی میں خود بھی اس قید سے فرار چاہتا تھا لیکن ہمت نہ
تھی۔ اس نے کوششیں شروع کردیں نہ جانے کیا جادو کیا اس نے لوگوں پر کہ فرا
کے لئے بہت سے لوگ تیار ہو گئے۔ اس نے ہر شخص میں ایک نئی روح پھونک د
تھی اس کا عزم تھا۔ کہ وہ میری زندگی بچائے گی۔" لیکن ایڈورڈ پھوٹ پھوٹ ک
رونے لگا۔ ہم سب ساکت رہ گئے۔ ہم میں سے ہر شخص جانتا تھا کہ جینس نے ک
طرح ہمیں اس فرار کے لئے تیار کیا تھا۔ لیکن کون زبان کھولتا اسی وقت آخری پ
میجر جینس جینس پکارتا ہوا دوڑ پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے برف کی کہر میں داخل ہو گیا
اس کہانی اور اس المناک واقعے نے ہمارے دلوں کو بے حد افسردہ کر دیا تھا۔ لیک
تقدیر کے کھیل نرالے ہوتے ہیں۔ پانچویں دن کی بات ہے کہ ایک سپلائی طیا
ہمیں اپنے سروں پر منڈلاتا ہوا نظر آیا۔ اس پر اتحادی نشان بنا ہوا تھا۔ ا
طیارے نے ہمارے لئے سامان خوردونوش اور ضرورت کی دوسری چیزیں گرائ
جن کے حصول کے بعد ہماری جان میں جان آئی اور سفر میں قدرے آسانی ہو گ
اس کے بعد طیارہ سارا دن وقفے وقفے سے ہمارے سر منڈلاتا رہا۔ ایک بار ا
نے ہمیں ایک تحریری پیغام بھی دیا جن میں بتایا گیا کہ ہیلی کاپٹر کا بندوبست کیا جا
ہے۔ ہم یکجا اور محتاط رہیں دوسرے دن صبح دس بجے فضا میں ہیلی کاپٹر نظر آیا ا
ہمیں اٹھا کر ایک امدادی کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میجر ایڈو
دوڑتا ہوا نہ جانے کس طرح امدادی کیمپ تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے وہاں ہمار
کہانی سن کر مدد کی درخواست کی تھی لیکن اس پر نمونیے کا شدید حملہ ہوا تھا۔ ا
وہ بچ نہیں سکا تھا۔

روح کا سفر

میں نے جرائم کی دنیا کس طرح اپنائی یہ ایک طویل کہانی ہے اور ان بیشمار
کہانیوں سے مختلف نہیں ہے جو مجھ جیسے انسانوں سے منسوب ہوتی ہیں۔ تعارف
ے طور پر اتنا بتا دوں کہ میرا تعلق ایک شریف لیکن غریب گھرانے سے ہے اور
ے والدین نے بھی دوسرے لوگوں کی طرح اپنی اولاد کو بڑا آدمی بنانے کی
شش کی۔ یہ چھوٹے لوگ اپنی اولادوں کو بڑا بنانے کے لئے جو جتن کرتے ہیں
اپ کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہوں گے۔ لیکن بہت کم خوش نصیب ہی ایسے
تے ہیں جو اپنی ان کوششوں میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ورنہ عام طور سے ان کی
جہد کی داستان ان کی قبر کے کتبوں پر کندہ ہوتی ہے اور وہ اس جدوجہد میں
ہو کر قبر کی گہرائیوں کو اپنا لیتے ہیں۔

میرے باپ نے بھی مجھے بڑا بنانے کے لئے اپنی زندگی چھوٹی کرلی۔ سخت اور
ل جدوجہد نے اسے ٹی بی کا مریض بنا دیا اور وہ اپنے بیٹے کے مستقبل کا خون
ے تھوک کر ہلاک ہو گیا۔ اس کے بعد اس بیٹے کے خون تھوکنے کی باری ہوتی
سو میں نے بھی ابتداء میں خون تھوکا۔ لیکن بہت جلد میرا مرض دور ہو گیا۔
رافت کا مرض بھی عجیب ہوتا ہے۔ آدمی کو بالکل ناکارہ کر دیتا ہے کسی کام کا
رہتا کمبخت۔

لیکن مجھے حکیم احمد خان مل گیا۔ ماہر جیب تراش' نقب زن۔ چھوٹے
ٹے جرائم کا ماہر۔ لوگ اسے کچھ بھی کہتے ہوں لیکن میں اسے اپنا حکیم ہی تصور
اہوں۔ اس نے میری ناکامی کا مرض دور کر دیا اور مجھے اپنی لائن پر لگا لیا۔
ابتداء میں نے ان چھوٹے چھوٹے کاموں سے کی۔ لیکن احمد خان جاہل تھا
م تعلیم یافتہ۔ پھر میں اس سے زیادہ ذہین کیوں نہ ہوتا پھر میں نے اپنی ذہانت

سے جرائم کی نت نئی راہیں نکالیں اور لوگوں کے لباس ٹٹولنا چھوڑ دیئے ۔ گھروں
میں گھسنا چھوڑ دیا۔ میں دوسرے جرائم کرتا تھا ۔ ایسے جرائم جن میں ذہانت کارفرما
ہوتی تھی ۔ اور بہرحال ایک درمیانہ درجے کی زندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہو
گیا تھا۔

لیکن ایک بدقسمتی تھی جب عیش کی زندگی ملی تو تنہا رہ گیا تھا ۔ ماں بھی مرگ
اور اس دنیا میں ماں کے علاوہ میرا اور کوئی نہیں تھا ۔ چنانچہ زندگی کسی قدر بے م
ہوگئی تھی پھر میں نے اس بدمزگی کو دور کرنے کے سہارے تلاش کئے ۔ اور ن
جانے کیوں تقدیر میرے اوپر مہربان ہوگئی ۔

میری اس تقدیر کا نام پٹریشا تھا ۔ مقامی عیسائی لیکن رنگ و روپ انگریزو
کی مانند سنا ہے اس کی ماں چھ سال انگلینڈ میں رہی ۔ ایک ہسپتال میں نرس تھی
وہاں سے آئی تو پٹریشا اس کے ساتھ تھی اور اس کا سیاہ فام باپ جوزف اپنی ا
پھول سی بچی کو دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا ۔ لندن سے لائے ہوئے تحفوں میں ا
اپنی بیوی جینا کا تحفہ سب سے زیادہ پسند تھا ۔

بہرحال مجھے پٹریشا کے ماضی اس کے خاندان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔ مج
تو پٹریشا سے پیار تھا اور وہ دل و جان سے مجھے چاہتی تھی ۔ کیوں نہ چاہتی میں ا
کے پورے خاندان کی پرورش کر رہا تھا ۔ بی اے تک تعلیم میں نے ہی تو مکمل کر
تھی ورنہ اس کا باپ جوزف شراب پینے کے علاوہ اور کوئی کام کرنے کے قابل
کہاں تھا۔

ابتداء میں اپنی ذہانت سے میں نے پٹریشا کو اپنے کاروبار کے بارے میں
نہیں معلوم ہونے دیا ۔ لیکن محبوب سے بھی کوئی بات چھپائی جاتی ہے ۔ میں
اسے سب کچھ بتا دیا ۔ میرا خیال تھا کہ پٹریشا سخت پریشان ہو جائے گی ۔ رو رو کر
سے کہے گی کہ میں برائی کے راستے چھوڑ دوں ۔ کہیں کسی مصیبت کا شکار نہ
جاوں ۔" لیکن پٹریشا ایک روشن خیال لڑکی تھی ۔ وہ دقیانوسی اور فر

ایات سے دلچسپی نہیں رکھتی تھی ۔ اس نے کہا ۔ "ٹھیک ہے مسعود۔ اس دنیا کا
دہ ایسے ہی چلتا ہے ۔ تم کوئی انوکھا کام نہیں کر رہے ۔"

"تو۔ تو پٹریشا۔ تم۔ تم اس بات پر مجھ سے ناراض نہیں ہوئیں ۔" ؟ میں
خوشی کے عالم میں کہا۔

"میں جاہل نہیں ہوں مسعود ۔ اس دنیا کو بہت قریب سے جانتی ہوں ۔ ہاں
ایک بات ضرور کہوں گی ۔ وہ یہ کہ خود کو محفوظ رکھ کر کام کیا کرو۔"

"اس سلسلہ میں تم فکر مت کرو۔"

"میں خود بھی زندگی کے اس رخ سے دلچسپی رکھتی ہوں ۔ اگر تمہیں کبھی
ذہین ساتھی کی ضرورت محسوس ہو تو میں..."

"تو۔ تو گویا پٹریشا۔" ؟ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"تو میں تمہارے ساتھ کام کرنے کو تیار ہوں ۔" پٹریشا نے جواب دیا۔

"واقعی۔" ؟ میں نے خوشی کے عالم میں پوچھا۔

"خلوص دل سے ۔"

خوشی اور دو دو ۔ حسین محبوبہ اور حسین ساتھی۔ میں نے اس حسین ساتھی
پورا پورا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اور پٹریشا کو اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ میں
اس کی حیثیت ہمیشہ محفوظ رکھی۔ میں نے اسے خطرناک کاموں میں استعمال نہیں
۔ لیکن اس سے ایسے کام لیتا رہا جن میں اس کی ذات براہ راست کبھی ملوث نہ
ں نے اسے ایک نمایاں مقام دیا۔ خود اس سے دور رہ کر اسے سوسائٹی کا ایک
مقام دیا۔ اور اس اعلیٰ مفاد کو اپنے مفاد میں دوسرے طریقے سے استعمال کیا۔
چھوٹے سے سلسلہ میں پٹریشا نے میری ضمانت بھی کرائی لیکن میں ذرا کم ہی
والوں میں سے ہوں ۔

تو یہ ہے میرا اور پٹریشا کا تعارف ۔ ہر انسان کی زندگی یوں تو واقعات اور
ات کا مجموعہ ہے اور پھر خاص طور سے ہم جیسے لوگوں کی تو بات ہی اور ہے ۔

ہماری زندگی کافی تیز ہوتی ہے۔ عام زندگی گزارنے والے لوگوں کی کہانیاں مخ
ہوتی ہیں۔ بس ایک ڈگر پر چلنا لیکن ہم۔

"ہاں تو میں اپنی زندگی کا ایک اہم واقعہ سنانے جا رہا ہوں۔ بلاشبہ یہ ک
میری اور پٹریشا کی زندگی کی انوکھی کہانی ہے۔

ان دنوں کوئی خاص مصروفیت نہیں تھی۔ پٹریشا کے پاس ایک خوبصورت
تھی۔ ایک حسین بنگلہ تھا۔ اس کا ایک چھوٹا سا کاروبار تھا۔ یہ ساری چیزیں ا
میں نے مہیا کی تھیں۔ لیکن میں خود ایک درمیانہ درجے کے فلیٹ میں رہتا تھ
کرائے کا تھا۔ یہاں عام سا فرنیچر تھا اور یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ لوگ م
طرف سے مشکوک نہ ہوں۔

میں اور پٹریشا اکثر لمبی ڈرائیونگ پر نکل جاتے تھے اس کے والدین کو مے
اس ساتھ پر کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوا کیونکہ میں نے ان کی زندگی بنا دی تھی۔

تو اس رات ہم گلرنگ پوائنٹ سے واپس آ رہے تھے۔ یہ اعلیٰ در
ریستوران تھا جس میں اعلیٰ درجے کے لوگ ہی جاتے تھے۔ رات کے تقریباً
بارہ بجے تھے۔ سرشام ہی ہم ایک کلب پہنچ گئے تھے اور وہاں کی تفریحات میں
لیتے رہے تھے۔ پٹریشا ڈرائیونگ کرتے کرتے ہولے ہولے گنگنا رہی تھی کہ ا
اس کی گنگناہٹ رک گئی اور اس کے ساتھ ہی کار کی رفتار بھی سست ہو گئی۔

"کیا ہے۔" میں نے چونک کر پوچھا۔

"شاید کوئی حادثہ۔"؟

"کیا مطلب۔"؟ میں نے آنکھیں پھاڑ کر سڑک پر دیکھا۔ کار کچھ اور
بڑھ گئی اور روشنیاں ایک وجود کو اجاگر کرنے لگیں جو سڑک کے درمیان پڑ
تھا۔ "اوہ۔ شاید کوئی اسے ٹکر مار کر چلا گیا۔"

"ہاں۔ برائیوں کی مختلف اقسام ہوتی ہیں"۔ پٹریشا نے کہا اور کار کنار
کے روک دی۔ پھر دونوں دروازے کھول کر نیچے اتر گئے۔

"اگر کوئی اس وقت ہمیں دیکھ لے تو اس کے علاوہ اور کچھ نہیں سوچے گا
ہم نے ہی اسے زخمی کیا ہے۔"

"بلاشبہ۔ لیکن اس خوف کی وجہ سے اسے چھوڑا تو نہیں جا سکتا۔ ممکن ہے
ں سے گزرنے والے دوسرے لوگوں نے بھی اسے دیکھا ہو اور یہی سوچ کر آگے
گئے ہوں کہ کہیں کوئی مصیبت ان کے گلے نہ پڑ جائے۔" پٹریشا نے جواب

اس دوران ہم سڑک پر پڑے شخص کے قریب پہنچ گئے اور پھر اس پر جھک
۔ لیکن۔ وہ کسی کار یا کسی دوسری سواری کے حادثے کا زخمی نہیں تھا۔ کوئی
ی بات تھی۔ یقیناً کوئی اور ہی بات تھی۔ اس کے بدن پر عمدہ تراش کی پتلون
قمیض تھی۔ دونوں پاؤں سمٹے ہوئے تھے ایک ہاتھ سینے پر تھا دوسرا ہاتھ پھیلا
تھا۔ پھیلے ہوئے ہاتھ پر موٹی رسی کا ایک پھندا نظر آ رہا تھا پاؤں کے نزدیک
الر کا ایک نوٹ پڑا ہوا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور وہ گہری گہری سانس لے رہا

"زندہ ہے۔" پٹریشا نے سرسراتی آواز میں کہا۔

"ہاں۔ لیکن زخمی نہیں معلوم ہوتا۔"

"ممکن ہے پشت پر زخم ہو۔" پٹریشا نے کہا اور میں نے جیب سے دستانے
کر ہاتھوں میں پہن لئے۔ پھر میں نے اسے پلٹ کر دیکھا۔ لیکن کمر پر بھی کوئی
نہیں نظر آ رہا تھا۔ اور نبض بھی معمول کے مطابق چل رہی تھی۔

"اب۔"؟ میں نے سوال کیا۔

"اسے یہاں تو نہیں چھوڑ سکتے۔"؟

"ظاہر ہے جب اتنا کیا ہے تو اسے کسی ہسپتال تک پہنچانے کی کوشش بھی کی
۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"ایک بات کہوں مسعود۔"؟

"ہاں کہو۔"

"میرے خیال میں اسے ہسپتال لے جانا حماقت ہے۔ کوئی زخم وغیرہ تو نہیں۔ سانس بھی نارمل ہے۔ رسی اور نوٹ پراسرار ہیں۔ ممکن ہے کسی ساز شکار ہوا ہو اور۔ اور صرف بیہوش ہو۔ ان حالات میں ہم الجھن میں پھنس ہیں۔"

"پھر"؟ میں نے وہاں بھی پڑیشا کی بات سے اختلاف کیا۔

"کیوں نہ اسے گھر لے چلیں۔ ہوش میں آنے کا انتظار کریں گے۔ ہے اس سے کچھ معلوم ہو جائے۔" پڑیشا نے تجویز پیش کی۔

"او کے پڑیشا۔ تم کار کا دروازہ کھولو میں اسے ہاتھوں پر اٹھا کر لاتا ہوا میں نے کہا اور پڑیشا نے گردن ہلادی۔ اور پھر اس نے جھک کر نوٹ اور عجیب و غریب پھندا اٹھایا لیا اور پڑیشا کار کی طرف بڑھ گئی۔

میں نے جھک کر نوجوان کو اٹھایا۔ درمیانہ جسامت کا ایک اسمارٹ تھا۔ مجھے اسے اٹھانے میں دقت نہیں ہوئی۔ پڑیشا نے عقبی دروازہ کھول د میں نے احتیاط سے اسے پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ اور پھر خود اس کے نزدیک ہی تاکہ اسے سنبھال سکوں۔ پڑیشا نے اسٹیرنگ سنبھال لیا تھا۔

"چلوں مسعود۔"؟

"ہاں جلدی چلو۔ کہیں عقب سے کوئی دوسری کار نہ آجائے۔" کہا اور پڑیشا نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

"تمہیں اس کے جسم پر کسی زخم کا احساس تو نہیں ہوا۔" میں نے پوچھا۔

"بظاہر تو بالکل نہیں ہے۔"

"بظاہر سے کیا مراد ہے۔"؟

"ممکن ہے کوئی اندرونی چوٹ ہو پڑیشا۔" میں نے اور پڑیشا

سکوڑتے ہوئے گردن ہلا دی۔

"اوہ۔ ہاں اس امکان کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔" اس نے کہا تھا۔

"تمہارے پاس ابتدائی طبی امداد کا سامان تو موجود ہوگا پڑیشا۔"؟

"ہاں۔ کیوں نہیں۔"

"ہم اسے ہوش میں لانے کی کوشش کریں گے۔"

"ضرور۔ لیکن قصہ کیا ہو سکتا ہے۔ اور مسعود اس مکان کا تم جائزہ تو لو کہ رسی کے پھندے سے اس کی گردن دبانے کی کوشش تو نہیں کی گئی۔"؟ پڑیشا نے اچانک کہا اور میں بھی چونک پڑا۔ یہ بات قرین قیاس ہو سکتی تھی۔ لیکن اندھیرے میں اس کا اندازہ لگانا بھی مشکل تھا۔ گردن کے نشانات تو ہم روشنی میں ہی دیکھ سکتے تھے۔" میں نے اپنی ناکامی کا اعلان کیا۔

"ہاں اس طرح مشکل ہے۔ مجھے فوراً احساس ہو گیا تھا۔"؟ پڑیشا مسکراتی ہوئی بولی۔

"کیوں"۔؟

"میرا مطلب ہے تمہاری ممی اور ڈیڈی۔"

"ڈیڈی تو۔ جیسا کہ تمہیں پتہ ہے نشے میں دھت پڑے رہتے ہیں۔ رہیں ممی تو وہ ہمارے کسی معاملے میں دخل نہیں دیتی۔"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن کوئی ایسا موقع کبھی آیا بھی نہیں۔"

"تو اس بات کی فکر کیوں کرتے ہو۔"

"نہیں فکر کی بات نہیں ہے۔ بس ایسے ہی سوچ رہا تھا۔ دراصل فلیٹ اس معاملے میں بالکل بیکار جگہ ہے۔ وہاں تو کوئی راز راز رہ ہی نہیں سکتا۔ سب ایک دوسرے کی کھوج میں لگے رہتے ہیں کہ کون کیا کر رہا ہے۔"

"میرے ایک پڑوسی تو تقریباً ہر تیسرے دن میرا انڑویو لیتے رہتے ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیسا انٹرویو۔"؟ پٹریشا نے پوچھا۔

"یہی کہ میں کیا کرتا ہوں۔ کتنی آمدنی ہے۔ کاروبار کیسا چل رہا ہے۔ والدین کونسے گاوں میں رہتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔"

"انہیں تم سے کیا دلچسپی پیدا ہو گئی۔"؟

"بھتیجی کی وجہ سے۔"؟

"کیا مطلب۔"؟

"کوئی بھتیجی ہے ان کی۔ اور اس کے والد ریکروٹنگ ایجنٹ ہیں۔ آج شادی کرو کل دوبئی چلے جاو۔ کئی بار کہہ چکے ہیں۔"

"وہ اپنی بھتیجی کو دوبئی کیوں نہیں بھیج دیتے۔ ویسے ڈارلنگ میں تم سے کئی بار کہہ چکی ہوں کہ فلیٹ چھوڑ دو۔"

"اور میں کئی بار تمہیں اس کا جواب دے چکا ہوں۔ تمہارے ساتھ رہ کر میں تمہاری شخصیت کو مشکوک نہیں کرنا چاہتا۔ بس میں چاہتا ہوں کہ پہلے تم خوب دولتمند بن جاو تاکہ ایک دولت مند لڑکی سے شادی کرکے میری زندگی بھی آرام سے گزرے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا اور پٹریشا بھی ہنسنے لگی۔ اسی وقت میں نے نوجوان کی کراہ سنی اور چونک پڑا۔

"اوہ۔ یہ ہوش میں آ رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"اچھا ہے۔ ہم بھی پہنچ چکے ہیں۔" پٹریشا نے جواب دیا اور تھوڑی دیر کے بعد ہماری کار بنگلے کے پورچ میں رک گئی۔ میری نگاہیں نوجوان پر تھیں جو اپنی گردن مسل رہا تھا اور اب پوری طرح ہوش میں معلوم ہوتا تھا۔

"کار رکی تو وہ اچھل پڑا۔ اس نے وحشت زدہ نگاہوں سے مجھے دیکھا اور پھر اچانک اٹھنے کی جدوجہد کرنے لگا۔

"اوہ۔ بدحواس نہ ہو تم دشمنوں میں نہیں ہو۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"تم۔ تم مجھے مجبور نہیں کرسکتے۔ تم مجھے۔ میں تم سے کمزور نہیں ہوں۔"

وہ خوفزدہ لہجے میں بولا۔ اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"طاقتور آدمی میں تم سے طاقت آزمائی نہیں کرنا چاہتا۔ میں تو تمہارا مددگار ہوں۔ ہم دونوں نے تمہیں سڑک پر پڑے پایا تھا اور تمہاری امداد کرنے کے خیال سے تمہیں لے آئے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور وہ پھر چونک پڑا۔

"دونوں نے۔"؟ اس نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ میری منگیتر اور میں۔" میں نے جواب دیا اور اس نے گردن گھما کر پٹریشا کو دیکھا تب اس کے چہرے پر کسی قدر سکون کے آثار پھیل گئے۔ وہ عمدہ قسم کی انگریزی بول رہا تھا اور اب اس کے خدوخال سے اندازہ ہوا تھا کہ وہ مقامی باشندہ نہیں ہے۔

"آہ۔ وہ۔ وہ دونوں۔ وہ دونوں۔" اس نے کہا اور پھر دوبارہ گردن مسلنے لگا۔

"ان کی بات کر رہے ہوں جنہوں نے تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی۔" میں نے پوچھا اور اس نے گردن ہلا دی۔

"یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ آو۔ اندر آو۔ پٹریشا نے کہا اور نوجوان میرا سہارا لے کر کار سے نیچے اتر آیا۔ اس کی ٹانگوں میں لغزش تھی۔ اس لئے میں اسے سہارا دیکر اندر لایا۔ اور پٹریشا اسے اپنے بیڈروم سے ملحقہ کمرے میں لے گئی۔ یہاں بستر موجود تھا۔

اس نے کمرے کی روشنیاں جلائیں اور نوجوان سے بستر پر لیٹ جانے کو کہا۔

"نہیں شکریہ۔ میں بیٹھوں گا اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔" اس نے کہا اور ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ٹھہرو۔ میں تمہارے لئے برانڈی لاتی ہوں۔" پٹریشا نے کہا اور مجھے وہاں رکنے کا اشارہ کرکے باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ برانڈی کی بوتل اور گلاس لے کر اندر آ گئی۔ اس نے نوجوان کو برانڈی دی اور وہ ایک ہی دفعہ اسے حلق

میں اتار گیا۔ پھر پیاسی نگاہوں سے بوتل کو دیکھنے لگا۔

"اور لو گے۔"؟ پٹریشا نے پوچھا اور اس نے گردن ہلا دی۔ تب پٹریشا نے اسے اور برانڈی دی۔ اس بار نوجوان نے اس کے چھوٹے چھوٹے سپ لئے تھے۔ پھر وہ ہونٹ خشک کرتا ہوا بولا۔

"میں۔ تم دونوں کا۔"

"شکر گزار ہوں۔ کیوں۔ یہی کہو گے نا۔"؟ پٹریشا مسکرا کر بولی۔

"ہاں۔ تم لوگوں نے بے لوث میری مدد کی ہے۔ جبکہ جبکہ اس ملک میں میں نے بڑی بے حسی پائی ہے۔ کوئی کسی کا ہمدرد نظر نہیں آتا۔"

"تم مقامی تو نہیں ہو۔"

"نہیں۔ میں یورپ کا باشندہ ہوں۔"

"ہمارا بھی یہی خیال تھا۔ اب تمہاری حالت کیسی ہے۔"؟

"اب ٹھیک ہوں۔" انہوں نے میری گردن میں رسی کا پھندا ڈال کر مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی لیکن۔ پھر دور سے ایک کار کی روشنیاں نظر آئیں اور وہ فرار ہو گئے۔"

"شکر ہے وہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ کیا تمہیں پولیس کی مدد درکار ہے۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں ہمدرد انسانو۔ تمہارا شکریہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ پولیس سے لوں۔"

"اوہ۔ کیوں۔"؟

اس لئے کہ۔ کہ میں بھی کوئی اچھا انسان نہیں ہوں۔" نوجوان نے ٹو. لہجے میں کہا۔

"کیا میں تمہیں اور برانڈی دوں۔"؟ پٹریشا نے ہمدردی سے کہا۔

"نہیں شکریہ۔"

"کیا تم اپنا تعارف کرانا پسند کرو گے۔"

"میرا نام الیس ہے۔ الیس جم۔"

"خوب۔ یہ پٹریشا ہیں اور میرا نام مسعود ہے۔" میں نے کہا اور اس نے مننونگاہوں سے ہم دونوں کو دیکھتے ہوئے گردن خم کر دی۔

"الیس۔ میرا خیال ہے اب تم اس بات سے آگاہ ہو گئے ہو کہ ہم نے ۔ انسانی رشتے کے تحت تمہاری مدد کی ہے اور اس میں کوئی لالچ پنہاں نہیں ۔ ہر انسان جستجو کا مریض ہوتا ہے اور ہم دونوں بھی اس مرض سے الگ نہیں ۔ ہمارے ذہنوں میں تمہارے بارے میں جاننے کا اشتیاق ہے۔ لیکن اس کے ود ہم تمہیں اجازت دیتے ہیں کہ اگر اپنے بارے میں نہ بتانا چاہو تو نہ بتاؤ۔ یں مجبور نہیں کیا جائے گا۔"

"آہ۔ میں تم لوگوں کا شکر گزار ہوں۔ تم نے واقعی میرے اوپر احسان کیا ۔ ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ واپس آتے اور۔ اور الیس نے خوف سے آنکھیں کرلیں۔

"لیکن انہوں نے تمہیں رسی سے ہلاک کرنے کی کوشش کیوں کی۔"؟

"غیر مسلح تھے لیکن ہر قیمت پر مجھے قتل کرنا چاہتے تھے۔"

"تعجب ہے۔ لیکن اس کے پس پردہ کوئی کہانی ہو گی۔"؟

"ہاں۔ لیکن تم۔ تم لوگ۔"؟

"ہاں کہو۔ رک کیوں گئے۔"؟

"دیکھو دوستو۔ میں خلوص دل سے کہہ رہا ہوں کہ میں تمہیں اپنی کہانی ضرور سناؤں گا لیکن۔ لیکن۔"

"ہاں ہاں الیس آگے کہو۔"

"تم مجھے پولیس کے حوالے نہیں کرو گے۔"

"اوہ۔ لیکن کیوں۔ ہم ایسا کیوں کرنے لگے۔"؟

"کیونکہ مجھے غیر قانونی طور پر یہاں لایا گیا ہے۔"

"لایا گیا ہے۔"؟

"ہاں۔ میرا پاسپورٹ وغیرہ بھی نہیں ہے۔ پہلے مجھے مڈل ایسٹ میں لایا گیا اور پھر یہاں اسمگل کر دیا گیا۔"

"اوہ۔ لگتا ہے جیسے تم کسی خطرناک گروہ کے چکر میں پھنسے ہوئے ہو۔"؟

"ہاں میرے دوست' ایسی ہی بات ہے۔" ایلس گہری سانس لے کر بولا۔

"ٹھیک ہے ایلس ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمہیں نہ تو پولیس کے حوالے کریں گے اور نہ کسی کو تمہارے بارے میں بتائیں گے ہم تمہاری بھرپور مدد کریں گے اور تمہارے ساتھ ہر تعاون کریں گے۔ یہ تعاون غیر مشروط ہے۔" میں نے کہا۔

"تعجب ہے۔ تعجب ہے۔"

"کیوں۔"؟

"اس ملک میں مجھے تمہارے علاوہ کوئی ہمدرد نہیں ملا۔ میں تمہاری اس ہمدردی سے بیحد متاثر ہوا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں ایلس۔ ہاں تمہارے نزدیک ایک سو ڈالر کا نوٹ بھی ملا ہے۔"

"اوہ۔ کیا نوٹ تمہارے پاس موجود ہے۔"؟ ایلس نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں تمہاری امانت۔ یہ لو۔" میں نے نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا اور ایلس اس نوٹ کو بغور دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"یہی نوٹ میری نحوست کے ذمہ دار ہیں۔ آہ میں انہی کا شکار ہوں۔"

"وہ کیسے"؟

"تم روشنی میں اس نوٹ کو دیکھو۔ اس نے نوٹ واپس میری طرف بڑھا دیا۔ اور میں نوٹ کو بغور دیکھنے لگا۔

"کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ایک عام نوٹ ہے۔"

"اصلی ہے۔"؟ اس نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں چونک پڑا۔

"اسے۔ میں نے بنایا ہے۔" اس نے جواب دیا اور میں اور پٹریشا تعجب سے اچھل پڑے۔ پٹریشا نے نوٹ میرے ہاتھ سے اچک لیا اور اسے روشنی میں بغور دیکھنے لگی۔ پھر اس نے شدید حیرانی سے کہا۔

"میرے خدا۔ کوئی باریک سے باریک نگاہ والا یہ بات نہیں کہہ سکتا۔ یہ تو بالکل اصلی معلوم ہوتا ہے۔"

"یہ صرف رنگ اور برش کا کمال ہے۔ یہاں تک کہ وائر لائن جو آپ دیکھ رہی ہیں' برش سے ڈالی گئی ہے۔"

"کمال کی بات ہے۔ واقعی کمال کی بات ہے۔" میں نے تحسین آمیز انداز میں کہا۔

"اب تو تمہارے بارے میں جاننے کا اشتیاق اور شدت اختیار کر گیا ہے۔" پٹریشا مسکراتی ہوئی بولی۔

"ایلس گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔"

کیا یہ بات تمہارے لیے قابل اعتراض نہیں ہے کہ۔ کہ میں جعلی نوٹ بناتا ہوں۔"؟

"نہیں۔ ہم اخلاقیات کے قائل نہیں ہیں۔ دنیا کا کاروبار۔ انوکھے انداز میں چل رہا ہے۔ چند لوگوں کا تعین ہم کیوں کریں۔"

"آپ نے درست کہا۔ میں برطانیہ کی ایک قابل احترام اور معزز فیملی سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرا خاندان بہت اچھا ہے۔ لیکن۔"

"لیکن کیا۔"؟

"لیکن میں اس نیک نام خاندان کا بدنصیب فرد ہوں۔"

"اوہ۔ یہ بد نصیبی۔؟

"وہی بتانے جا رہا ہوں۔ میرے والد مسٹر گراہم لندن کی عدالت کے جج تھے۔ ایک قابل عزت شخص۔ لیکن ان کے دشمنوں نے مجھے چھ سال کی عمر میں اغوا کرلیا۔ وہ میرے والد سے انتقام لینا چاہتے تھے۔"

"اوہ۔ لیکن اس دشمنی کی بنیاد کیا تھی۔"؟

"چند افراد نے ان کے ہاتھوں سے سزا پائی تھی اور ان کے دشمن بن گئے تھے۔"

"اوہ۔ یہ بات تھی۔"

"ہاں مجھے اغوا کرلیا گیا اور مجھے جرائم کے راستے پر ڈال دیا گیا مجھے ہر فن میں طاق کیا گیا۔ میں فطری طور پر مصور تھا لیکن میری فنکارانہ صلاحیتوں کو دوسرا رنگ دیدیا گیا اور اس کا نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔"

"خوب" میں نے گردن ہلا دی۔

"میں نے ہر قسم کا نوٹ ڈیزائن کیا اور انہوں نے کروڑوں روپے کی جعلی کرنسی چھاپی۔ لیکن مجھے اپنے کردار سے نفرت تھی میں ہمیشہ ان کے جال سے نکلنے کے لئے کوشاں تھا۔ اور وہ خاموش ہوگیا۔

"تم نکل بھاگے۔"؟ میں نے سوال کیا۔ اور میرے اس سوال پر اس نے جن نگاہوں سے مجھے دیکھا اس وقت میں ان کا مفہوم نہیں سمجھ سکا تھا۔ لیکن آج میں اس مفہوم سے پوری طرح واقف ہوں۔"

"ہاں۔ میں نکل بھاگا۔"

"اور انہوں نے تمہارا تعاقب کیا۔"

"ہاں۔ وہ خاموش ہوگیا۔"

"میرے ذہن میں ہانڈی پک رہی تھی۔ اتفاق سے ایک ایسا آدمی ہاتھ لگ گیا تھا جو میرے لئے انتہائی کارآمد ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کارآمد انسان سے فائدہ کس طرح اٹھایا جائے۔ وہ بیچارہ تو خود مصائب کا شکار تھا۔

تاہم میں نے کسی جلدبازی سے کام نہیں لیا۔ اور چند ساعت غور کرتا رہا۔ یں نے کہا۔ "تمہاری کہانی سن کر واقعی دکھ ہوا ہے مسٹر ایلس۔ لیکن تمہارا فن ل داد ہے۔"

"مجھے اس فن سے شدید نفرت ہے۔"

"طویل کام ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اسے اس کے لئے تیار کس طرح ا جائے۔"

"ہاں اصل کام یہ سوچنا ہے۔ ہم سوچیں گے۔ ہمارے ذہن اتنے کند نہیں ں۔ اس کے لئے ہمیں اس کے ساتھ بہترین سلوک کرنا چاہیے تاکہ اخلاقی طور پر ہمارا گرویدہ ہو جائے۔" پڑیشا نے کہا اور میں گردن ہلانے لگا۔

بہرحال اس کے بعد دیر تک میں پڑیشا کیساتھ رہا ہم دونوں مختلف انداز سے وچتے رہے اور پھر سارے کام دوسرے دن پر ملتوی کرکے میں اپنے فلیٹ پر چلا یا۔ لیکن دوسری صبح میں نے ناشتہ پڑیشا اور ایلس کے ساتھ ہی کیا تھا۔ ایلس کافی د تک پرسکون نظر آ رہا تھا۔

"جب کسی کام کی تکمیل ہونی ہوتی ہے تو اس کے لئے راستے خود بخود نکل اتے ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب ایلس۔"؟ میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

"طویل عرصہ سے میں ان لوگوں کے چنگل سے نکل جانے کی سوچ رہا تھا۔ یکن ہمت ہی نہیں پڑی۔ یہاں آکر میں نے سوچا کہ اب اس پروگرام کو عملی جامہ پہنا ہی دوں گا۔ اور اس کے لئے میں نے کوشش شروع کر دی۔ پھر جب میں نے عملی قدم اٹھایا تو۔ مجھے سہارے بھی ملتے چلے گئے تم لوگوں کا تعاون میرے لئے جتنا قیمتی ہے میں بیان نہیں کر سکتا۔"

"بلاشبہ۔ ہم آخری حدود تک تمہاری مدد کے لئے تیار ہیں۔" میں نے گفتگو کی اس ابتداء کو غنیمت جانا اور شروع ہوگیا۔

"مجھے یقین ہے۔ اور اس کے لئے میں آپ لوگوں کا بیحد شکر گزار ہوں۔ کاش میں بھی آپ کے لئے کچھ کر سکتا۔"

"ہر کام کے لئے صلہ ضروری نہیں ہوتا ایلس ہم تمہاری بے لوث مدد کرنا چاہتے ہیں۔ اسے اتفاق کہہ لو کہ ہاتھ ہمارے بھی صاف نہیں ہیں چھوٹے موٹے کام ہم بھی کر لیا کرتے ہیں۔"

"تمہاری مراد مجرمانہ کاروائیوں سے ہے۔"؟ اس نے پوچھا۔

"ہاں ڈیئر ایلس۔ میں اس سے انکار نہیں کروں گا۔"

"آہ میرے دوست۔ یہ تمہاری صاف دلی کی علامت ہے۔ معاشرے نے انسان کو اتنا مجبور کر دیا ہے کہ اپنی اچھی فطرت کے باوجود اسے برائیوں کی جانب راغب ہونا پڑتا ہے۔ میں اسے تمہاری مجبوری ہی سمجھتا ہوں ورنہ جو لوگ دلوں میں ہمدردی کا ایسا جذبہ رکھتے ہوں وہ فطری طور پر برے نہیں ہو سکتے۔"

"اب اسے کچھ کہہ لو۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ پھر اچانک ہی میں نے پوچھا۔ "تم ان نوٹوں کے لئے جو رنگ وغیرہ استعمال کرتے ہو کیا وہ آسانی سے دستیاب ہو جاتے ہیں۔"؟

"ہاں۔ زیادہ مشکل پیش نہیں آتی۔"

"ایک نوٹ کی تیاری میں کتنا وقت لگ جاتا ہے۔"؟

"خاصا۔ کیونکہ وہ ماسٹر نوٹ ہوتا ہے پھر اس سے دوسرے رنگوں کی چھپائی ہوتی ہے۔ لیکن تم نے یہ سوال کیوں کیا۔"؟

"اوہ۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ دولت کے حصول کا جذبہ کس دل میں نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ ہم مالی طور پر زیادہ مضبوط نہیں ہیں۔"

"اس کے لئے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ چھپے ہوئے نوٹوں کا ایک بڑا ذخیرہ میری تحویل میں ہے۔ تقریباً ایک کروڑ ڈالر کی مالیت کے نوٹ۔ جنہیں میں نے چالاکی سے ان کے قبضے سے نکال کر پوشیدہ کر لیا تھا۔ یہ نوٹ آج بھی میرے

ہیں۔"

ناشتے پر ہمارے ہاتھ رک گئے۔ پڑیشا کی آنکھوں میں قندیلیں جل اٹھیں
ں۔ لیکن دوسرے لمحے ہم نے خود کو سنبھال لیا اور ناشتے میں معروف ہو گئے۔

"تم نے یہ نوٹ کہاں چھپائے ہوئے ہیں۔"؟

"ایک محفوظ جگہ۔ میں تمہیں وہاں لے جا سکتا ہوں۔"

"عمدہ خبر ہے۔ لیکن اس کے لئے تمہارا کیا پروگرام ہے۔"؟

"دولت"۔ جیسا کہ تم نے کہا کہ دولت کی ضرورت ہر شخص کو ہوتی ہے۔
ھی اپنی زندگی کے لئے دولت ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ نوٹ میرے لئے بھی
حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اگر تم میری مدد کرو تو میں ان میں سے آدھی رقم
ں دینے کو تیار ہوں۔ پچاس لاکھ ڈالر کی رقم کم نہیں ہوتی۔ تم ساری زندگی
عشرت سے گزار سکتے ہو۔"

"ہمیں منظور ہے۔ اور اس کے عوض ہم تمہاری ہر طرح کی مدد کے لئے
ں۔ میں نے اس موقع پر کوئی تکلف مناسب نہیں سمجھا تھا۔

"میں نوٹ تمہارے حوالے کر دوں گا لیکن دوست۔ کیا تم ان نوٹوں کو اس
ں استعمال کر سکتے ہو۔"؟" اس نے پوچھا۔ اور میرے ہونٹ سکڑ گئے۔ "واقعی
ضوع پر نہیں سوچا تھا۔ اگر مقامی کرنسی بھی ہوتی تو یہ کام مشکل تھا۔

"میرا خیال ہے نہیں۔"

"اس کے لئے تمہیں یورپ کا سفر کرنا ہو گا۔"

"ہاں بلاشبہ۔"

"تو پھر کیوں نہ تم میرے ساتھ لندن تک کا سفر کرو۔ وہاں پہنچ کر ہم انہیں
ں گے اور میں اس کام میں تمہاری پوری معاونت کروں گا۔"

"لندن کا سفر۔"؟ میں نے پر خیال انداز میں کہا۔

"ہاں۔ لندن۔ نوٹوں کو تبدیل کرنے کے بعد تم یورپ کے دوسرے ممالک

کی سیر کو نکل جانا۔ زندگی اسی کا نام ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں نے
پٹریشا کی صورت دیکھی۔ پٹریشا کی آنکھوں میں خواب رقصاں تھے۔ تب میں نے
گہری سانس لے کر کہا۔
"مجھے منظور ہے ایلس۔ لیکن کیا تمہیں ان نوٹوں پر پورا بھروسہ ہے۔ کیا ہم
یہ کام آسانی سے کر سکتے ہیں۔"؟
"ہر کام محنت طلب ہوتا ہے۔ نوٹوں کو لندن لے جانے کے لئے تمہیں
شدید محنت کرنا ہوگی۔ رہی ان کے تبدیل ہونے کی بات تو یہ میری ذمہ داری ہے
لیکن ان میں سے کچھ نوٹ تو ہمیں یہیں تبدیل کرانے ہوں گے۔ تمہارے ہاں ڈالر
کا خفیہ کاروبار بھی تو ہوتا ہے۔"
"ہاں چھوٹی موٹی رقم۔ بڑا کاروبار پھنسا دے گا۔ اور پھر اس قدر کھلے پیمانے
پر کام کرنے والی کوئی پارٹی موجود بھی نہیں ہے۔"
"میرا بھی یہی مقصد ہے۔ تم سفر کے اخراجات اور دوسری ضرورتوں کے
لئے تقریباً دس ہزار ڈالر تبدیل کرا لو تاکہ سفر میں ہمیں دقت نہ ہو۔"
"عمدہ خیال ہے۔ لیکن ڈالر کا وہ ذخیرہ کہاں ہے۔؟
"تم جس وقت کہو میں تمہیں وہاں لے جا سکتا ہوں۔ اسے اس جگہ سے
نکال کر محفوظ مقام پر منتقل کرنا تمہارا کام ہے۔" ایلس نے لاپرواہی سے کہا۔ اور
دونوں نے اس کے الفاظ کی سچائی کو پوری طرح محسوس کیا۔
ناشتے کی میز سے اٹھنے کے بعد میری اور پٹریشا کی ایک میٹنگ ہوئی۔
اندازہ لگا چکا تھا کہ پٹریشا ضرورت سے زیادہ خوش اور مسرور ہے۔
"یہ تو۔ یہ تو بڑی عمدہ بات ہوئی۔"
"کیا بظاہر۔"! میں نے سنجیدگی سے کہا۔
"کیا مطلب۔ کیا تم اس پروگرام میں کوئی۔ کوئی۔"؟
"یہ بات نہیں ہے پٹریشا۔ بس دوسرے بہت سے خیالات ہیں۔"

"مثلاً۔"؟
"اس شخص کی سچائی۔"
"کیا وہ مشکوک ہے۔"؟
"بظاہر تو نہیں۔"
"باطن کی گہرائیوں میں کیوں جا رہے ہو مسعود۔ اگر غلط صورت حال پیش
آئے گی تو دیکھا جائے گا۔"
"ہاں یہ درست ہے۔"
"اس کے علاوہ نوٹوں کا معاملہ رہ جاتا ہے۔"
"ہاں یہ بھی تو دیکھنا ہے کہ ان نوٹوں کی کیفیت کیا ہے۔ انہیں تبدیل کرنا
آسان تو نہیں ہوگا۔"
"لیکن۔ یہاں ڈالر کا کاروبار کرنے والے بیشمار لوگ ہیں۔ ان سے رابطہ
قائم کرو جو اس کاروبار کو پردے میں کرتے ہیں کچھ کمیشن ہی تو دینا ہوگا۔"
"ہاں۔ بس یہ سارے کام ہونے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کن بات کہی جا سکتی
ہے۔"
"اور اگر یہ سارے کام پروگرام کے مطابق ہو گئے تو۔"
"تو پھر یورپ کے حسین شہر اور ہم۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور پٹریشا
میری گردن میں جھول گئی۔ وہ تصور سے بیحد مسرور نظر آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر
تک ہم دونوں خوش آئند تصورات میں ڈوبے رہے۔ اور پھر سنبھل گئے۔
"یہ ساری باتیں ایک جگہ مسعود۔ لیکن اب سب سے اہم بات تو سوچو۔"
پٹریشا نے کہا۔
"وہ کیا۔ میں نے سوال کیا۔"؟
"فرض کرو اگر ساری باتیں اپنی جگہ درست نکلتی ہیں اور ایلس کروڑوں
ڈالرز کی رقم ہمارے حوالے کر دیتا ہے تو کیا انہیں استعمال کرنے کے لئے لندن یا

یورپ کے کسی شہر جانا ضروری ہے۔"؟

"کیوں نہیں پٹریشا' یہ بات تو پہلے ہی ہو چکی ہے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے' لیکن انہیں لندن تک لے جانے کے سلسلے میں کیا کیا جائے گا۔"؟

"ہاں۔ یہ تمہارا سوال خاصا اہم ہے۔ اس کے لئے ہمیں کوئی ایسا پروگرام بنانا پڑے گا پٹریشا جو ذہانت سے بھرپور ہو اور جس میں ہمارے پھنسنے کا کوئی امکان نہ رہے۔" میں نے جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے' کیا اتنی بڑی رقم منتقل کرنا کیا آسان کام ہو گا۔"؟

"یقیناً نہیں۔"

"تب پھر۔"؟

"پھر کیا۔ اس کے لئے ہم کوئی ترکیب سوچیں گے۔ اور اگر ہم یہ کام نہ کر سکے تو پھر ہم میں اور عام لوگوں میں کوئی فرق نہ رہ جائیگا۔"

"ٹھیک ہے مسعود' لیکن اس کے لئے خاصی ذمہ داری کے ساتھ کچھ کرنا ہو گا' کوئی ایسا پروگرام' کوئی ایسا کھیل جو انوکھی اہمیت کا حامل ہو۔ نوٹوں کو عام انداز میں اسمگل کرنا میرے خیال میں خاصا پریشان کن رہے گا۔"

"تم اس سلسلے میں فکر مت کرو پٹریشا' سب سے پہلے تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا واقعی ایلس کے بنائے ہوئے نوٹ اتنے مکمل ہیں کہ ہم انہیں باآسانی بازار میں لے جا سکتے ہیں' بھئی بات صرف اس ملک کی نہیں ہے' یورپ میں تو لوگوں کی نگاہیں اور زیادہ تیز ہوتی ہیں وہ اصلی اور نقلی کی پہچان کر سکتے ہیں۔ ان حالات میں۔ میرا مطلب تم سمجھ رہی ہو گی۔"

"ہاں ہاں یقیناً۔"

"تو یہ دوسرا پروگرام تو ہم بعد میں سوچیں گے' سب سے پہلے تو یہ اندازہ لگانا ہے کہ وہ نوٹ کس کنڈیشن کے ہیں اور جس طرح سے یہ نوٹ ہم نے دیکھا' وہ

ب بھی اسی سے ملتے جلتے ہیں یا اس سے مختلف ہیں' اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ رطور ایلس کی سچائی کا اندازہ کرنا بھی ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ تو پھر اس سلسلے میں فوری اقدام کیا کر رہے ہو۔"؟ یشا نے پوچھا۔

"بس جیسا کہ ایلس نے بتایا کہ وہ نوٹ ہماری تحویل میں دینے کو تیار ہے تو ں اس کام پر سب سے پہلے عمل کرنا چاہتا ہوں۔"

"اوہ۔ لیکن کیا تم نوٹوں کا ذخیرہ لے آؤ گے۔"؟

"ہاں پٹریشا۔ دراصل میں اسی انداز میں کام کرنے کا عادی ہوں جب تک ئی چیز اپنی تحویل اپنی گرفت میں نہ ہو۔ میں اس پر بھروسہ نہیں کرتا۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔ تمہاری کامیابی کی یہی دلیل ہے۔" پٹریشا نے مجھ سے اق کرتے ہوئے کہا۔

"بس میں ایلس سے بات کروں گا۔ اگر موقع ملا تو آج ہی۔" میں نے کہا اور یشا مسکرانے لگی۔

"ٹھیک ہے۔" پٹریشا نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"اب مجھے اجازت دو دوپہر کے بعد آؤں گا۔ میرا خیال ہے دوپہر کا کھانا تم ں کے ساتھ کھا لینا۔ میں کچھ ضروری کاموں میں مصروف رہوں گا۔" میں نے کہا ر پٹریشا نے گردن ہلا دی۔

تھوڑی دیر کے بعد میں وہاں سے چلا آیا۔ بلاشبہ میری مجرمانہ زندگی میں اتنا کام مجھے پہلی بار ملا تھا۔ مشکل بھی تھا اور اہم بھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ا سے جو مالی منافع حاصل ہونے والا تھا۔ وہ اتنا تھا کہ میں آئندہ زندگی کے بیس لوں میں بھی اتنا پیسہ نہیں کما سکتا تھا۔ وہاں سے سیدھا اپنے فلیٹ پر واپس آیا' ر اپنے بستر پر دراز ہو کے ان حالات پر غور کرنے لگا۔

میرا ذہن مختلف ترکیبیں سوچ رہا تھا' میں نے اس سلسلے میں ہر بات کو ذہن

میں رکھا تھا۔ ایلس کی سچائی پر شبہ کرنا ذرا احمقانہ سی بات تھی، جس انداز م
مجھے ملا تھا اگر میں اس پر توجہ نہ دیتا تو ظاہر ہے وہ مجھ تک پہنچ ہی نہ سکتا تھا
سوچنا کہ وہ کس پروگرام کے تحت باقاعدہ میرے پاس آیا ہے۔ ذرا بھی ممکن
تھا اور اس کے بعد اس کی کہی ہوئی بات۔ لیکن اس کا فیصلہ بھی جلد ہی ہو جا
اگر وہ نوٹ میرے حوالے کر دیتا۔ گویا اب سارا معاملہ صرف اس بات تک
تھا کہ نوٹ کیا میری تحویل میں آتے ہیں۔ اور اس کے لئے میں نے یہی بہتر
کہ نوٹوں کو پٹریشا کے مکان پر منتقل کردوں، پٹریشا کا مکان ظاہر ہے میری ملکیہ
اور میں جانتا تھا کہ ابھی تک کوئی شخص اس سلسلے میں مشکوک نہیں ہے۔ چنانچ
طرف سے اطمینان تھا۔ بہت دیر تک میں اس بارے میں سوچتا رہا۔ پھر میر
دوسرے معاملات کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ نجانے کب تک میں
خیالات میں ڈوبا رہا اور پھر چونک پڑا۔ گھڑی دیکھی تو شاید حیرت ہوئی۔ کئی گھ
چکے تھے یہ سب کچھ سوچتے ہوئے۔ میں نے لباس تبدیل کیا اور باہر نکل آیا۔
ریسٹورانٹ میں کھانا کھایا، کافی پینے کے بعد وہیں سے پٹریشا کے مکان میں فون
دوسری جانب پٹریشا نے ہی فون ریسیو کیا تھا۔

"ہیلو۔" اس کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو پٹریشا۔"

"ہیلو مسعود۔ کیا حال ہیں۔"؟

"ٹھیک۔"

"کہاں ہو۔"؟

"ایک ریسٹوران سے بول رہا ہوں۔ ہمارے مہمان کا کیا حال ہے۔"؟

"وہ بھی ٹھیک ہے۔ کم گو اور کھویا کھویا انسان ہے۔ بہت مختصر گفتگو
ہے۔" میں نے بھی زیادہ الجھنے کی کوشش نہیں کی۔"

"ٹھیک کیا۔ میں تھوڑی دیر کے بعد پہنچ رہا ہوں۔" میں نے کہا اور فون

یا۔ پھر تقریباً ایک گھنٹے کے بعد میں پٹریشا کے پاس پہنچ گیا اور ہم دونوں ایلس
پاس۔ ایلس کے چہرے پر الجھن کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ بس ایک غم آلود کیفیت۔
نے ہمیں دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی۔ بڑی پھیکی مسکراہٹ تھی۔

"ہیلو ایلس۔"

"جناب۔"

"کیسی گزر رہی ہے۔"؟

"زندگی کی بات کر رہے ہیں شاید۔"؟

"ہاں۔" میں نے کہا اور وہ عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ پھر افسردگی
بولا۔

"کچھ لوگ۔ زمین کا بوجھ ہوتے ہیں مسٹر مسعود۔ زمین انہیں کسی طور پر
ں نہیں کرتی اور۔ اور

"تم اتنی مایوسی کی گفتگو کیوں کر رہے ہو ایلس۔"؟

"نہیں جناب۔ نہیں۔ میں جو کچھ سوچتا ہوں ٹھیک ہی ہے۔"

"کیا مطلب۔"؟

"میری ذات کیوں میرے لئے سکون کا باعث نہیں رہی۔ میں ہمیشہ تشنہ رہا
ں۔ میں نے ہمیشہ یہ سوچا ہے کہ کیا۔ میں کسی کی توجہ کا مرکز رہا ہوں۔ کیا کوئی
ہ سے دلچسپی رکھتا ہے۔ ایسے لوگ بھی نہیں ملے۔ میں نے زندگی میں کبھی کسی کی
اہوں میں اپنے لئے ہمدردی نہیں پائی۔"

"اوہ۔ مجھے افسوس ہے ایلس۔"

"نہیں جناب۔ براہ کرم افسوس نہ کریں۔ میں نہیں جانتا قصور کس کا ہے۔
یرے باپ کا، اس کے پیشے کا یا میری تقدیر کا۔"

"لیکن اب تو تم حالات کی زنجیر توڑ چکے ہو۔ اب تو تم ان لوگوں کے چنگل
ے نکل آئے ہو۔"؟ میں نے کہا۔

"شاید۔" وہ پھیکے انداز میں مسکرایا۔

"کافی پلواؤں آپ دونوں کو۔"؟ پڑیشا نے اس گفتگو میں دخل دیا۔

"ہاں ضرور کیوں مسٹر ایلس۔"؟ میں نے ایلس کو دیکھ کر کہا اور اس نے
گردن ہلا دی۔ پڑیشا اٹھ کر چلی گئی۔

"آپ لوگ بیحد ہمدرد ہیں۔" ایلس پڑیشا کے جانے کے بعد بولا۔

"شکریہ ایلس۔ ویسے زندگی کے اس رخ میں بھی تم عورت سے دو
رہے۔"؟

"میں نہیں سمجھا۔"؟

"میرا مطلب ہے کہ تمہاری زندگی میں کچھ دلچسپیاں تو شامل ہوں گی۔"؟

"نہیں جناب۔ میں ہمیشہ کچھ لوگوں کا قیدی رہا ہوں مجھے کبھی ات
آزادی نہیں دی گئی کہ میں اپنے طور پر کچھ سوچ سکتا۔"

"اوہ۔ لیکن کیوں۔"؟ کیا تم نے انہیں ہمیشہ مشکوک رکھا۔"

"میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ لیکن انہوں نے ہمیشہ میرے اوپر دبا
رکھا۔ دراصل ان کے ذہنوں میں ایک انتقامی جذبہ کام کر رہا تھا۔ وہ مجھے خوش
دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ جہاں میری کوئی دلچسپی پاتے مجھے وہاں سے دور کر دیتے۔"

"انوکھا۔ انتقام تھا۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

"ہاں۔ قصور میرے پاپا کا تھا۔ انہوں نے اپنے فرائض سے مجبور ہو کر
انہیں سزائیں دی تھیں۔ لیکن شکار میں بنا۔"

"بہرحال مجھے افسوس ہے۔ اس کے بعد سے تم اپنے والدین سے کبھی نہیں
ملے۔"؟

"کبھی نہیں۔"

"ان کے بارے میں معلومات بھی نہیں حاصل کیں۔"؟

"نہیں۔ میں ان سے بے خبر نہیں رہا۔ وہ لوگ تو اب مجھے بھول چکے ہوں

ے۔"

"اوہ۔ لیکن ایلس اب تو تم ان حالات سے نکل چکے ہو۔"؟

"ہاں۔ میں نکل چکا ہوں۔" اس کی مجبور مسکراہٹ پھر ابھر آئی۔

"تو اب تمہیں خوش ہونا چاہیے۔"

"ہاں۔ اب میں خوش ہوں۔" اس نے مصنوعی انداز میں کہا اور میں نے
وس کیا کہ پڑیشا درست کہتی ہے۔ وہ انوکھی فطرت کا انسان ہے۔"

"میں اب تمہاری فوری مدد کرنا چاہتا ہوں ایلس۔ میں خود کو پارسا ظاہر نہیں
ں گا۔ دراصل میرے ذہن میں معقول دولت حاصل کرنے کا تصور موجود ہے۔
ن اس کے ساتھ ہی مجھے تم سے ہمدردی بھی ہے۔"

"میں تمہاری صاف گوئی کی قدر کرتا ہوں مسعود۔"

"تب پھر تم وہ نوٹ میرے حوالے کب کر رہے ہو۔"؟

"جب تم پسند کرو۔"؟

"آج ہی رات۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" ایلس نے بدستور لاپرواہی سے کہا۔

"لیکن ایلس۔ وہ نوٹ تمہارے کسی شناسا کے پاس ہیں کیا۔"

"شناسا۔؟ ہاں ویرانے ہی میرے شناسا ہو سکتے ہیں۔"

"وہ مسکرایا۔

"کیا مطلب۔"؟

"ہاں۔ ایک عمارت ہے۔ کہا جاتا ہے مغل شہنشاہوں نے وہ عمارت بنوائی
۔ اب تو وہ کھنڈرات میں بدل چکی ہے۔ میں نے وہ نوٹ اس عمارت میں
ائے تھے۔"

"اوہ۔ کیا اس کے نزدیک کوئی خشک تالاب بھی ہے۔"؟

"ہاں۔ میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔"

"خوب۔ اسے لال بارہ دری کہتے ہیں۔ مغلوں کی عمارت ہی تھی۔
ترین جگہ ہے۔ شہر سے تقریباً تیس میل دور۔"

"ہاں۔ اتنی ہی ہوگی۔"

"نوٹ کسی بیگ میں ہیں۔"؟

"چمڑے کے مخصوص تھیلے میں جنہیں وہ لوگ استعمال کرتے ہیں۔"

"کتنے تھیلے ہیں۔"؟

"دس۔"

"یہ سارے سوالات میں نے اس لئے کئے ہیں ایلس کہ انہیں لانے کے پروگرام طے کرلوں۔"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ میرے خیال میں اس کے لئے آپ کو کسی بند گا
بندوبست کرنا چاہیے۔" مسٹر مسعود۔

"ٹھیک ہے بندوبست ہو جائے گا۔ تقریباً دس بجے ہم یہاں سے چلیں
میں پونے دس بجے پہنچ جاؤں گا۔" میں نے کہا اور اس نے گردن ہلا دی۔ اسی د
پیڑیشا کافی کے برتن اٹھائے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ اس نے مسکرا کر ہم دونوں
طرف دیکھا اور پھر کافی بنا کر سرو کرنے لگی۔ اس کے بعد خاموشی سے کافی پ
اور پھر میں نے پیڑیشا کو اٹھنے کا اشارہ کیا اور ہم دونوں باہر نکل آئے۔ میں نے پ
کو اس سلسلہ کی تفصیل بتا دی تھی۔

لال بارہ دری کے وسیع کھنڈرات رات کی تاریکی میں بیحد مہیب لگ ر
تھے ایلس باہر کا آدمی تھا اور مشرقی روایات کے بارے میں اسے کچھ معلومات نہ
تھیں، اس لئے اس کے ذہن میں کوئی خاص بات نہیں ہوگی۔ لیکن میں نے لا
بارہ دری کے کھنڈرات کے بارے میں انوکھی کہانیاں سنی ہوئی تھیں، کچھ لوگوں
چشم دید واقعات اور کچھ روائتیں ان کھنڈرات کو بے حد خوفناک بنا کر پیش کر
تھیں انہیں آسیب زدہ قرار دیدیا گیا تھا اور رات کی تاریکی میں اس سڑک

ور فت بیحد کم ہوا کرتی تھی۔ لیکن دولت کی کشش انسانی حواس پر بری طرح اثر
از ہوتی ہے۔ میں نے ان ساری روایات کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ یوں بھی میں
فرسودہ روایات سے زیادہ متاثر نہیں تھا۔ لیکن اس وقت تو میں بھی ان کے
ے میں سوچ رہا تھا۔ حالانکہ جوں جوں میرے قدم آگے بڑھ رہے تھے میرے
ن میں انوکھے تاثرات جاگ رہے تھے پھر ہم لال بارہ دری کے بالکل نزدیک پہنچ
ے۔ گاڑی سڑک سے اتار کر کے کچے پر کھڑی کر دی گئی۔ یہ وین میں نے کرائے
حاصل کی تھی اور میرے خیال میں میرے لئے بیحد کار آمد تھی۔ بارہ دری کے
ٹے دروازے سے اندر داخل ہو کر ہم بائیں سمت مڑ گئے۔ اس جگہ کو ہاتھی خانہ
ا جاتا تھا۔

ہاتھی خانے تک جانے کے لئے تقریباً بارہ سیڑھیاں اترنا پڑتی تھیں اس کے
نوں جانب تین تین فٹ کی چوڑی جگہ تھی جس سے گزر کر دوسری طرف جایا جا
تا تھا۔ ذرا سی بھی لغزش ہو جائے تو پندرہ سولہ فٹ کی گہرائی میں جا پڑو۔ چنانچہ
س ہاتھی خانے میں جانے والی سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ ہم دونوں کے ہاتھوں میں
لبی ٹارچیں تھیں جن سے ہم اس حصے کو منور کر رہے تھے۔

میں نے اس دوران ایلس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ ہاتھی خانے کا بھیانک
حول رگ وپے میں سرد لہریں دوڑا رہا تھا۔ لیکن بہرحال ایلس بھی تو موجود تھا۔
تھی خانے کی اس کوٹھری میں جہاں ہاتھیوں کی خوراک بھری ہوتی ہے داخل ہو کر
م رک گئے۔ تب ایلس نے ایک طرف روشنی ڈالی اور میں نے چمڑے کے دو بے
نگ تھیلے دیکھ لئے جو اوپر نیچے چنے ہوئے تھے۔

ایک ایک لمحہ بدن سرد کر رہا تھا۔ ایک انوکھا احساس ذہن میں جاگ رہا تھا۔
ہرحال ہم نے تھیلے لئے اور سنبھل کر چلتے ہوئے باہر نکل آئے۔ میں نے پیڑیشا کو
س سلسلہ کی تفصیل بتا دی تھی۔

"چلیں ایلس۔"؟ میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے بھاری آواز میں کہا اور میں نے وین اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ ایلس پر اب مجھے اعتماد ہوتا جا رہا تھا۔ وہ جھوٹا انسان نہیں ہے۔ بس اب آخری بات رہ گئی تھی یعنی نوٹ کیسے ہیں۔"

اور دوسرے دن یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا۔ نوٹوں کے حصول کے بعد دیر کرنا حماقت تھی چنانچہ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ نوٹ ہم نے احتیاط سے ایک جگہ پوشیدہ کر دیئے تھے اور ایلس ہمارا پورا مددگار تھا۔

دوسرے دن میں نے خفیہ طور پر ڈالر کا کاروبار کرنے والے ایک ایجنٹ سے ایک ہزار ڈالر کے نوٹ بدلوائے اور کسی کو کوئی شبہ نہیں ہو سکا۔ نوٹ بالکل تسلی بخش تھے پھر تیسرے دن میں نے پانچ ہزار ڈالر کے نوٹ بدلوائے اور ایک بڑی رقم میرے پاس جمع ہو گئی۔ نوٹوں کے اصلی ہونے میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکا چنانچہ یہ خیال تم دل سے نکال دو۔" ایلس نے کہا۔

"ہاں ایلس۔ اس بات کا یقین مجھے ہو گیا ہے کہ یہ نوٹ انتہائی شاندار ہیں۔ چنانچہ یہ مرحلہ طے ہو گیا ہے۔ تقریباً سات ہزار ڈالر میں بدلوا چکا ہوں اور تقریباً یہ رقم اتنی ہے کہ ہم آسانی سے ساری ضروریات پوری کر سکتے ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے ایلس کہ ہم یہ نوٹ کیا برطانیہ میں آسانی سے بدلوا سکیں گے۔"؟

"یہ ذمہ داری تم میرے اوپر چھوڑ دو۔ اگر تمہیں ان کے چلانے میں ذرا سی بھی دقت اور پریشانی کا شکار ہونا پڑا تو اس کا ذمہ دار میں ہوں گا۔ تم چاہو تو ان ڈالرز کو بینکوں میں بھی بدلوا کر دیکھ سکتے ہو۔"

"مجھے یقین ہے ایلس۔" میں نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔ تب ایلس میری صورت دیکھتے ہوئے بولا۔

"لیکن ان کو لے جانے کے لئے کیا طریقہ کار اختیار کرو گے۔ اور کس طرح لے جاؤ گے۔"؟

"طریقہ کار۔ میں نے ایلس کی نگاہوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ اگر تمہارے

ذہن میں کوئی ترکیب ہے تو مجھے بتاؤ۔ ورنہ میں اپنے طور پر تو سوچ ہی رہا ہوں۔"

"میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے۔" ایلس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

"کیا۔"؟ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"میں تمہیں اس کے بارے میں مکمل تفصیلات بتاؤں گا۔ تمہیں جو کچھ کرنا ہے غور کر لینا کہ کیا تم مطمئن انداز میں یہ سب کچھ کر سکتے ہو۔"

"ترکیب کیا ہے۔"؟ میں نے سوال کیا۔

"کچھ عرصے قبل، میرے خیال میں تقریباً چھ ماہ یا پانچ ماہ قبل ایک معزز جوڑا یہاں آیا تھا۔ عورت کا نام اینی کوک تھا اور مرد مسٹر ہڈسن۔ ان دونوں کا تعلق بھی برطانیہ کے ایک اچھے خاندان سے تھا۔ لیکن دونوں بدعنوانیوں کا شکار ہو گئے تھے اور ان کی مجبوریاں انہیں اس گروہ میں گھسیٹ لائیں۔ انہوں نے روپیہ کمانے کے لئے گروہ میں شمولیت اختیار کر لی۔ لیکن ہڈسن تیز مزاج انسان تھا اینی کاک کی بے عزتی پر ایک دن وہ گروہ کے ارکان سے لڑ گیا اور دونوں کو قتل کر دیا گیا۔ ان کی لاشیں ضائع کر دی گئیں اور پھر کبھی ان کے بارے میں کوئی بات سننے کو نہیں ملی۔ اتفاق سے ان کے کاغذات اور پاسپورٹ اور دوسری چیزیں میرے پاس رہ گئیں۔"

"تمہارے پاس۔" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں۔"

"کہاں ہیں۔"؟

"انہی تھیلوں میں سے ایک میں موجود ہیں۔"

"اچھا پھر۔"؟

"ان دونوں کا تعلق بھی لندن کے ایک اچھے گھرانے سے تھا اور تمہاری حکومت کو ابھی ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔"

"خوب۔"

"اگر ہڈسن یہاں کسی ٹریفک کے حادثے کا شکار ہو جائے تو اس کی لاش لندن

لے جانے کے لئے اینی کوک کوشش کر سکتی ہے۔"

"میں نہیں سمجھا۔"

"میری مراد مس پٹریشا سے تھی۔ اینی کوک کی حیثیت سے وہ ہڈسن کی لاش برطانیہ لے جا سکتی ہیں۔ یہ لاش سرکاری تابوت میں ہو گی اور مس اینی کوک اس تابوت کے ساتھ ہوں گی۔ کام صرف یہ کرنا ہو گا کہ بالکل ایسا ہی تابوت اور ہو گا جسے اس وقت تبدیل کر دیا جائے گا جب لاش کا تابوت جہاز پر لے جایا جائے گا۔"

"اوہ۔" میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ دیں۔ ایلس کی تجویز لاجواب تھی۔ میں اس کا مقصد سمجھ رہا تھا۔

"اور اس دوسرے تابوت میں۔"؟ میں نے سرسراتی آواز میں کہا۔

"نوٹ ہوں گے۔"

"لندن ائیرپورٹ پر کیا ہو گا۔" میں نے پوچھا۔

"وہاں حالات میں سنبھال لوں گا یہ میری ذمہ داری ہے۔ اس کے لئے کوئی اور بہتر طریقہ کار اختیار کیا جائے گا۔"

"ہاں۔ لیکن ڈیئر ایلس۔ کام بیحد مشکل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اتنی تعداد میں نوٹ لے جانے کا اس سے بہتر طریقہ اور کوئی نہیں ہو گا لیکن۔ اس کے لئے چند مشکلات بھی پیش آ سکتی ہیں۔"

"مثلاً۔؟' اس نے پوچھا۔

" "چلو ہم نے پٹریشا کو میک اپ کر کے اینی کاک بنا دیا لیکن ہڈسن۔"؟

"وہ کردار میں ادا کروں گا۔"

"تم۔"؟

"ہاں میں۔ تم میرے لئے بھی پاسپورٹ وغیرہ کا بندوبست کر دینا۔ تمہارے روانہ ہونے کے فوراً بعد کسی دوسرے طیارے سے میں لندن پہنچ جاؤں گا' اور ائیر

پورٹ پر تمہاری مدد کروں گا۔"

"یعنی لاش کی حیثیت سے تم خود کو پیش کرو گے۔"؟

"ہاں۔"

"تمہیں وقت نہیں ہو گی۔"

"ہرگز نہیں۔ کیونکہ میں حبس دم کر لیتا ہوں۔ وہ لوگ سو فیصدی مجھے لاش ہی کہیں گے۔" ایلس نے جواب دیا۔

"ایلس کی گفتگو میں مجھے جگہ جگہ سقم نظر آ رہی تھے۔ کچھ بے ربط سی بات تھی۔ مشکل ترین مرحلوں کے لئے وہ ایسے انوکھے حل پیش کر رہا تھا کہ حیرت ہوتی تھی۔ اگر وہ خود ہی تھوڑی سی کوشش کر لیتا۔ لیکن اس کی شخصیت میں ایک انوکھا پن تھا۔ ایک عجیب سی کیفیت نہ جانے وہ بیچارہ کس احساس کا شکار تھا۔

"بہر حال یہ معاملات ہمارے درمیان طے ہو گئے اور میں سخت محنت میں مصروف ہو گیا۔ میں نے اپنے تمامتر تعلقات اور ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے ضروری مسائل حل کئے چند ایسے لوگوں کو اپنی مدد کے لئے تیار کر کیا جو اہمیت رکھتے تھے۔ انہیں انتہائی معقول معاوضہ پیش کیا۔ بہر حال یہ سارے کام مکمل کرانے میں مجھے تقریباً پندرہ دن صرف ہو گئے۔ اور اب ہم اپنی کاروائی پر عمل کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھے۔

"یہاں تک کہ وہ آخری رات آ گئی جب ہمیں اپنے ڈرامے کو اسٹیج کرنا تھا۔ شہر کی ایک بھری سڑک کا انتخاب کیا گیا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ مجھے اس ڈرامے میں صرف ایک تماشائی کا کردار ادا کرنا تھا پٹریشا کے چہرے پر اینی کاک کا میک اپ تھا اور ایلس مسٹر ہڈسن کے روپ میں اس کے ساتھ تھا۔ پٹریشا اپنے ڈرامے کی پوری پوری ریہرسل کر چکی تھی۔ چنانچہ ایک سڑک کراس کرتے ہوئے اچانک ہڈسن زمین پر گر پڑا۔ اس نے دو چار مرتبہ ہاتھ پاؤں رگڑے اور پھر سرد ہو گیا۔

"پٹریشا کی چیخ پر بے شمار لوگ جمع ہو گئے۔ پولیس کے ذمہ دار افراد بھی پہنچ

گئے اور چونکہ معاملہ ایک غیر ملکی کا تھا اس لئے خاصی توجہ دی گئی۔ میں بھی تماشائیوں میں شریک تھا۔

"فوری پولیس کی ایک گاڑی میں مسٹر ہڈسن کو ہسپتال لے جایا گیا۔ پٹریشا بھی روتی سسکتی ساتھ تھی۔ پوری توجہ سے مسٹر ہڈسن کی نگرانی کی جا رہی تھی لیکن ڈاکٹروں کی پوری ٹیم نے ان کا معائنہ کرنے کے بعد انہیں مردہ قرار دیا۔

"خاصی ہنگامی کیفیت تھی پولیس کے بڑے بڑے افسر جمع ہو گئے تھے۔ موت کے بارے میں پوری رپورٹ حاصل کر لی گئی۔ برطانوی سفارتخانے کو بھی اطلاع دیدی گئی۔ پاسپورٹ وغیرہ موجود تھے۔ پٹریشا نے سسکتے ہوئے بتایا کہ وہ اور اسکا منگیتر یہاں سیر کرنے کی غرض سے آئے تھے۔ اس کا منگیتر ہڈسن کچھ بیمار تھا اور اس سے قبل بھی ایک بار اسے یہی دورہ پڑا تھا۔

"تعجب کن رپورٹ ڈاکٹر کی تھی۔ کوئی نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ اس شخص نے حبس دم کیا ہوا ہے۔ بہرحال پٹریشا کی درخواست پر لاش کو لندن پہنچانے کا بندوبست کیا گیا۔ یہ بندوبست سفارتخانے نے ہی کیا تھا۔ اور پٹریشا کو ہر طرح کی سہولت فراہم کی گئی اس موقع پر میں پٹریشا اور ہڈسن کے مقامی دوست کی حیثیت سے سامنے آیا۔ اور میں نے بھی ان دونوں کے ساتھ جانے کی پیشکش کر دی۔

"سارے کام انتہائی تسلی بخش طور سے انجام پا گئے تھے۔ آخری کام یہ تھا کہ میں اپنے مخصوص لوگوں کو جن کو میں نے اپنے کام کے لئے تیار کیا تھا' وہ تابوت فراہم کر دوں جو ہمیں بدلنا تھا۔ چنانچہ یہ آخری کام بھی دھڑکتے دل سے میں نے پایہ تکمیل کو پہنچا دیا۔ نوٹوں سے بھرا تابوت ان کے حوالے کر کے میں پٹریشا کے پاس آ گیا جس نے ماتمی لباس پہنا ہوا تھا اور جس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"اب ہماری نگاہیں لاش کے تابوت پر تھیں۔ لیکن پھر ہمیں اسے نگاہوں سے اوجھل کرنا پڑا۔ تابوت جہاز میں پہنچا دیا گیا تھا اور پھر انتہائی عجلت میں ہمارا کارکن ہمارے پاس پہنچ گیا۔

"کام ہوشیاری سے کر دیا گیا ہے جناب۔" اس نے ہمیں اطلاع دی۔

"شکریہ۔ تمہارا معاوضہ۔" میں نے نوٹوں کا ایک بنڈل اس کی طرف بڑھا دیا جسے اس نے پھرتی سے لباس میں چھپا لیا۔

"دوسرے تابوت کا کیا کروں۔"؟

"بس اسے کسی مناسب جگہ چھوڑ دو۔ فی الحال وہ کہاں ہے۔"؟

"ایک بڑی بس میں رکھا ہوا ہے۔"

"تم نے پروگرام کے مطابق اس کا تالا کھول دیا۔"؟

"ڈھکن بھی کھول دیا ہے۔"

"بس تمہارا کام ختم۔ اب تم اسے ضائع بھی کر سکتے ہو۔ لیکن دیکھ لینا وہ خالی بھی ہے یا نہیں۔"

"بہتر جناب۔" کارکن نے کہا اور چلا گیا۔ میں اور مس اپنی کاک یا پٹریشا جہاز میں آ گئے۔ ہم دونوں اطمینان سے ایک ہی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ پٹریشا تو بہترین اداکاری کر رہی تھی لیکن گھبرائی ہوئی تھی۔

"طیارے نے پرواز شروع کر دی۔ پٹریشا گم سم تھا۔ پھر جب میں نے محسوس کیا کہ کوئی ہماری جانب متوجہ نہیں ہے تو میں نے پٹریشا کو مخاطب کیا۔ "تم تو ضرورت سے زیادہ خاموش ہو۔ یوں لگتا ہے جیسے۔"

"اوہ۔ مسعود۔ میں واقعی خوفزدہ ہوں۔"

"کیوں۔"؟

"بس بیشمار خیالات ہیں۔ جن میں ایک سب سے زیادہ خوفناک ہے۔"

"وہ کیا۔"؟

"ایلس کس طرح لندن پہنچے گا۔ اگر وہ نہ پہنچ سکا اور تابوت چیک کر لیا گیا تو۔" پٹریشا نے کہا۔

"اتنا خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا پٹریشا۔ اس کے بعد ہم کروڑ پتی بن جائیں

گے۔ بہر حال ایلس چالاک آدمی ہے۔ ممکن ہے اس نے پہلے ہی انتظامات کر لئے ہوں۔"

"کیا تمہاری نگاہوں میں اس کی شخصیت صاف ہے۔"؟ پٹریشا نے سوال کیا۔ اور میں پرخیال انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

"تمہارا کیا خیال ہے پٹریشا۔"؟

"میں نے ہمیشہ اس کے اندر ایک مظلومیت سی محسوس کی ہے۔ خود میں گم۔ کھویا کھویا جیسے کوئی بات سوچ رہا ہو۔"

"اس کے علاوہ۔"؟

"بس مسعود۔ کیا کہوں میں۔ نہ جانے کیوں وہ مجھے ہمیشہ پراسرار سا لگا ہے۔"

"یہاں تک میں تم سے متفق ہوں۔"

"آخر کیوں۔"؟

"بعض کردار آپ الجھے ہوتے ہیں۔ حالانکہ ان میں کوئی گہرائی نہیں ہوتی لیکن۔ بس ایک انوکھاپن ہوتا ہے ان میں۔"

"ہاں۔ یہ تو ٹھیک ہے۔ اس کے علاوہ باقی باتیں سب ٹھیک تھیں۔ جیسے یہ نوٹ اور اس کی دوسری باتیں۔"

"بہرحال اس وقت تک پریشان نہیں ہونا جب تک کہ کوئی الجھن نہ پیش آئے۔ ورنہ سفر کا مزا کرکرا ہو جائے گا۔"!

"مزا۔" پٹریشا ہنسنے لگی۔

"کیوں۔ تمہیں اختلاف ہے۔"؟

"سو فیصدی۔ یہ سفر سولی کے راستے کا سفر ہے۔ جب تک ہم اپنا کام مکمل نہ کر لیں پرسکون کیسے رہ سکتے ہیں۔" پٹریشا نے کہا۔ میں خاموش ہو گیا۔ پٹریشا کافی حد تک درست کہہ رہی تھی۔ واقعی جب تک ہم لندن کسٹم سے نہ نکل جائیں یہ کس

طرح کہہ سکتے ہیں کہ ہم خطرات سے دور ہو گئے۔

"پٹریشا سے گفتگو کے بعد تو بہت سے وسوسے میرے ذہن میں بھی جاگ اٹھے تھے۔ واقعی اگر ایلس بروقت لندن ایئرپورٹ نہ پہنچ سکا تو۔ میں حالات پر غور کرنے لگا۔ ایلس ایک تابوت میں بند ہے۔ کوئی بھی وقت ہو سکتی ہے۔ تابوت پولیس کے ہاتھ لگ سکتا ہے۔ یا کوئی بھی ایسی بات۔ ممکن ہے اسے دوسرے طیارے تک پہنچنے میں دیر ہو جائے۔ ہر طرح سے ایک ہی خطرہ سامنے آ جاتا ہے۔ لندن ایئرپورٹ پر کسٹم چیکنگ کے دوران کیا ہوگا۔ ساری ذمہ داری پٹریشا پر آ پڑی تھی۔ ہو سکتا ہے بروقت کوئی انتظام نہ ہو سکے۔ ایسی صورت میں پٹریشا سو فیصدی اس تابوت کی ذمہ داری تھی کیونکہ وہی ہڈسن کی بیوہ کی حیثیت سے سفر کر رہی تھی۔

بہرحال اس سفر میں گھٹن تھی۔ خوف تھا۔ اور پٹریشا کی پریشانی بھی برحق تھی۔ کافی دیر تک ہم دونوں خاموش رہے۔ تب پٹریشا مسکرا کر مجھ سے مخاطب ہوئی۔" میرا خیال ہے اب تم پریشانی کا شکار ہو گئے۔"؟

"اس قدر تو نہیں پٹریشا۔ لیکن بہرحال تمہاری سوچ وزن رکھتی ہے۔"

"کیا فرق پڑتا ہے مسعود۔ بہرحال بہترین مستقبل کے لئے اگر خطرات سے گزرنا پڑ رہا ہے تو ٹھیک ہے۔"

"ہاں۔ یہ بھی درست ہے۔"

لندن تک کا سفر جن تصورات اور خیالات میں گزرا وہ سوہان روح تھے۔ پھر طیارہ لندن ایئرپورٹ پر پہنچ گیا۔ اب ہم کسی حد تک نڈر ہو گئے تھے۔ پٹریشا نے ایک تجویز پیش کی۔ اس نے کہا کہ میں الگ رہ کر حالات سنبھال لوں۔ لیکن میں نے انکار کر دیا۔

"لیکن مسعود۔ سوچو تو سہی۔"

"نہیں پٹریشا۔ میں ایک لمحے کے لئے بھی تمہیں نہیں چھوڑ سکتا"۔ میں نے

فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"ہم دونوں پھنس گئے تو بے دست و پا ہو کر رہ جائیں گے۔ بہتر ہے کہ تم دور رہ کر نگاہ رکھو"۔

"نہیں پیٹریشا۔ میرا ضمیر اس کی اجازت نہیں دیتا۔ براہ کرم تم اس کے لئے مجھے مجبور نہ کرو۔ جو کچھ ہو گا ساتھ ہی بھگتیں گے"۔

"اوہ! تم ضد کر رہے ہو۔ اندازہ لگا لو۔ ایلس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ وہ کسی آفاقی ذریعہ سے تو یہاں نہ پہنچ سکے گا"

ممکن ہے اس نے کوئی اور"۔ میں اچانک خاموش ہو گیا دو کسٹمز والے ہماری جانب آئے تھے۔ خشک چہرے والے افسر تھے جن کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ نہ جانے کیوں دل میں ایک خوف ابھر آیا۔

" مس اینی کاک۔" ان میں سے ایک افسر نے ہاتھ میں پکڑے ایک کاغذ کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"جی۔ میں ہوں۔"

"مسٹر ہڈسن کی لاش آپ ہی لائی ہیں۔"؟

"جی ہاں۔ وہ میرا منگیتر تھا۔" پیٹریشا نے سسکی لیکر کہا۔

" براہ کرم ہمارے ساتھ تشریف لائیں۔" افسر نے کہا۔ اور پیٹریشا کے اعصاب میں تناؤ پیدا ہو گیا۔ تب میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

"میرا نام مسعود رضوی ہے۔" میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

"جی۔"؟ کسٹم آفیسر میری طرف متوجہ ہو گیا۔

"مسٹر ہڈسن اور مس اینی کاک ایشیا میں میرے مہمان تھے۔ میں مس کاک کے ساتھ یہاں آیا ہوں۔"

اوہ۔ ٹھیک ہے آپ بھی تشریف لائیے۔" افسر نے مجھے اجازت دیدی اور ہم دونوں ان کے ساتھ چل پڑے۔ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہمارا دل کہہ رہا تھا جو دراصل

ا را تابوت تھا اور جس کا منہ کھل جانے کے بعد ہماری اصلیت واضح ہونے والی
ی' چند دوسرے افسر اس کے نزدیک کھڑے ہوئے تھے۔

"مس اینی کاک۔ ہمیں ساتھ لانے والے ایک افسر نے ہمارا تعارف کرایا
ر ان کے ایشیائی دوست مسعود رضوی۔"

" ہیلو۔" افسر نے خوش اخلاقی سے کہا اور ہمیں بیٹھنے کی پیش کش کی "میں
پ کے غم میں شریک ہوں مس کاک۔ لیکن ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم غمزدہ
افروں کے ساتھ بھی وہ سلوک نہیں کر سکتے جو ہمیں کرنا چاہیے اور اس کی وجہ
ج دشمن عناصر ہیں جو نت نئے طریقوں سے حکومت کو دھوکا دنے کی کوشش میں
روف رہتے ہیں۔ ابھی چند روز قبل ایسے ہی ایک تابوت کے اندر موجود لاش
، مردہ بدن میں افیون کی بھاری مقدار موجود پائی گئی۔ بتائیے ہم کیا کریں۔ لوگ
ت کے بعد بھی نداق جاری رکھتے ہیں۔ چنانچہ مس کاک ہماری خواہش ہے کہ ہم
پ کی اجازت سے اس تابوت کو کھول کر لاش کا ایک مشینی جائزہ لے لیں۔ کیا
پ ایک اچھے شہری کی مانند ہم سے تعاون کریں گی"؟

"اوہ۔ اوہ"۔ پیٹریشا رو پڑی۔ شاید خوف سے لیکن میں نے آگے بڑھ کر
را دیا۔

"قانون سے تعاون فرض ہے مس کاک لیکن جناب کیا کوئی ایسی صورت
ن نہیں ہے کہ آپ اس تابوت کو نہ کھولیں ہم آپ کے اطمینان کے لئے۔"؟

"ہرگز نہیں جناب۔ ہم اخلاقی قدروں کو بھی اہمیت دیتے ہیں لیکن اس سے
رہ ہمارے فرائض۔ براہ کرم آپ اس کاغذ پر دستخط کردیں"۔ افسر نے ایک
م پیٹریشیا کی طرف بڑھا دیا۔

ہم دونوں ہی کو احساس ہو گیا کہ ہم بری طرح پھنس گئے ہیں۔ میرا ذہن
چنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ کس طرح ہم اپنے اوپر سے یہ الزام دور کریں گے
راس کے لئے ایک ہی ترکیب کارگر تھی یہی جو حقیقت تھی۔ یعنی تابوت بدل دیا

گیا حالانکہ یہ ایک معمولی سی کوشش تھی۔ لیکن بہرحال ہاتھ پاؤں مارنے کے
ایک راستہ تو تھا۔ وہ برا وقت آگیا تھا جس کا خوف ہمیں تھا۔ ہماری آنکھوں
تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ بہرحال پڑیشا نے لرزتے ہاتھوں سے فارم پر دستخط کرد
۔ دوسری طرف تابوت کو مشین پر لے جانے کی کاروائی مکمل ہو گئی تھی ہمیں
ساتھ آنے کی دعوت دی گئی۔ لیکن میں نے معذرت کرلی۔

"آپ لوگ اپنا فرض پورا کریں۔ میرا خیال ہے کہ مس اینی کاک کو
اور آزمائش میں نہ ڈالیں۔" میں نے کہا اور افسروں نے گردن ہلا دی۔ تابوت
مشینی ذرائع سے کھولا جانے لگا میں اور پڑیشا پتھر کے بتوں کی مانند ساکت بیٹھے ہو
تھے آنے والا ہر لمحہ ہماری موت تھا۔ میری نگاہیں افسروں پر جمی ہوئی تھیں
جانے وہ کیا کاروائی کر رہے تھے۔

میری ہمت نہ ہوئی کہ میں ان کے نزدیک جاؤں لیکن میں نے افسروں
چہرے پر سکون دیکھے تھے۔ تقریباً بیس منٹ تک وہ مصروف رہے اور پھر تابوت
ڈھکنا بند کر دیا گیا۔

یہ بیس منٹ۔ اف یہ بیس منٹ ہمارے اوپر کس قدر بھاری تھے بیان نہ
کیا جا سکتا۔ ایک ایک لمحہ ہتھوڑوں کی طرح ذہن پر ضرب لگا رہا تھا۔ تب ایک
آفیسر ہماری طرف بڑھا اور ہماری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ وہ آفیسر ہمیں موت
فرشتہ محسوس ہو رہا تھا جو ہماری روح قبض کرنے آ رہا تھا۔

تب آفیسر پڑیشا کے سامنے جھکا۔ "تابوت کو ابھی باہر پہنچا دیا جائے گا۔
آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور آپ کے تعاون کے شکر گزار بھی۔"

کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آفیسر طنز کر رہا ہو۔ پڑ
نے عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ آفیسر نے کاغذات ہمارے حوالے کر دیئے
تھے لیکن۔ لیکن وہی ہوا جو اس نے کہا تھا اور یہ ناقابل یقین بات تھی۔ افسرو
نے تابوت میں کیا دیکھا۔ نہ جانے انہوں نے کیا دیکھا۔

تابوت باہر لے جایا گیا تو ہم بھی ساتھ تھے۔ پڑیشا کے حواس ساتھ نہ دے
رہے تھے۔ اس نے میرے بازوؤں کا سہارا لے لیا تھا۔ "مسعود۔ مسعود۔ یہ کیا
ہوا۔"؟

"خدا جانے" میں نے بھی گہری سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔

"تم بھی تجزیہ نہیں کر سکے"؟

"کیا تجزیہ کروں۔"؟

"وہ میرے ذہن میں ایک خیال ہے۔"

"کیا۔"؟

"شاید ان لوگوں نے دھوکا کیا۔"

"کس نے"۔؟

"جن سے تم نے تابوت بدلنے کی بات کی تھی۔ انہوں نے اپنا فرض پورا
نہیں کیا اور رقم اینٹھ لی۔"

"ممکن ہے لیکن۔ لیکن ایلس کہاں مرگیا اس نے تو ہمیں مروا ہی دیا تھا"۔

"یہ بھی اب پوچھنے کی بات ہے"؟

"کیا مطلب"۔؟

"اتنی دیر تابوت میں رہنے کے بعد وہ اب سچ مچ مرگیا ہو گا اور خدا کی پناہ۔
تم سچ ہی کہہ رہی ہو۔ لیکن۔ لیکن اس طرح تو۔ تو۔ اوہ پڑیشا۔ میرے خیال میں
ان فرض ناشناس لوگوں نے ہماری مدد کی ہے۔ ہمارے اوپر احسان کیا ہے۔"

"لیکن نوٹوں کا تابوت"۔ پڑیشا ایک سسکی لے کر بولی۔

"جہنم میں جائے۔ اب لندن تک تو آہی گئے ہیں۔ یہاں تقدیر آزمائی کریں
گے۔ کوئی مشکل کم نہیں ہے"۔

پڑیشا ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئی۔ تابوت کو باہر پہنچا دیا گیا اور
جونہی ہم اس کے قریب پہنچے ایک سیاہ رنگ کی وین ہمارے پاس پہنچ گئی۔

ڈرائیونگ سیٹ سے جو شخص نیچے اترا اسے دیکھ کر ہمارے حواس بالکل ہی ساتھ چھوڑ گئے وہ ایلس تھا"۔

پڑیشا بھی پاگلوں کی طرح مجھے دیکھ رہی تھی ۔ اس نے ایئرپورٹ کے خلاصیوں کی مدد سے تابوت وین میں رکھوایا اور پھر دوسری طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ "آیئے ۔ آپ لوگ بھی آیئے"۔

"آؤ پڑیشا" ۔ میں نے طویل سانس لے کر کہا اور پڑیشا بادل ناخواستہ وین میں بیٹھ گئی ۔ اس کے نزدیک ہی میں بھی بیٹھ گیا تھا۔ ایلس نے وین اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی ۔ ہم دونوں کے ذہن میں جوالا مکھی کھول رہا تھا۔

وین آگے بڑھتے ہی میں نے کہا ۔ "ایلس اگر تم نہیں چاہتے کہ دماغ کی رگیں پھٹنے سے ہماری موت واقع ہو جائے تو"۔

"تو"؟ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ ابھر آئی ۔

"تو ہمیں حقیقت حال بتا دو"؟

"تو اپنے محسنوں کا برا کب چاہوں گا"۔ ایلس نے جواب دیا۔

"تو بتاؤ ۔ تابوت میں کیا ہے"؟

"وہی جو ہم لائے تھے"؟

"گویا کسی مسٹر ہڈسن کی لاش"؟ میں نے کہا

"اوہ ۔ یہ کیسے ممکن ہے ۔ تابوت تو بدل دیا گیا تھا"۔

"بدل دیا گیا تھا"؟

"ہاں"

"لیکن دوسرے تابوت میں کیا تھا"۔؟

"نوٹ"۔

"کیا یہ ماننے کی بات ہے ایلس"۔؟

"میں نہیں سمجھا"۔؟

"کسٹم حکام آنکھوں سے معذور نہیں تھے نہ ہی ان لوگوں سے ہمارے تعلقات تھے ۔ کہ وہ ہمارے ساتھ رعایت کر گئے"۔

"لیکن میں نے آپ سے وعدہ بھی تو کیا تھا مسٹر مسعود کہ کسٹم ہاؤس کے معاملات میں سنبھال لوں گا"۔

"بے شک ۔ لیکن تم کسٹم ہاؤس میں موجود نہیں تھے"۔

"میں اپنے کام میں مصروف تھا ۔ اب اس میں میرا کوئی قصور تو نہیں ہے ۔ آپ لوگوں کو میں نے کسی تکلیف سے دو چار تو نہیں ہونے دیا۔" اس نے کہا اور اس کی بات معقول تھی ۔ لیکن ظاہر ہے میرا ذہن صاف نہیں تھا ۔ میں کسٹم حکام میں الجھا ہوا تھا ۔ وہ لوگ مطمئن کس طرح ہوئے انہوں نے تابوت میں کیا دیکھا ۔

میں نے پڑیشا کی طرف دیکھا ۔ میں کسٹم حکام میں الجھا ہوا تھا ۔ وہ لوگ مطمئن کس طرح ہوئے انہوں نے تابوت میں کیا دیکھا ۔

میں نے پڑیشا کی طرف دیکھا ۔ اس کا چہرہ بھی الجھنوں کا شکار تھا ۔ پھر ہم دونوں چونک پڑے ۔

"لیکن اب تم کہاں جا رہے ہو ایلس ۔"؟

"اپنی رہائش گاہ پر ۔ کیوں ۔"؟

"بس ایسے ہی پوچھ رہا تھا ۔"

"میں طویل عرصہ تک آپ کا مہمان رہا ہوں ۔ کیا اب آپ لوگ میرے مہمان نہیں ہو گے ۔"

"کیوں نہیں ۔ تمہارا شکریہ ۔"

"میں آپ کو لندن اور اس کے نواح کی سیر کراؤں گا اور اس کے بعد آپ یورپ کی سیر کا آغاز کریں اور جہاں جی چاہے جائیں ۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا ۔ وین برق رفتاری سے ایک سنسان علاقے سے گزر رہی تھی لندن دیکھنے کا بیحد شوق تھا لیکن ذہنی کیفیت کسی

طرف متوجہ نہیں ہونے دے رہی تھی۔"

ہم ایک چھوٹے سے خوشنما بنگلے میں داخل ہو گئے اور ایلس نے وین روا
دی۔ پھر وہ نیچے اتر کر بولا۔

"ایشیائی مہمانوں کو میں اپنی اس چھوٹی سی رہائش گاہ میں خوش آمدید ک
ہوں۔"

"کیا تابوت نہیں اتارو گے ایلس۔"؟ میں نہ پوچھا۔"

"کیوں نہیں۔"

" میری خواہش ہے کہ تم اسے ابھی اتار لو اور کھول کر مجھے دکھا دو۔"

اوہ ضرور۔ اس خواہش کا احترام مجھ پر فرض ہے۔ لیکن براہ کرم کیا آپ بتا
پسند کریں گے مسٹر مسعود کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں"۔

"جو میں سوچ رہا ہوں ایلس اسے سنکر تم خوش نہ ہوگے"۔ "میر
وعدہ کرتا ہوں کہ ناخوش بھی نہیں ہوؤں گا"۔ "تب میرا خیال ہے ہم کس
سازش کا شکار ہوئے ہیں کوئی ایسا منصوبہ جو تمہارے ذہن میں پہلے سے ہو۔ ممکن
ہے تابوت میں سچ مچ کسی مسٹر ہڈسن کی لاش موجود ہو"۔ "اوہ۔ حالات کے
تحت یہ کیسے ممکن ہے۔ جو کچھ ہوا ہے تمہارے علم میں ہے۔ مسٹر ہڈسن کے بارے
میں' میں نے تمہیں پہلے ہی بتایا ہے"۔

"تابوت میں لاش موجود نہیں ہے"۔

"آؤ تابوت اتار لیں۔" اس نے کہا اور میں نے آمادگی ظاہر کر دی۔ ہم
دونوں نے مل کر تابوت اتارا اور اندر لے گئے۔ پٹریشا ساتھ تھی۔

"کیا اس عمارت میں اور کوئی نہیں ہے۔" میں نے اندر پہنچ کر پوچھا۔

" نہیں۔ میرے علاوہ یہاں کوئی نہیں رہتا۔" " تعجب ہے۔ لیکن یہ
اندر سے صاف ستھری ہے۔"

ہاں۔ ہر چیز پر تعجب نہ کریں۔ اب آپ اس تابوت کو کھول لیں" ایلس نے

اور میں نے بیتراری سے تابوت کا ڈھکن اٹھالیا۔ اندر نوٹ چنے ہوئے تھے
ان نوٹوں کو دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا۔

پٹریشا بھی خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ تب اس نے مسکراتے ہوئے
ا۔

"حسب وعدہ۔ اس میں سے آدھے نوٹ آپ لوگوں کے آپ ان میں سے
ی گڈی لے باہر نکل جائیں۔ انہیں چلانے میں آپ کو کوئی دقت نہیں ہو گی۔
ب آیئے میں آپ لوگوں کو آپ کی رہائش گاہ دکھا دوں۔"

عمارت کا ایک خوبصورت بڑا روم اس نے ہمارے لئے مخصوص کر دیا۔
ں کا ایک بڑا حصہ اس نے ہمارے حوالے کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک کار بھی
اکر دی۔ نہ جانے کیوں یہ سب کچھ عجیب لگ رہا تھا۔ بیحد عجیب۔"

اس عمارت میں پہلی رات گزارتے ہوئے پٹریشا نے بھی یہی بات کہی۔"
عود۔ مسعود۔ کیا یہ سب کچھ کوئی خواب نہیں ہے نہ جانے کیوں مجھے یقین نہیں آ
ا۔ کیا واقعی۔ اور۔ اور۔"

"صرف ایک بات ذہن میں الجھی ہوئی ہے پٹریشا۔" میں نے پریشانی سے
ا۔

"کیا۔"

"کسٹم حکام کو کیا ہوا تھا۔"

"خدا بہتر جانے۔" پٹریشا نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

" اس نے دیانت داری سے ہماری رقم ہمارے حوالے کر دی ہے۔ میرا
یال ہے پٹریشا ہمیں اب یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ نہ جانے کیا معاملہ ہے۔ اس
ے پہلے کہ کسی مصیبت میں پھنس جائیں ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

"یوں بھی اب مہمان نوازی کا جواز نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ لیکن کیا اس کا تذکرہ کرو گے ایلس سے۔"؟

"وہ انکار کر دے گا۔"

"ہاں۔ لیکن کیا اس سے معذرت کر لیں گے۔"

"کیوں نہ خاموشی سے نکل جایا جائے۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے بعد۔"

"اس کے بعد کیا۔"؟

"میرا مطلب ہے کہ نقدی اور لندن سے نکلنا بھی تو مشکل ہو گا۔"

"ایلس سے خوفزدہ ہو کر۔"؟

"نہیں لیکن سوچ لو۔ وہ ہمیں تلاش کر لے گا۔"

"ہوں۔" میں نے پر خیال انداز میں گردن ہلائی۔ اور پھر ایک تجویز کے تحت کہا۔" تب پھر پیٹریشا۔ ہم دو تین دن یہاں گزاریں گے اور اس دوران ہم یہ نوٹ بینکوں میں پہنچا دیں گے۔ اور ان کے ٹریولر چیک بنوالیں گے۔ کچھ رقم ہمیں بینکوں میں رہنے دیں گے۔ کہیں سے بھی یہ رقم نکلوائی جا سکتی ہے۔ اس کام کے مکمل کرنے کے بعد ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔"

ہم دونوں اس تجویز پر متفق ہو گئے اور میں نے دوسرے دن ہی اپنی کاروائی شروع کر دی۔ ایلس نے ہمارے لیے بہترین سہولتیں مہیا کی تھیں۔ وہ خود بہت کم گھر میں رہتا تھا۔ میں جس بینک میں نوٹ لے کر گیا کوئی توجہ نہیں دی گئی کسی کو نوٹوں کے نقلی ہونے کا شبہ نہیں ہوا تھا۔

بہرحال تین چار دن کے اندر یہ کام بھی مکمل ہو گیا۔ اس شام ایلس گھر میں موجود تھا۔ میں نے اس سے گفتگو کرنے کا فیصلہ کیا اور شام کو ہم اس کے قریب پہنچ گئے۔

ایلس نے ہمارا پرجوش استقبال کیا اور بڑے خلوص سے مسکرایا۔" ہیلو مسٹر مسعود۔"

" ہیلو ایلس۔ بھئی اب تو تمہارا مہمان بنے کئی دن ہو گئے اب ہمیں اجازت دو۔"

"مجھے علم تھا۔" اس نے آنکھیں بند کر کے کہا۔

"کیا علم تھا۔"؟

"یہی کہ اب آپ لوگ جانا چاہتے ہیں۔"

" اوہ۔ تم ہم پر نگاہ رکھ رہے تھے۔"؟

" نہیں میرے دوست کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔ دوستوں پر کوئی نگاہ رکھتا ہے۔" اس نے ممنون لہجے میں کہا۔

" پھر تمہیں کیسے معلوم۔"؟

" بہت سی باتیں ہم پر منکشف ہو جاتی ہیں۔ آیئے میرے ساتھ آیئے۔" اس نے کہا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

" کہاں ایلس۔"؟

" بس میرے کمرے تک۔" اس نے کہا اور ہم دونوں اٹھ گئے۔ ایلس کے ساتھ میں اور پیٹریشا اس کمرے میں پہنچ گئے جہاں تابوت پڑا ہوا تھا وہی تابوت جس میں نوٹ لائے تھے۔ اس کے گرد بڑی کرسیوں پر اس نے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ہم بیٹھ گئے۔

" میں آپ دونوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ مسٹر مسعود اور مس پیٹریشا۔ اس کے ساتھ ہی آپکو اپنی مختصر کہانی سناؤں گا میں دنیا کا بدترین انسان ہوں دوستو۔ میں نے پہلے بھی اپنی کہانی کا ایک مختصر حصہ سنایا تھا جو سو فیصدی سچ تھا۔ میرا خاندان برطانیہ کا مشہور خاندان ہے لیکن مجھے اس خاندان کا سرمایہ نہیں مل سکا۔ کیونکہ میرے باپ کے دشمنوں نے مجھے اغواء کر لیا تھا اور پھر انھوں نے میرے باپ کو اطلاع بھی دیدی کہ وہ مجھے ہلاک کرنے کے بجائے جرائم کے راستے پر ڈالیں گے۔"

اس واقعے کو کافی شہرت ملی تھی۔ پولیس نے مجھے تلاش کرنے کی کافی

کوشش کی لیکن ناکام رہی اور ایک طویل عرصہ میں نے ان لوگوں کے ساتھ گزارا ۔ میں ان کی سازش سے لاعلم تھا اور جب مجھ پر یہ سازش منکشف ہوئی تو میں اپنے اہل خاندان سے ملنے کے لئے بے چین ہو گیا۔

میری ماں کا انتقال ہو چکا تھا اور میرا باپ کچھ اور عزت اور شہرت حاصل کر چکا تھا ۔ میں نے جب اس سے اپنا تعارف کرایا تو وہ بھونچکا رہ گیا۔ لیکن مجھے اس خاندان میں قبول کرنے سے اس نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ میں اس خاندان میں کسی ایسے انسان کا وجود برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنی بے گناہی کا رونا رویا لیکن ۔ میری ایک بات نہ سنی گئی ۔ میں اپنے باپ کے ذہن سے نکل گیا تھا۔

تب میں مایوس ہو گیا اور اسی مایوسی نے میرے اندر انتقام کا جذبہ پیدا کیا۔ میں نے اس گروہ سے بغاوت کر دی اور اس کے کئی ممبر میرے ہاتھوں مارے گئے ۔ میں ان لوگوں کا تعاقب کرتا ہوا ہی تمہارے ملک پہنچا تھا۔ وہاں میں ان کا شکار ہو گیا۔"

"تم ۔"؟ میں تعجب سے چونک پڑا۔

"ہاں ۔ اس رات گروہ کے کچھ افراد مجھ پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے اور رسی کے پھندے کے ذریعے مجھے ہلاک کر دیا گیا۔"

"ہلاک کر دیا گیا۔"؟ پٹریشا چونک پڑی ۔

"ہاں مس پٹریشا۔ اس وقت میں مردہ تھا جب آپ نے مجھے پایا۔"

"لیکن لیکن ۔"؟

"لیکن میری روح نے یہ موت قبول نہیں کی اور میں ۔ میں نے آپ کے سامنے آنکھیں کھول دیں ۔ زندگی میں مجھے اپنے خاندان میں جگہ نہیں ملی لیکن موت کے بعد میں اس خاندان میں رہنا چاہتا تھا۔"

"تو تم زندہ نہیں ہو۔" میں نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں ۔" وہ افسردگی سے بولا۔ "میری آخری خواہش یہ ہے کہ مجھے

میرے آبائی قبرستان میں دفن کیا جائے اور اس کے لئے میں نے آپ لوگوں کا سہارا لیا ہے۔"

"لیکن ۔ لیکن ۔" میں نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

" روح پر کچھ پابندیاں ہوتی ہیں ۔ میں ہر ایک کو اپنا حال دل نہیں سنا سکتا تھا ۔ یہ بے پناہ دولت میں نے ان لوگوں کے درمیان رہ کر حاصل کی ہے ۔ یہ ڈالر اصلی ہیں اور ان میں کوئی نوٹ جعلی نہیں ہے ۔ میں آپ کے کام آیا ہوں اس لئے آپ لوگ میرے کام آئیں۔"

" اوہ۔ لیکن ایلس ۔"؟

"تابوت میں میری لاش ہی تھی ۔ اصلی لاش دیکھ کر کسٹم حکام مطمئن ہو گئے تھے ۔ لیکن اس کے بعد میں نے تابوت خالی کر دیا۔"

" اور یہ نوٹ ۔"؟

" میں نے عرض کیا نا یہ میری ملکیت ہیں آپ کو زندگی کے کسی حصے میں ان نوٹوں کی وجہ سے کوئی تکلیف نہیں ہو گی ۔ مجھے یقین ہے میرے دوست کہ آپ میری یہ آخری خواہش ضرور پوری کریں گے۔ میرا خاندان بہت مشہور ہے ۔ اب یہ آپ کا کام ہے کہ مجھے خاموشی سے وہاں دفن کر دیں ۔ میرا کام ختم ہو چکا ہے اور اب آپ کا اخلاقی فرض ہے کہ آپ۔ ایک حرماں نصیب کی آخری خواہش پوری کر دیں ۔"

وہ اٹھا اور تابوت میں جا کر لیٹ گیا۔ پٹریشا دہشت سے مجھ سے چمٹ گئی ۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی بمشکل تمام میں نے اسے سہارا دیا اور پھر میں نے تابوت میں لیٹے ہوئے ایلس کو دیکھا۔ اس کا چہرہ بدرونق تھا اور زندگی کی کوئی رمق اس کے وجود میں موجود نہیں تھی ۔

خونی تجربہ

میں جانتا تھا کہ فیصلہ کیا ہو گا۔ میں نے جرم کیا تھا اور اس کا اعتراف بھی کر لیا تھا۔ کئی افراد قتل ہوئے تھے میرے ہاتھوں اور میں نے یہ بات عدالت کے سامنے تسلیم کی تھی۔ پھر کیا گنجائش رہ جاتی تھی کہ میرے ساتھ رعایت ہو۔ پتا نہیں عدالت اس سلسلے میں پس و پیش کیوں کر رہی تھی۔ بہرحال خون کا بدلہ خون ہو گا۔ ہاں زندگی کے کچھ لمحات باقی تھے۔ سانسیں پوری ہو رہی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ اس کے بعد کیا ہو گا۔

لیکن۔ میں نہیں جانتا تھا۔ کوئی کچھ نہیں جانتا۔ قانون قدرت میں لچک نہیں۔ انسان آخری فیصلہ کرنے پر قادر نہیں ہے۔ ہرگز نہیں ہے۔

جیل کی راتیں پر سکون تو نہیں ہوتیں۔ یہ تو اپنا خیال ہے جیسے کوئی بھی نام دے دیا جائے۔ ایسی ہی بے سکون رات تھی کہ اچانک کان پھاڑ دینے والے دو دھماکے ہوئے ایسے خوفناک دھماکے کہ جو اعصاب شل کر دیتے ہیں۔ پھر ایک شور ۔ بے پناہ شور۔

جیل توڑ دی گئی تھی۔ قیدی بھاگ رہے تھے۔ گولیاں چل رہی تھیں۔ سائرن بج رہے تھے۔ قیدی ایک دوسرے کو نکل جانے کی ترغیب دے رہے تھے۔ بخدا میں خود فرار نہیں ہوا تھا۔ کسی نے میرا ہاتھ پکڑا تھا اور میں ٹھوکریں کھاتا دوڑ پڑا تھا۔ اور اس کے بعد بھی جو کچھ ہوا تھا عالم سحر میں ہوا تھا۔ نہ جانے کیسے کیسے مراحل طے کیے تھے میں نے لیکن صرف اعضاء ساتھ دے رہے تھے۔ ذہن سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

جس شخص نے میرا ہاتھ پکڑا تھا' میں نے ٹھیک سے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔ اس وقت بھی اس پر غور نہیں کیا تھا جب وہ ایک گھر کی چار دیواری کود کر اندر داخل ہوا تھا اور اس وقت بھی ہم دونوں نے لباس تبدیل کر کے

ُریف شہریوں کا حلیہ اختیار کیا تھا۔ ریلوے اسٹیشن پر روشنی میں' میں نے اس کا ره دیکھا تھا اور میرا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ چہرے کے جھاڑ جھنکاڑ بتاتے تھے کہ ہ کافی عمر رسیدہ ہے لیکن اس کی آنکھوں کی جگہ دو گہرے گڑھے تھے۔

ناممکن۔ ناقابل یقین۔ اس کی اب تک کی حرکات آنکھوں والوں سے ںلف نہیں تھیں۔ جبکہ وہ میں متحیر رہ گیا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

"اب سے تھوڑی دیر کے بعد شہر سے باہر جانے والے تمام راستے بند کر یئے جائیں تاکہ مفرور قیدی فرار نہ ہو سکیں۔ اس لیے فوراً ٹرین میں سوار ہو جانا ہیے"۔ میں نے اس سے اختلاف نہیں کیا تھا اور چند لمحوں بعد ہمارا سفر جاری ہو ا تھا۔

"میرے ساتھ چلنا پسند کرو گے ؟"۔ بوڑھے نے پوچھا۔

"کہاں"۔

"میری بستی۔ خیال پور ہے اس کا نام ؟"۔

"مجھے اعتراض نہیں ہے"۔

"کیا نام ہے تمہارا؟۔ ویسے ہم صرف نام کی حد تک آشنا ہوں گے۔ کیا نام ، تمہارا؟"۔

"نادر خان" میں نے جواب دیا۔

"میرا نام شہباز ہے۔ بس شہباز ہے' نہ کچھ آگے نہ پیچھے۔"

"تم۔ تم پیدائشی اندھے ہو"؟۔ میں نے پوچھا۔ یہ سوال مجھ پر بری طرح لط تھا۔

"نہیں" بوڑھے نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر ا۔ "چند سال پہلے میرے چہرے پر دو روشن آنکھیں تھیں"۔

"پھر"؟۔

"یہ آنکھیں دشمنی کا شکار ہو گئیں۔ میرے دشمن نے میری دونوں آنکھیں

"اوہ ۔ کون تھا وہ ؟"۔

"تھا نہیں ۔ تھی اور ہے"۔ بوڑھے کے لہجے میں بے پناہ نفرت تھی ۔

"کیا دشمنی تھی اس سے"؟۔

"ابھی نہیں بتاؤں گا دوست' اس کے لیے کچھ انتظار کرو"۔

"اچھا تمہاری مرضی لیکن ایک بات پر مجھے حیرت ہے ۔ وہ یہ کہ تم کسی طور پر اندھے نہیں معلوم ہوتے ۔ تمہاری تمام حرکات آنکھوں والوں کی سی ہیں ۔ جیل کی تاریک چار دیواری میں تم نے جس انداز میں راستہ تلاش کیا تھا وہ میرے لیے بڑی حیرت انگیز بات تھی"۔

"ہاں انسان جب کبھی کسی حس سے محروم ہو جاتا ہے تو اس حس کی کمی دوسری چند خصوصیات پوری کر دیتی ہیں ۔ میرا ذہن میری آنکھیں ہیں' میرے کان میری آنکھیں ہیں ۔ میرے کان ضرورت سے زیادہ حساس ہیں ۔ میں ہوا کی سرسراہٹ سے بہت سی باتوں کا پتہ چلا لیتا ہوں میں قدموں کی چاپ سے انسان کی پوری شخصیت پہچان لیتا ہوں اور بھی بہت سی خصوصیات ہیں جو تم پر آہستہ آہستہ کھل جائیں گی ۔ انتظار کرو ۔

"ٹھیک ہے"۔ میں نے گہری سانس لے کر کہا اور پھر راستے بھر میں بوڑھے شہباز کی پراسرار شخصیت کا جائزہ لیتا رہا۔

میرے ذہن کی چولیں ہل گئی تھیں ۔ ہر قدم پر یہ شخص نمودار ہوتا تھا۔

بہرحال وہ پہاڑی اسٹیشن جس کا نام خیال پور تھا آگیا۔ میں نے تو اس وقت تک اسٹیشن کا بورڈ بھی نہیں دیکھا تھا لیکن بوڑھا شہباز اس وقت اونگھ رہا تھا اور اچانک وہ اونگھتے اونگھتے چونک پڑا ۔ اس نے چہرہ اٹھا کر فضا میں کچھ سونگھا اور پھر مجھے ٹٹولنے لگا۔

"کیا تم سو رہے ہو قادر ؟۔ اگر سو رہے ہو تو جاگو' ہماری منزل آگئی ہے"۔

"میں جاگ رہا ہوں شہباز' لیکن تم نے کیسے اندازہ لگایا کہ آنے والا اسٹیشن

خیال پور ہے"؟۔ اور میری اس بات پر بوڑھے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی ۔

"یہ نہ پوچھو ۔ یہ سب کچھ نہ پوچھو۔ اپنی زمین کی خوشبو روئیں روئیں میں بسی ہوتی ہے ۔ بشرطیکہ تمہارے دل میں وطن کی سچی محبت ہو"۔ یہ ہوائیں مجھے میری سرزمین کی آمد کا پیغام دے رہی ہیں"۔ اس نے جواب دیا۔ اور درحقیقت آنے والا اسٹیشن خیال پور ہی تھا۔

ہم دونوں ٹرین سے نیچے اتر گئے ۔ بوڑھا اسی انداز میں آگے بڑھ رہا تھا کہ جیسے سارے راستے اس کے جانے پہچانے ہوں' میں اس کا ساتھ دے رہا تھا ۔ اسٹیشن سے نکل کر ہم بستی میں داخل ہو گئے ۔ اچھی خاصی پکی آبادی تھی' جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ سورج ڈوبنے کے قریب تھا۔ زندگی کی گہما گہمی ماند نہیں پڑی تھی ۔ لوگ اپنے کاموں میں مصروف تھے ۔

بوڑھا شہباز چلتے چلتے رک جاتا اور پھر چلنے لگتا ۔ ایک جگہ رک کر اس نے کہا۔

اپنے بائیں طرف دیکھو قادر' کیاجا تمہیں سرخ رنگ کا ایک مینار نظر آ رہا ہے"؟۔

"ہاں مینار موجود ہے"۔ میں نے بائیں سمت دیکھتے ہوئے کہا۔

"اندازاً کتنے فاصلے پر ہوگا؟"۔

"تقریباً سو گز پر"۔

"ہوں"۔ بوڑھے نے گردن ہلائی اور پچیس تیس قدم چلنے کے بعد وہ دائیں سمت مڑ گیا۔ اس طرف ایک پتلی سی گلی تھی ۔ گلی کافی پتلی معلوم ہوتی تھی ۔ گلی کے آخری سرے پر بستی کا آخری مکان تھا اس کے بعد کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا' جو حد نگاہ پھیلا ہوا تھا۔ اور ہم کھیتوں کے درمیان ایک پگڈنڈی پر ہو لیے ۔ بوڑھا شہباز خاموشی سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے ۔ سورج ڈوب گیا تھا ۔ اب کھیتوں میں تاریکی کی دبیز چادر پھیلتی جا

رہی تھی۔ چلتے چلتے میں تنگ آ گیا۔ تب میں نے بوڑھے سے پوچھا۔
"تم نے کہا تھا۔ یہی بستی تمہاری بستی ہے"۔
"ایں"؟۔ بوڑھا چونک پڑا"۔ کیا کہا تم نے ؟"۔
"میں کہہ رہا تھا کہ تم دیکھ نہیں سکتے۔ اپنے ذہن کی آنکھ سے دیکھو کہ سورج چھپ چکا ہے اور تاریکی پھیلتی جا رہی ہے اور ہم طویل و عریض کھیتوں کے درمیان چلے جا رہے ہیں۔ بستی کا آخری مکان بھی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے آخر ہم کہاں جا رہے ہیں ؟"۔
"اوہ۔ بس تھوڑی دور ان کھیتوں کے اختتام پر جنگلات کا سلسلہ شروع ہو گا۔ بس وہیں ہماری قیام گاہ ہو گی"۔
"جنگلوں میں"؟۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔
"ہاں۔ میں کسی قدر تنہائی پسند بھی ہوں اور پھر ایک طویل عرصے تک میں اپنی قیام گاہ سے دور رہا ہوں۔ بہرحال اب ہمیں زیادہ نہیں چلنا پڑے گا"۔
کھیتوں کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے رات ہو چکی تھی۔ جنگلات کا سلسلہ گہری تاریکی میں لپٹ گیا تھا۔ مجھے تو تھوڑے فاصلے کی چیز بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ لیکن سماعت کی بینائی سے مرقع شہباز اس وقت حیرت انگیز ثابت ہو رہا تھا وہ اچھی خاصی رفتار سے چل رہا تھا اور اس نے میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ اور سچ مچ میں اس عمارت کو نہیں دیکھ سکا جس کے دروازے پر اس نے مجھے لا کھڑا کیا تھا۔ پتہ تو اس وقت چلا جب دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے کسی پرانی عمارت کا طویل عرصہ سے بند دروازہ کھلا ہو۔ چوں چر کی آوازیں بلند ہوئیں اور پھر بوڑھے شہباز کی آواز سنائی دی۔
"کیا خوفزدہ ہو"؟۔ بوڑھے کی بات مجھے بالکل پسند نہیں آئی تھی۔ اس لیے میں نے اس کا جواب ہی نہیں دیا۔ اس نے چونک کر میرے ہاتھ کو ٹٹولا اور پھر اسے پکڑ کر بولا۔ "غیر معمولی طور پر خاموش ہو، کیا بات ہے"؟۔
"کچھ نہیں، تم بار بار احمقانہ گفتگو کرنے لگتے ہو۔ بھلا میں دنیا میں کسی چیز

ے خوفزدہ ہو سکتا ہوں"۔ میں نے ناگواری سے کہا۔
"اوہ۔ مجھے افسوس ہے واقعی میں نے غلط جملے استعمال کیے ہیں۔ مگر تمہاری
اموشی کیا معنی رکھتی ہے"؟۔
"بس میں حیران ہوں۔ میں اس عمارت کو بھی نہیں دیکھ سکا تھا"۔ میں نے
اب دیا۔ اور شہباز نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔
"کافی تاریکی ہے شاید"۔
"ہاں"۔ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔
"میرا ہاتھ پکڑ کر چلتے رہو۔ آؤ"۔ اس نے کہا۔ اور میں اس کے ساتھ چل
ا۔ اندازا نہیں ہو رہا تھا کہ یہ کیسی عمارت ہے۔ مجھے تو اس کے در و دیوار تک
ں نظر آ رہے تھے۔ لیکن اندھا شہباز موڑ مڑ رہا تھا۔ ویسے کافی وسیع عمارت
وم ہوتی تھی۔ کیونکہ اندر داخل ہونے کے بعد بھی کافی دیر تک چلنا پڑا تھا۔ پھر
ھا رکا اور اس نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ میں ایک گہری سانس لے کر اس کے
ۃ اس کمرے میں داخل ہو گیا لیکن تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا۔ کمرے میں سیلن
بو بالکل نہیں محسوس ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کشادہ اور ہوادار ہے
کسی طرف سے اس میں ہوا آتی ہے"۔
"ٹھہرو" میں تمہارے لیے روشنی کر دوں۔ میں نے لفظ تمہارے لیے ٹھیک
ال کیا ہے۔ ظاہر ہے میرے لیے روشنی اور تاریکی یکساں ہے۔ ہے نا"؟۔
نے کہا۔ میں نے اس وقت بھی خاموشی مناسب سمجھی تھی۔ لیکن تھوڑی دیر
بعد کمرے میں ایک شمعدان روشن ہو گیا۔ پہلے ایک شمع جلی تھی اور اس کے
تعدد۔ خاصی روشنی ہو گئی تھی۔
"ٹھیک ہے"۔ اس نے پوچھا۔
"ہاں"۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ میں کمرے میں کی ہوئی آرائش دیکھ رہا تھا
روں طرف انتہائی پرانے طرز کا فرنیچر موجود تھا۔ فرش پر سرخ رنگ کا ایک
قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف حسین مسہری بھی تھی۔ غرض ہر لحاظ سے اسے

ایک قیمتی کمرہ کہا جا سکتا تھا۔ جس سے بوڑھے کے ذوق کا پتا چلتا تھا۔

"یہ عمارت تمہاری ہے؟"۔ میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ آبائی پشتوں کی"۔ اس نے جواب دیا۔

"لیکن کیا یہاں تمہارے سوا اور کوئی موجود نہیں ہے"۔

"ہے۔" اس نے کہا۔

"کون ہے؟۔"

"میرے دو ملازم"۔

"اوہ۔ مگر عمارت تو ویرانے میں ہے۔ یہاں وہ لوگ کس طرح رہتے ہوا
گے؟"۔

"وہ بھی میری طرح سکون پسند ہیں۔ اس لیے انہیں یہاں رہنے میں کوا
اعتراض نہیں ہے"۔ شہباز نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔"
سکون کی جگہ ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ہم نہایت کامیابی سے یہاں تک آپہنچے۔ ا
یہاں ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اول تو پولیس جیل سے مفرور قیدیوں کو تلاش کر
یہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔ اور اگر پہنچ بھی گئی تو اسے اس ویران عمارت میں
نہیں ملے گا۔ یہاں داخل ہونے والے باہر کے لوگ۔ یہاں کچھ نہیں تلاش
سکتے"۔

"ہاں۔ یہ جگہ مجھے ایسی ہی لگتی ہے"۔ میں نے جواب دیا۔

"تم بھوکے ہوگے میں تمہارے لیے کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔ مجھے
حد مسرت ہے کہ تم بے جگر انسان ہو اور خوفزدہ ہونے والوں میں سے نہیں ہو
یہاں تمہیں جو کچھ نظر آئے، اس سے متاثر ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیو
یہاں سب ہمارا اپنا ہے"۔

"ٹھیک ہے بڑے میاں، آپ میرے لیے پریشان نہ ہوں"۔ میں نے جوا
دیا اور پراسرار بوڑھا مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں آر
کرسی پر دراز ہوگیا۔ اور درحقیقت میں یہاں خوفزدہ نہیں تھا۔ اور میری ا

کیفیت کا جواز یہ ہے کہ میں نے طویل عرصہ موت کے تصور میں گزارا تھا۔ خوف کی بنیادی وجہ تکلیف، آزار یا موت ہوتی ہے۔ یعنی اس سلسلے میں موت آخری اسٹیج ہوتی ہے اور میں اس اسٹیج میں تھا۔ ایک جذباتی مقصد کے تحت میں نے موت اپنائی تھی اور مجھے زندگی سے دلچسپی ہوتی تو اول تو میں اپنے باپ کی موت کا انتقام لینے کے لیے اتنا بھیانک کھیل ہی نہ کھیلتا۔ یا پھر انتقام لینے کے بعد وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرتا۔ لیکن میں نے خوشی سے خود کو موت کے حوالے کر دیا تھا۔ گویا مجھے اب زندگی کی ضرورت نہیں تھی۔ اور اب میں سپرمین بننے کی کوشش نہیں کروں گا۔ جب مجھے سزائے موت سنائی گئی تو میں نے موت کے بارے میں سوچا ضرور تھا لیکن وہی عزم، وہی استقلال قائم رہا تھا یعنی میں نے اپنی زندگی کی حدیں اپنے مقصد سے منسلک کر دی تھیں۔ اس لیے مجھے موت سے ڈر نہیں لگا تھا۔ نجانے اس بوڑھے کی باتوں نے کیوں اس قدر مجھے جلد متاثر کر لیا تھا اور اب زندگی کی طرف آ کر بھی میں پشیماں نہیں تھا۔ بلکہ اب تو مجھے زندگی سے دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ لیکن میں عام انسانوں سے زیادہ بے جگر تھا۔ میں اس ماحول سے قطعی خوفزدہ نہیں تھا۔ ہاں اس کے بارے میں سوچ ضرور رہا تھا اور اس سوچ کی وجہ قدرتی تھی۔

بوڑھا بے حد پراسرار تھا۔ وہ آنکھوں سے اندھا تھا مگر اس کی آنکھیں موجود ہوتیں اور صرف بینائی کھو جانے کی بات کرتا تو شاید ذہن تسلیم نہ کرتا۔ میں سوچتا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ لیکن آنکھوں کی جگہ دو غار اس کی سچائی کا ثبوت تھے۔ اور پھر اس کی بے پناہ صلاحیت جو شاید آنکھوں والوں کو بھی نصیب نہیں تھی۔ حیرت انگیز بات تھی۔ پھر اس عمارت کا ماحول، لیکن وہ مجھے یہاں لایا کیوں ہے؟۔ اور اب اس عمارت میں آ کر میں کیا کروں گا۔

نہ جانے ان سوچوں میں کس قدر وقت ہو گیا۔ پھر دروازے پر ہلکی سی آہٹ سن کر ہی میں چونکا تھا۔ دروازہ کھل رہا تھا۔ اور پھر بوڑھے کے بجائے ایک اور شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے تھی جو اس نے

انتہائی تہذیب سے ایک میز پر رکھ دی اور پھر پانی وغیرہ رکھ کر سیدھا ہوا تو میں بری طرح چونک پڑا۔ آہ۔ اس کی بھی دونوں آنکھیں غائب تھیں۔ اور ان کی جگہ دو گہرے غار تھے۔ سیاہ گہرے غار۔ میں ششدر رہ گیا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے صاف محسوس کیا تھا کہ کھانا لانے والے نے اپنے قریب میری موجودگی کو بخوبی محسوس کر لیا تھا۔ پھر وہ نرم آواز میں بولا۔

"کھانا کھا لیجیے جناب"۔

"اوہ۔ ہاں ٹھیک ہے۔ سنو کیا تم اندھے ہو؟"۔ میں نے پوچھا۔ لیکن وہ اسی طرح واپس مڑ گیا جیسے اندھا ہی نہ ہو بہرا بھی ہو۔ اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں نے طویل سانس لے کر شانے ہلائے اور پھر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جہنم میں جائے سب کچھ، خواہ یہ اندھوں کی نگری ہو یا بہروں کی۔ میں جیل سے باہر نکل آیا تھا اور اب زندگی میری اپنی ہے۔ بوڑھا شہباز بے شک مجھے جیل سے نکالنے میں میرا معاون ہے، میرا مددگار ہے لیکن اب اپنی زندگی میں، میں اس کا پابند تو نہیں ہوں۔ جب تک دل چاہے گا رہوں گا اور دل چاہے گا تو یہاں سے نکل جاؤں گا"۔

میں نے ڈٹ کر کھانا کھایا۔ بہت عمدہ کھانا تھا اور پھر میں برتن ایک طرف سرکا کر ملحقہ باتھ روم میں گیا۔ دانت وغیرہ صاف کیے۔ شیو کافی دن سے نہیں بنایا تھا، وہ بنایا۔

بہرحال اس وقت میں نے اس کمرے سے باہر نکلنا مناسب نہیں سمجھا۔ جاتا بھی کہاں؟۔ چنانچہ میں مسہری پر لیٹ گیا۔ اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ عرصہ کے بعد احساس ہو رہا تھا کہ جیل کے بجائے گھر میں ہوں۔ اب وہ گھر کسی کا بھی ہو۔ زمین پر ٹاٹ بچھا کر سوتے ہوئے نجانے کتنا وقت گزر چکا تھا۔ آرام دہ مسہری عجیب سی لگی۔ اور جیسے نیند تو تلی بیٹھی تھی۔ گہری نیند سو گیا اور دوسرے دن صبح کو ہی آنکھ کھلی۔

ناشتہ بوڑھے نے میرے ساتھ ہی کیا تھا اور ناشتے کے لیے ہم جس کمرے

میں گئے وہ بھی باقاعدہ ڈرائنگ روم تھا۔ جس میں اخروٹ کی لکڑی کی منقش میز اور ایسی ہی کرسیوں کا سیٹ تھا۔ برتن بھی نہایت قیمتی تھے۔ بوڑھا خاصا صاحب حیثیت تھا۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے کہا۔

"شہباز۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہاں کے حالات دیکھ کر تمہاری شخصیت کو محسوس کر کے تجسس اس قدر بڑھ گیا ہے کہ میں تمہارے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہو گیا ہوں۔ کیوں نہ ایسا کیا جائے کہ ہم دونوں اپنا عہد توڑ دیں۔ تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ اور میں تمہیں اپنے بارے میں"۔ میری بات سن کر بوڑھے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اس کے بجائے کیوں نہ ہم کام کی باتیں کریں؟"۔ اس نے کہا۔

"لیکن میرا تجسس؟"۔

"تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟"۔

"نہیں۔ لیکن میں تمہارے اندھے ملازم کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں"۔

"ایں۔ کیا جاننا چاہتے ہو اس کے بارے میں؟"۔

"کیا تمہارا دوسرا ملازم بھی اندھا ہے؟"۔

"ہاں"۔

"واقعی؟"۔ میں اچھل پڑا۔

"ہاں۔ میں غلط نہیں کہہ رہا"

"لیکن معاف کرنا، یہ اندھوں کی ٹیم تم نے کیوں جمع کی ہے؟"۔

"اسے میرا کمپلیکس سمجھ لو۔ میں خود اندھا ہوں، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ میرے ساتھ بھی اندھے ہوں۔" بوڑھے نے مسکرا کر جواب دیا۔

"لیکن تم خصوصی حسیات کے مالک ہو۔ کیا یہ ملازم بھی تمہاری طرح ہیں؟"۔

"ہاں۔ یہ پوری عمارت کی نگرانی کرتے ہیں۔ باورچی خانے میں کھانا پکاتے ہیں۔ کمروں کی صفائی کرتے ہیں۔ کوئی ایسا کام نہیں جو یہ نہ کر سکیں"۔

"لیکن پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟۔ اور تم کہہ چکے ہو کہ تم پیدائشی اندھے نہیں ہو"۔

"ہاں ۔ میں نے غلط نہیں کہا ۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو ۔ آؤ میں تمہیں یہ عمارت دکھاؤں ۔ ناشتہ کی میز سے بوڑھا اٹھ گیا۔ اس نے میرا یہ سوال بھی تشنہ چھوڑ دیا تھا۔ میں اس کے ساتھ اٹھ گیا۔ اور پھر اس نے مجھے یہ کھنڈر نما عمارت دکھائی ۔ در حقیقت تاحد نگاہ ویران جنگلوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اس کھنڈر کی موجودگی بھی حیرت انگیز تھی ۔ نہ جانے آبادی سے دور یہ عمارت کس لیے بنائی گئی تھی ۔ بوڑھا مجھے ایک ایک جگہ کے بارے میں بتاتا رہا اور پھر واپس اپنے کمرے میں آگیا۔

"بیٹھو"۔ اس نے طویل سانس لے کر خود بھی بیٹھتے ہوئے کہا ۔ اور میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اور بوڑھا کسی سوچ میں گم تھا۔ کافی دیر خاموشی سے گزر گئی۔

"میرا خیال ہے تم خصوصی طور سے مجھے اپنے بارے میں بتانا نہیں چاہتے"۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے ۔ میں تمہیں بہت جلد اپنے بارے میں سب کچھ بتادوں گا۔ بہت جلد"۔ اس نے پر خیال انداز میں کہا۔ اور میں خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اپنے بارے میں چھپانا چاہتا ہے ۔ تو مجھے بھی اتنا کریدنا نہیں چاہیے میرا کیا ہے' جب دل چاہے گا یہاں سے چلا جاؤں گا۔ کس کی مجال ہے کہ مجھے روک سکے ۔ اس کے بعد میں نے اس بوڑھے سے کوئی بات نہیں کی ۔ وہ بھی تھوڑی دیر خاموش رہا ۔ پھر ایک گہری سانس لے کر اٹھتے ہوئے کہا۔

"اچھا تم آرام کرو ۔ میں چلتا ہوں ۔ اور ہاں ذہن میں کسی وسوسے کو جگہ دینے کی ۔ ضرورت نہیں ہے ۔ میرے ساتھ رہ کر تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی"۔

"تم بالکل فکر مت کرو ۔ میں نے دوبارہ زندگی قبول کرلی ہے اور اب میں اس کے ساتھ پورا پورا انصاف کروں گا"۔

"یقیناً" ۔ یقیناً"۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا ۔ اور پھر دروازے سے باہر نکل گیا ۔ میں اب یہاں سے کسی حد تک اکتاہٹ محسوس کرنے لگا تھا اور دوسرے انداز میں سوچ رہا تھا ۔ کیوں نہ راہ فرار اختیار کی جائے ۔ جو فاصلہ طے کرکے میں یہاں تک پہنچا تھا اس سے واپس بھی جا سکتا تھا ۔ کون روکنے والا تھا ۔ تھوڑی دیر اور سہی ۔

اور پھر میں مسہری کی طرف بڑھ گیا۔ لیٹ گیا۔ اس کے علاوہ اور کام بھی کیا تھا ۔ لیکن اب ۔ اب کیا کرنا چاہیے ۔ یہاں سے کہاں جاؤں ؟۔ کس طرح زندگی بسر کروں' ظاہر ہے پولیس میرا تعاقب کرے گی ۔ میں قاتل تھا اور سزائے موت کا مجرم مہذب دینا میں پتا نہیں میرے خلاف کیا کیا کاروائیاں ہو رہی ہوں ۔ لیکن جب زندگی سے ہاتھ ہی دھو لیے تھے ۔ جب اپنے آپ کو مردہ ہی تصور کر لیا تھا تو اب زندہ رہنے کے لیے خوف بے معنی تھا ۔ آنکھ مچولی میں کوئی حرج نہیں تھا ۔ زندہ بچ گیا تو ٹھیک ہے ۔ اور پولیس کی گولی دل میں اتر گئی تو بہرحال موت تو آنی ہے لیکن اب اس بوڑھے سے کچھ گھن سی محسوس ہونے لگی تھی ۔ اونہہ' اس بور ماحول میں زندہ رہنا ہی بے مقصد ہے ۔ جب زندگی کا کوئی تصور ہی نہیں تو پھر کیوں نہ چند سانسیں زندگی سے بھرپور ماحول میں گزاری جائیں ۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ بہت جلد یہاں سے چلا جاؤں گا۔

دوپہر ہوئی اور پھر شام ہوگئی ۔ رات کے کھانے پر بھی بوڑھا میرے ساتھ تھا۔ کوئی خاص گفتگو نہیں ہوئی اور مجھے کھانے کے بعد آرام کی تلقین کر کے چلا گیا ۔ میں بھی بیزار کمرے میں واپس آگیا ۔ اب تو بالکل ہی دل اکتا گیا۔ میں نے سونے کی کوشش کی اور ذہن نیم غنودہ ہوگیا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا گیا تھا۔

اچانک مجھے احساس ہوا جیسے اس کمرے میں میرے علاوہ بھی کوئی موجود ہے ۔ اس کا احساس گہرے گہرے سانسوں سے ہوا تھا اور سانسوں کی آواز اتنی تیز تھی جیسے خراٹے لیے جارہے ہوں ۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ شاید میری سماعت کا دھوکا

ہے لیکن سانس اتنے تیز تھے کہ ذہن کی غنودگی دور ہو گئی ۔ اور آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھنے لگا ۔ لیکن شمع دان کی روشنی میں کوئی نظر نہیں آیا۔ پھر یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے ۔ پورے طور سے غور کیا تو احساس ہوا کہ مسہری کے نیچے سے تیز سانسوں کی آواز آ رہی ہے ۔ میں اچھل کر نیچے کود آیا ۔ یہ حیرت انگیز بات تھی ۔ بھلا کون ہو سکتا تھا ۔ بے ساختہ میں نیچے جھکا ۔ اور پھر اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ یقیناً کوئی موجود تھا۔ دو پاؤں سامنے ہی نظر آ رہے تھے ۔ چونکہ شمعدان کی روشنی مسہری کے اس رخ پر نہیں آ رہی تھی اس لیے ۔ یہ انداز نہیں ہو سکا کہ یہ پاؤں بوڑھے شہباز کے ہیں یا اس کے نوکر کے ۔ بہرحال میں نے کوئی تکلف نہیں کیا اور اطمینان سے دونوں پاؤں پکڑ لیے اور زور سے باہر گھسیٹ لیا ۔ اس کے ساتھ ہی ایک نسوانی چیخ کمرے میں گونجی ۔ چیخ کے ساتھ ہی میں نے گھبرا کر پاؤں چھوڑ دیئے اور اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔

لیکن میں نے جس حالت سے اسے گھسیٹا تھا' اس سے وہ پوری طرح باہر آئی اور اپنے کمرے میں ایک حسین اور نوجوان دوشیزہ کو دیکھ کر میری آنکھیں متحیرانہ انداز میں پھیل گئیں ۔ جو کچھ ہو رہا تھا ناقابل یقین تھا ۔ کیونکہ اب تک میں نے صرف بوڑھے شہباز کو دیکھا تھا یا اس کے دونوں اندھے ملازموں کو ۔ اب تک نہ تو کسی لڑکی کے بارے میں سنا تھا نہ ہی ایسے آثار نظر آتے تھے ۔

وہ متحیرانہ انداز میں پلکیں جھپکا رہی تھی جیسے سونے سے جاگنے والے وقتی طور پر خالی الذہن ہوتے ہیں ۔ اس کے چہرے کی تراشی عجیب سی تھی ۔ عمر کا کوئی تعین نہیں کیا جا سکتا تھا ۔ ایک نگاہ میں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک سادہ سی لڑکی ہے ۔ لیکن بغور دیکھنے سے چہرے پر بے حد سفاکی نظر آتی تھی ۔ ہونٹوں کی تراشی میں ایک نمایاں خصوصیت تھی ۔ اس کے بدن پر سیاہ چست پتلون اور سفید مردانہ قمیض تھی ۔ بالوں کا اسٹائل کافی خوبصورت تھا اور اس کے پلکیں جھپکانے کا انداز ۔

یوں محسوس ہوا جیسے وہ حواس کی دنیا میں واپس آ گئی ہو ۔ اس نے دونوں کہنیاں زمین پر لٹکائیں اور بدن کو تھوڑا سا اٹھایا اور پھر ایک بے تعلق سی کراہ کے

ساتھ اٹھ کر بیٹھ گئی ۔ اس نے زور سے آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکی اور میری طرف دیکھنے لگی ۔

"کب آئے تم ؟" ۔ اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔ جیسے برسوں کی شناسا ہو ۔

"کیا مطلب ؟ ۔ کون ہو تم ؟ ۔" میں نے متحیرانہ انداز میں پوچھا۔

"نیلم ۔" اس نے بے پروائی سے جواب دیا ۔

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر ۔ لیکن آپ کون ہیں ؟ ۔ اور کہاں سے ازل ہوئیں ہیں ؟ ۔"

"اس مسہری کے نیچے سے ۔"

"سبحان اللہ ۔ کیا ابھی ابھی پیدا ہوئیں ہیں ؟" ۔

"نہیں ۔ میری عمر تو بائیس سال ہے ۔"

"تو اے بائیس سالہ حسینہ' اب اپنی شان نزول بھی بتا دے ۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو تم ؟ ۔ پورے چار گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہی ں ۔ وہ دونوں یقیناً" تلاش کر رہے ہوں گے ۔ بلکہ شاید مایوس بھی ہو چکے ہوں بس میں چھپ آئی اور سیدھی اس مسہری کے نیچے آ گھسی ۔ پتا نہیں کس وقت ند آ گئی تمہارا انتظار کرتے کرتے ۔"

"اوہ ۔" میں نے پریشانی سے گردن ہلائی' نہ جانے اس بھوت خانے میں کیا یا تھا ۔ اب اس لڑکی سے کیا کہا جائے ۔ اور یہ جو کچھ کہہ رہی ہے اسے کیا سمجھا ائے ۔ پتا نہیں کون ہے ؟ ۔ اور اس عمارت میں کہاں سے آ گئی ؟ ۔ شہباز سے اس کیا تعلق ہے ۔ بہت سے سوالات میرے ذہن میں مچل رہے تھے ۔ چند ساعت ں اس کی شکل دیکھتا رہا ۔ پھر نہ جانے کیوں اسے سہارا دینے کے لیے ہاتھ آگے ھا دیا ۔ سہارا قبول کر لیا گیا ۔ اس کا نازک ہاتھ میرے ہاتھ میں آ گیا ۔ تب وہ ٹھ گئی اور شکریہ کہہ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی ۔

"خدا کے لیے اب تو بتا دو کہ کون ہو تم ؟ ۔"

"ارے تم یہ نہیں جانتے ؟"۔

"جی نہیں۔"

"کہہ تو چکی ہوں کہ نیلم ہوں اور تمہیں اہم اطلاع دینے آئی تھی"۔

"اچھا تو فرمایئے۔ میں نے نچلا ہونٹ دانتوں میں بھینچ کر کہا۔

"بھاگ جاؤ فوراً۔ فوراً بھاگ جاؤ۔ بس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہوں گی۔"

"کیوں خیریت ؟۔ یہاں میری موجودگی آپ کو گراں گزر رہی ہے ؟۔" میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ اور اگر تم نیلم ہو تو نیلم ہوتی کیا چیز ہے ؟۔"

"بس بس' رہنے دو۔ میں سمجھ گئی تم میری بات کو کوئی اہمیت نہیں دے رہے۔ بھگتو گے خود۔ میں نے دوستانہ طور پر تمہیں بتا دیا ہے۔ اور اس کے لیے میں تمہارا چار گھنٹے سے انتظار کر رہی تھی۔" لڑکی کے انداز میں ایک عجیب سی کیفیت جھلک رہی تھی جیسے وہ صحیح الدماغ نہ ہو۔ میں غور سے اسے دیکھتا رہا اور پھر میں نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔

"شہباز سے تمہارا کیا رشتہ ہے ؟۔"

"موت کا رشتہ ہے۔ مارے جاؤ گے تم کتے کی موت اور پھر یاد کرو گے کہ میں نے کیا کہا تھا۔ بس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہوں گی۔ ارے مجھے تو ایسا لگ رہا ہے۔ جیسے تمہارے لیے وقت ضائع کیا ہو"۔ وہ جھلائے ہوئے انداز میں بولی۔ پھر کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔"

"ارے نہیں نہیں بیٹھو۔ تم تو مجھے بہت اچھی لڑکی محسوس ہوتی ہو"۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے اور اس نے ایک جھٹکے سے شانے چھڑا لیے۔

"بولو۔ جاؤ گے یا نہیں ؟۔" اس نے پوچھا۔

"تم یہیں رہتی ہو ؟"۔

"ہاں"

"تب تو مجھے یہاں سے نہیں جانا چاہیے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں کہتی ہوئی فضول باتیں مت کرو اور۔" اچانک اس کے حلق سے چیخ ں گئی۔ دروازہ بہت زور سے کھلا تھا۔ سب سے آگے شہباز اور اس کے پیچھے نوں ملازم اندر گھس آئے۔ تینوں کے چہروں پر خوفناک تاثرات تھے۔ شہباز منہ ھا کر کتے کی طرح سونگھنے لگا۔ اور پھر غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"ہوں۔ تو تم یہاں موجود ہو ؟۔"

"مم۔ میں تو ابھی آئی تھی ؟۔" لڑکی نے خوفزدہ لہجے میں اور اس کی نکھوں سے خوف ٹپکنے لگا۔

"چلو اسے یہاں سے لے جاؤ۔" بوڑھے نے کہا۔ اور دونوں ملازمین نے گے بڑھ کر لڑکی کے بازو پکڑے اور اسے خاصی بیدردی سے گھسیٹتے ہوئے باہر لے ئے۔ لڑکی نے منہ سے آواز نہیں نکالی تھی۔ شہباز کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی اری تھی۔ چند ساعت وہ سوچتا رہا اور پھر اس کے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کیا بکواس کر رہی تھی یہ بیوقوف لڑکی۔" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"جو کچھ بھی کہہ رہی تھی اس سے تمہیں سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ کیونکہ تم نے مجھے یہاں کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔" میں نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

"قادر تم بہت بے صبر انسان معلوم ہوتے ہو۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تمہیں سب کچھ بتادوں گا۔ لیکن نہ جانے کیوں تمہیں اس سلسلے میں اتنی جلدی ہے۔ بہرحال اس کے بارے میں سنو۔ وہ میری بیٹی ہے نیلم۔ اس کا دماغ الٹ چکا ہے۔ مکمل طور پر پاگل ہے۔ اس کی کسی بات کا بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ اب بتاؤ وہ کیا کہہ رہی تھی تم سے ؟۔"

"بس میرا خیال ہے کوئی کھل کی بات نہیں کی تھی۔ کہہ رہی تھی یہاں سے بھاگ جاؤ ورنہ مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ بس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا

اور یوں محسوس ہوا جیسے بوڑھے نے اطمینان کی سانس لی ہو۔ پھر وہ غمزدہ ا
میں بولا۔

میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ بچی ہے۔ اس کی ماں اس کی پیدائش
وقت ہی مرگئی تھی اور اس کے بعد میں نے ہی اسے پرورش کیا۔ بڑی حساس
۔ ذرا ذرا سی بات کو دل پر چپکا لیتی ہے۔ اور یہی بات اس کے ذہنی انتشار کا با
بنی۔ اب وہ صحیح الدماغ نہیں ہے۔ اس کی غیر موجودگی سے ہم بڑے پریشان ہو
تھے۔ بہرحال شکر ہے تمہارے کمرے میں مل گئی ہے اور ہمیں اس کی تلاش
جنگلوں کا رخ نہیں کرنا پڑا۔ میرا خیال ہے تمہیں نیند آرہی ہوگی۔ آرام کر
احمق لڑکی نے تمہیں پریشان کیا۔ بوڑھا اٹھنے لگا مگر میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کرا
روک دیا۔

"بیٹھو شہباز' مجھے ابھی نیند نہیں آ رہی۔ تم مجھے اس لڑکی کے بارے
کچھ اور بتاؤ۔"

"صبح کو سہی قادر' میں خود بھی تھکن محسوس کر رہا ہوں۔" شہباز
اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تمہاری مرضی۔ ویسے میں محسوس کر رہا ہوں شہباز' کہ تم مجھ سے
سی باتیں چھپا رہے ہو۔ اور مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتے۔ بہرحا
میرے محسن ہو۔ تم نے مجھے جیل سے فرار ہونے میں مدد دی ہے۔ میں تمہیر
سلسلے میں مجبور نہیں کر سکتا۔ اگر تم اپنے بارے میں نہیں بتانا چاہتے تو نہ بتاؤ بلا
کہو اگر تمہیں میری یہاں موجودگی ناگوار گزر رہی ہے تو میں یہاں سے چلا جاؤ
ہم دونوں ایک دوسرے کو دوست کی حیثیت سے یاد رکھیں گے۔"

"غلط فہمی کا شکار نہ ہو قادر خان' ایک رات کی مہلت اور دے دو۔
صبح تمہیں سب کچھ بتادوں گا۔ کوئی بھی بات تم سے پوشیدہ نہیں رہے گی۔
وعدہ کرتا ہوں تمہیں سب کچھ بتادوں گا۔ بس اب مجھے اجازت۔" وہ مزید کچھ
بغیر اٹھ گیا۔ اور تیز تیز قدموں سے نکل گیا۔ میرا ذہن الجھنوں کا شکار ہو گیا تھا

اس کے جانے کے بعد کافی دیر تک سوچتا رہا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے
سہری پر آگرا۔ لعنت ہے اس پاگل خانے پر۔ بوڑھا شہباز بتائے یا نہ بتائے۔
ل یہ کھنڈر چھوڑ دوں گا۔ بعد میں جس انداز کی بھی زندگی گزارنی پڑے۔
یہ فیصلہ کرنے کے بعد خاصی سکون کی نیند آئی تھی۔ ساری رات شاید کروٹ
بدلی۔

دوسری صبح آنکھ کھلی تو ذہن پر بڑا خوشگوار تاثر تھا۔ بدن ہلکا پھلکا محسوس ہو
ا۔ انگڑائی لینے کی کوشش کی تو پتا چلا دونوں پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔ بلکہ بدن
جگہ ایسی بندشیں ہیں جو بظاہر محسوس نہیں ہوتیں لیکن ہلنے جلنے کی کوشش
ے تو اس کو ناکام بنا سکتی ہیں۔

میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ یہ کیا ہو گیا تھا۔ کسی نے باندھ دیا تھا۔ مجھے
یوں ؟۔ میں نے گردن گھمانے کی کوشش کی۔ لیکن اس میں رکاوٹیں کھڑی کر
تھیں کہ گردن نہ ہلائی جا سکے۔ میں نے چھت کی طرف دیکھا اور صاف
ہو گیا کہ میں اس کمرے میں نہیں ہوں جس میں پچھلی رات سویا تھا۔ لیکن میں
کیسے آگیا اور کون سی جگہ ہے ؟۔ مجھے یہاں لانے والا کون ہے ؟۔ عجیب بے
محسوس ہونے لگی تھی۔ اور پھر اسی وقت شہباز کی کریہہ آواز کانوں میں
۔

"کیا محسوس کر رہے ہو ؟۔"

"میں چونک پڑا لیکن گردن گھما کر شہباز کو نہیں دیکھ سکا تھا اور اسی وقت
کا چہرہ میرے چہرے کے مقابل آگیا۔ اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ تھی

"کیا تمہیں اپنے بدن میں ایک خصوصی توانائی محسوس ہو رہی ہے۔" اس
ر پوچھا۔

"یہ۔ یہ سب کیا ہے ؟۔" میں نے غصیلے انداز میں کہا۔

"میری بات کا جواب دو۔"

"بکواس مت کرو۔ مجھے بتاؤ تم نے مجھے کیوں باندھا ہے ؟۔" میں نے غراتے ہوئے پوچھا۔

"اوہ۔ تم بضد تھے ناکہ تمہیں سارے حالات سے آگاہ کر دیا جائے۔" بوڑھے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم نے مجھے باندھ کیوں دیا ہے ؟۔ اور۔ اور مجھے میرے کمرے سے کیسے لایا گیا؟۔"

"بے ہوش کر کے۔ بہر حال تمہیں آنا ہی تھا۔"

"یہ کون سی جگہ ہے ؟۔"

"اسی عمارت کا تہہ خانہ۔ لیکن میں نے اس میں ترمیمیں کروائی ہیں۔ میری لیبارٹری ہے۔"

"لیبارٹری ؟۔" میں نے متحیرانہ انداز میں پوچھا۔

"ہاں لیبارٹری۔" بوڑھے نے گہری سانس لی۔ "بہت کم لوگ ڈاکٹر شہبا کو جانتے ہیں۔"

"ڈاکٹر شہباز"۔ میں نے تعجب سے کہا۔

"ہاں ڈاکٹر شہباز۔ آنکھوں کا ماہر۔ میں نے متعدد بیماریوں کے علا دریافت کیے ہیں لیکن بہت سے لوگوں کو میرے طریق کار سے اختلاف تھا۔ میر لیبارٹری پر کئی بار چھاپے مارے اور مجھے کبھی سکون سے کام نہیں کرنے دیا گیا۔"

"مگر تم نے۔ تم نے میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا ہے ؟"۔

"یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ میرے بارے میں پوری تفصیل تو سن لو۔ یہ تمہاری سب سے بڑی خواہش تھی۔ ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ میں نے آنکھوں متعدد بیماریوں کے علاج دریافت کیے اور انہیں عام کردیا۔ یہ جو آنکھیں بدلنے آپریشن عام ہو گئے ہیں۔ یقین کرو ان کا بنیادی تصور میں نے ہی دیا تھا۔ لیکن تعمیر کے لیے پہلے قربانیاں دینی ہوتی ہیں۔ آنکھوں کے موثر علاج کے لیے انسانی آنکھیں چاہیے ہوتی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی بیماریوں کے لیے میں نے م

انسانوں کی آنکھیں خریدنا شروع کر دیں۔ عام طور پر لاوارث مرنے والوں کی آنکھیں مل جایا کرتی تھیں لیکن موت کے بعد بینائی پر جو جھلی چڑھ جاتی تھی وہ میرے اس منصوبے کے لیے ناکارہ تھی۔ جس پر میں نے سوچا تھا۔ اس پر عمل کرنے کے لیے زندہ انسانوں کی آنکھوں کی ضرورت تھی۔ میں نے بے اندازہ دولت خرچ کر کے بھی انسانی آنکھیں حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہو سکا۔ دوسری طرف میں اپنے تجربے کے لیے پاگل تھا اور اسی جنون کے عالم میں میں نے ایک زندہ انسان کی آنکھیں نکال لیں لیکن عجیب قانون ہے' عجیب لوگ ہیں۔ میری کوششوں سے بے شمار ایسے انسانوں کی آنکھوں کی روشنی واپس آگئی جو بالکل اندھے ہو چکے تھے۔ مجھے کچھ نہیں ملا لیکن میں نے انہی کے فائدے کے لیے صرف ایک انسان کی آنکھیں ضائع کردیں تو دنیا میری دشمن ہو گئی اور میری زندگی دوبھر کر دی گئی۔ بالآخر مجھے اس دنیا کو خیرباد کہنا پڑا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس کے بعد میں لوگوں کی فلاح کے لیے یہ کام کرنا بند کر دیتا۔ میں کوئی قلاش انسان نہیں ہوں۔ ساری زندگی عیش و عشرت سے بسر کر سکتا ہوں۔ لیکن تم جانو شوق کا نشہ اتنا ہلکا نہیں ہوتا کہ آسانی سے زائل ہو جائے۔ میں اپنے تجربات کو اس حد تک وسعت دینا چاہتا تھا کہ میں کسی ایسے انسان کی بینائی دے سکوں۔ جو پیدائشی طور پر اندھا ہو۔ اس کی آنکھوں کی شریانیں تک نہ ہوں۔ جس طرح پلاسٹک کے دوسرے اعضا بنا لیے گئے ہیں۔ جن میں ہاتھ پاؤں یہاں تک کہ نازک ترین اعضاء جن میں دل، گردے، پھیپھڑے وغیرہ شامل ہیں اور انسانی زندگی کے تار قائم رکھنے میں مددگار ہوتے ہیں۔ اسی طرح میں مصنوعی آنکھیں بنانا چاہتا تھا۔ تاکہ ہم ان آنکھوں کے محتاج نہ رہیں۔ جو عطیہ کے طور پر دی جاتی ہیں۔ تم غور کرو کہ کیسی اچھی بات ہے کہ دنیا میں کوئی انسان بینائی سے محروم نہ رہے لیکن یہ دنیا والے کسی اچھے کام کی اس وقت تو تعریف کر دیتے ہیں۔ جب وہ ہو چکے۔ اگر اس کی تکمیل کے مراحل میں ان کی مرضی کے خلاف کچھ ہو تو اسے قطعی نہیں برداشت کرتے۔ ہم لوگ بہت سے مسائل میں اس لیے مایوس ہو جاتے ہیں کہ ہمیں تعاون نہیں ملتا

لیکن میرا نظریہ مختلف ہے ۔ میں سوچتا ہوں کہ ٹھیک ہے ۔ دنیا سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے جو کرنا ہے کر ڈالو ۔ چنانچہ میں نے آبادیوں کی گھما گھمی سے دور ان کھنڈرات کا انتخاب کیا اور یہاں اپنی تجربہ گاہ قائم کی مجھے زیادہ معاونوں کی ضرورت بھی نہ تھی ۔ چنانچہ میں نے اپنے طور پر کام شروع کردیا ۔ میری ساتھ میری بچی نیلم بھی تھی ۔ یہی میری معاون اور یہی میری اسسٹنٹ' جو بھی سمجھو ۔ میں نے اپنا کام شروع کردیا لیکن مسئلہ وہی تھا انسانی آنکھوں کی ضرورت ۔

میں نے ایسے انسانوں کا انتخاب کیا جو دنیا کی سرد مہری سے تنگ آئے ہوئے تھے ۔ معاشی مسائل نے انہیں خودکشی کی منزل تک لا پھینکا تھا ۔ وہ مرجانا چاہتے تھے ۔ تب میں نے ان سے سودا کیا ۔ میں نے ان سے ان کی آنکھیں خرید لیں بھاری رقم کے عوض ۔ اس دولت نے ان کے بچوں کے لیے اچھے مستقبل مہیا کر دیئے اور میں نے ان کی زندگی بھی نہ برباد ہونے دی ۔ میں نے انہیں اپنے پاس بلا لیا اور اب وہ دونوں میرے معاون ہیں ۔ تم سمجھ گئے ہوگے ۔ اور اس کے بعد مسٹر قادر' اس کے بعد میں نے اپنی آنکھیں بھی تجربے کی نذر کردیں ۔ میں اپنے کام میں اس سے زیادہ مخلص نہیں ہو سکتا تھا ۔ مجھے بتاؤ فلاح انسانیت کے لیے اس سے بڑی قربانی اور کیا دی جاسکتی ہے کہ میں نے اپنی کائنات تاریک کرلی ۔ اب بھی لوگ میرے خلوص پر شک کریں تو میں کیا کرسکتا ہوں ۔ اس کے لیے مجھے کسی چیز کی ضرورت پیش آئے تو میں وقت ضائع نہ کروں ۔ سوائے اس کے کہ جائز ذریعوں کی تلاش میں وقت ضائع نہ کروں اور یہی ہوا تھا ۔ میں نے شہر جا کر ایک انسان کو قتل کردیا تھا اور پھر اس کی آنکھیں نکال لی تھیں ۔ لیکن اس جرم میں پکڑا گیا ۔ دنیا کو تو میں نے اصلیت کی ہوا نہ لگنے دی ۔ ہاں مجھے سزائے موت ضرور سنادی گئی ۔ نکلنا تو تھا ہی میں نے سوچا کوئی ساتھی بھی مل جائے سو میں نے تمہارا انتخاب کیا ۔ اور تمہیں یہاں لے آیا ۔ اب دیکھو نا میرے دو دو کام ہو گئے ۔ ایک ساتھی بھی مل گیا اور اپنے تجربے کے لیے دو آنکھیں بھی ۔

"کیا مطلب ؟ ۔" میں پھر اچھل پڑا ۔

"انسانیت کی فلاح کے لیے میرے دوست ۔"

"کیا بکواس ہے یہ ؟ ۔" میرے بدن میں خوف کی لہریں دوڑ گئیں ۔

"تھوڑی سی فراخ دلی سے کام لو ۔ غور تو کرو ۔ اگر تمہاری آنکھیں میرے تجربے کا آخری دور پورا کرسکیں تو اس سے سینکڑوں ایسے لوگوں کو روشنی مل جائے گی جنہوں نے کبھی دنیا نہیں دیکھی ۔ کائنات کی سب سے انمول شے بینائی ۔ جس سے وہ محروم ہیں ۔ تمہاری آنکھیں ان کے درد کا درماں بن جائیں تو اس سے بڑی نیکی اور کیا ہو سکتی ہے" ۔

"نہیں ۔ نہیں ۔ میں تمہاری بات نہیں مان سکتا" ۔

"کیوں ۔ آخر کیوں ؟ ۔ تم تو سزائے موت کے مجرم تھے ۔ تم تو موت اپنا چکے تھے ۔ پھر اگر میں تمہاری زندگی میں تھوڑا سا خلا پیدا کر رہا ہوں تو تم اس قدر منحرف کیوں ہو ؟ ۔ خود کو اس تجربے کے لیے وقف کردو ۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر کامیاب ہوگیا تو تعاون کرنے والوں میں تمارا نام کبھی نظرانداز نہیں کروں گا ۔ تم بھی محسن انسانیت کہلاؤ گے ۔"

"لیکن آنکھوں کے بغیر زندگی کا تصور بے حد بھیانک ہے ۔"

"تم ہمیشہ اندھے نہیں رہو گے میرے دوست تمہاری بینائی واپس مل جائے گی ۔ تم نے دیکھا کہ میں خود بھی اس کیفیت میں ہوں ۔ ہمارا تجربہ ہماری آنکھوں کے ان دو گڑھوں کو دو خوبصورت اور روشن آنکھوں سے پر کردے گا ۔"

بوڑھے کی آواز میری سماعت پر ہتھوڑے برسا رہی تھی ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں متحیر بھی تھا ۔ بھلا یہ اندھا بوڑھا یہ تجربات کیسے کررہا ہے ۔ اس نے اپنی آنکھیں ۔ بھی داؤ پر لگادی ہیں ۔ کیسی انوکھی بات ہے ۔"

"تم نے اب تک ایک دلیر انسان ہونے کا ثبوت دیا ہے قادر ۔ میں چاہتا ہوں تم اب بھی اسی انداز سے پیش آؤ ۔ اور خوشی خوشی اپنی آنکھوں کا عطیہ پیش کردو ۔ تم یہاں رہو گے ۔ میں وعدہ کرتا ہو کہ تم تینوں کو سب سے پہلے آنکھیں

واپس کروں گا۔"

میں اس کی بات پر غور کرنے لگا۔ یہ سب کچھ بے حد عجیب تھا۔ آنکھیں کھونے کا تصور بڑا اذیت ناک تھا۔ بھلا آنکھوں کے بغیر زندگی کو بھی زندگی کہا جا سکتا ہے۔ بوڑھا پاگل کیا ضروری ہے کہ اپنے تجربات میں کامیاب رہے۔ وہ دونوں بے چارے اندھے جو زندگی گزار رہے تھے وہ افسوس ناک تھی۔ نہ جانے انہیں کب تک انتظار کرنا پڑے اور بوڑھا کامیاب ہو یا نہ ہو۔"

"تم نے کیا سوچا ہے؟۔" بوڑھے کی آواز ابھری۔

"کیا تم مجھے سوچنے کا موقع دو گے؟۔"

"فیصلے لمحوں میں کیے جانے چاہئیں۔ ان کے لیے وقت درکار نہیں ہوتا۔"

"لیکن یہ فیصلہ۔" میں نے خوفزدہ آواز میں کہا۔

"قادر خان۔" میں نے تمہیں جس انداز میں پایا تھا اس کے لیے میں نے سوچا تھا کہ تم جیسا دلیر انسان زندگی کی پروا نہیں کرے گا۔ کیوں نہ تم خود کو مردہ ہی تصور کرو۔"

"تب میں تمہیں رائے دیتا ہوں میرے دوست کہ پہلے مجھے ختم کردو اور اس کے بعد میری آنکھیں نکال لو۔"

"نہیں۔ تم اس قدر مایوس نہ ہو۔ ایک وعدہ تم سے کرتا ہوں کہ جب تم دنیا دیکھنا چاہو گے، دیکھ سکو گے۔ وقتی طور پر سہی۔ مصنوعی طور پر سہی۔"

"میں نہیں سمجھا۔" میں نے کہا۔

"سمجھنے کی کوشش کرو بھی نہیں۔"

"لیکن تم مجھے تھوڑا سا وقت تو دو۔ تم نے مجھے باندھ کیوں دیا ہے؟۔"

"نہیں قادر۔ میں اپنی سانسوں کے بارے میں بھی کیا کہہ سکتا ہوں۔ موت کا تو کوئی تعین نہیں ہوتا۔ جب بھی آ جائے۔ پھر ہم انتظار میں کیوں وقت ضائع کریں۔ جو کام کرنا ہے۔ جلد از جلد کرلیا جائے۔"

"بکواس مت کرو۔ مجھے کھول دو۔"

"ہرگز نہیں دوست، ہرگز نہیں۔ تم اس خوبصورت موقع کو ضائع کرنے کا مشورہ دے رہے ہو۔ میری زندگی میں یہ آپریشن بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بہتر تھا کہ تم رضاکارانہ طور پر خود کو اس کے لیے پیش کر دیتے لیکن تم اتنے فراخدل نہیں ہو، جتنا میں سمجھا تھا۔ مجھے اجازت دو کہ میں اپنا کام شروع کروں۔ اس کا چہرہ میرے سامنے سے ہٹ گیا۔

میں بری طرح بدحواس ہو گیا تھا۔ یہ سب کچھ تو توقع کے بالکل خلاف تھا۔ ظاہر ہے میں بزدل انسان نہیں تھا۔ میں نے موت کو گلے لگا لیا تھا لیکن اس وقت جب زندگی سے محبت ہوئی تو یہ تکلیف دہ دور شروع ہو گیا۔ آنکھوں کے بغیر تو کچھ نہیں۔ اندھا رہ کر زندہ رہنے سے کیا فائدہ۔ اور اب جبکہ یہ بوڑھا خبیث اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے بدترین لمحات سے آشنا کرنے والا تھا تو میں ہر قیمت پر اس سے بچاؤ چاہتا تھا۔ میں نے اپنے بدن کے گرد کسی ہوئی بندشوں کو توڑنے کے لیے جدوجہد کی لیکن خبیث اور طاقتور بوڑھے نے جس طرح مجھے باندھا تھا، اس سے نکلنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ نہ جانے میرے بدن کے کون کون سے حصوں پر زخم آئے لیکن میں اس وقت تک جدوجہد کرتا رہا جب تک سکت رہی۔ پھر میرا ذہن جواب دینے لگا۔ بوڑھا کتا نہ جانے کون سے کاموں میں مصروف تھا۔

پھر نیم غنودگی کی کیفیت میں ہی میں نے اپنے بازو میں انجکشن کی چبھن محسوس کی۔ ہلکی سی، سی میرے منہ سے نکلی۔ اور اس کے بعد کی کیفیت عجیب تھی۔ پتا نہیں جاگ رہا تھا یا سو رہا تھا۔ آوازیں میری سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ لیکن ذہن ان کے بارے میں سوچنے سے قاصر تھا۔ ہاں البتہ جب مکمل طور سے ہوش آیا تو رات ہو چکی تھی۔

رات۔ یہ کیسی رات تھی۔ میں نے سوچا پھر بوڑھا شہباز یاد آ گیا۔ اور پھر میں نے اپنے ہاتھوں میں اینٹھن محسوس کی۔ ایک بار پھر میں نے بندشوں سے آزاد ہونے کی کوشش کی۔ لیکن بندشیں تو اب میرے گرد نہیں تھیں۔ سر بھی ہلا سکتا تھا۔ ہاتھ پاؤں بھی ہلا سکتا تھا۔ شاید رات کا آخری پہر ہے ورنہ اس قدر گھور

تاریکی' میں نے پلکیں جھپکانے کی کوشش کی اور اچانک میری گھگھی بندھ گئی۔

"آہ۔ یہ کیا ہے۔ میری پلکیں آنکھوں کے ان ڈیلوں کو محسوس تو نہیں کر رہی تھیں جن میں بینائی ہوتی ہے۔ دہشت زدہ ہو کر میں نے دونوں ہاتھوں سے آنکھوں کو ٹٹولا اور آنکھوں کے گڑھوں میں خون کی چپچپاہٹ میری انگلیوں سے ٹکرائی اور پھر میرے حلق سے جو آواز نکلی' وہ بڑی دہشت ناک تھی۔

"نہیں نہیں۔یہ۔یہ کیا کیا تو نے کتے۔ شہباز۔ شہباز کتے۔ میں تجھے جان سے مار دوں گا۔ آہ میری آنکھیں۔ میری آنکھیں۔"

میرے دماغ میں شعلے بھڑک چلے تھے۔ میں طوفان کی طرح اپنی جگہ سے اٹھا ۔ جو چیز میرے سامنے آئی میں اسے نیست و نابود کرنے پر تل گیا۔ شیشے ٹوٹنے کی آوازیں میز کرسیوں کا شور اور پھر میں سامنے کی دیوار سے ٹکرایا۔ اور اسے ٹٹول ٹٹول کر دروازے تک پہنچ گیا۔ میرے بدن میں اس وقت بے پناہ قوت تھی۔ میں نے دروازے کو جھنجھوڑ ڈالا اور پھر بدن کی ٹکروں نے دروازہ توڑ دیا۔

شہباز۔ شہباز۔ تو کہاں ہے؟۔ میرے سامنے آ کتے۔ تو نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ میری آنکھیں مجھے واپس دے دے۔ میں کہتا ہوں میری آنکھیں مجھے واپس دے دے ورنہ اچھا نہ ہو گا۔ میں تجھے ایسی موت ماروں گا کہ تو سوچ بھی نہ سکے گا۔ دفعتاً" میں نے کسی چیز سے ٹھوکر کھائی اور اوندھے منہ نیچے گر گیا۔ میرا سر زور سے کسی پتھر سے ٹکرایا۔ اور ذہن پھر تاریکیوں میں کھو گیا۔ نجانے کب تک' نہ جانے کب تک۔ لیکن زندگی تھی تو ہوش بھی آ گیا۔ اور ذہن جاگا تو کسی کے گفتگو کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اس طرف کان لگا دیے

"آہ۔ یہ اس ذلیل بوڑھے کی آواز تھی' کسی سے کہہ رہا تھا۔

"نہیں۔ اسے پائپ سے خوراک دو' ابھی وہ ہوش' میں نہیں آنا چاہیے۔ ابھی اس کا ہوش میں آنا کسی بھی حالت میں ٹھیک نہیں۔"

"بہت بہتر جناب۔" دوسرے شخص کی آواز سنائی دی اور پھر کوئی مجھے

نزدیک آتا محسوس ہوا۔ میرے دانت ایک دوسرے پر بھنچ گئے۔ میں نے اس کے قدموں کی چاپ کو محسوس کیا اور جونہی آنے والا میرے قریب آیا میری دونوں ٹانگیں پوری قوت سے اس کے منہ پر پڑیں اور وہ ایک بے ساختہ چیخ کے ساتھ شاید دوسری طرف الٹ گیا۔

میں پھرتی سے کھڑا ہو گیا۔ درحقیقت آنکھوں کے خالی حلقوں میں کوئی تکلیف نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ بوڑھے کتے نے میری آنکھیں نکال کر کوئی ایسی دوا ان حلقوں میں لگا دی تی جس سے تکلیف کا کوئی احساس نہیں تھا۔ اس کے علاوہ بدن میں توانائی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ تب ہی میں نے بوڑھے شہباز کی آواز سنی۔

"اوہ۔ کیا ہوا' کیا تم ٹھیک ہو؟۔"

"نہیں جناب۔ شاید وہ ہوش میں آ گیا ہے۔"

"آوہ۔ شہباز نے مخصوص انداز میں منہ اٹھا کر فضا میں سونگھنے کی کوشش کی اور پھر اس نے مجھے آواز دی۔

"قادر خان۔ کیا کیا ہے تم نے؟۔"

"میرے نزدیک آ کتے۔ دھوکے باز۔ کیا تو مجھے اس لیے جیل سے نکال کر لایا تھا۔ دیکھ سن' میری آنکھیں مجھے واپس کر دے۔ ورنہ میں تجھے کتے کی موت مار دوں گا۔ میں دونوں ہاتھ خلا میں نچاتے ہوئے کہا۔ تب اچانک میرے ہاتھ کسی کے جسم سے ٹکرائے اور میں نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ یہ بوڑھا شہباز ہی تھا۔

"کتے۔ کتے۔ میں نے اس کی گردن ٹٹولی اور اسے اپنی گرفت میں لے لیا ۔ تب بوڑھے شہباز کے چوڑے ہاتھ میری کلائیوں پر آ جمے اور اس نے نہایت اطمینان سے اپنی گردن سے میری گرفت چھڑالی۔

"قادر خان۔ میں آخری بار کہہ رہا ہوں' ہوش میں آ جاؤ جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ ایک خوبصورت مستقبل کے لیے تم تھوڑے سے عرصے کے لیے تاریکی برداشت کر لو۔"

"میں۔ میں تجھے مار ڈالوں گا۔" میں نے دانت بھینچ کر اس کا لباس کھینچا۔

"اچھا تو مار ڈالو"۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ اور میں اپنی جدوجہد کرنے لگا لیکن جیل کی موٹی سلاخوں کو موم کی طرح توڑ دینے والا زمین میں ایک فٹ گہرے گڑھے ہوئے آہنی جنگلہ کو اکھاڑ پھینکنے والا میرے بس کا روگ نہیں تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے میرے دونوں بازو پکڑ لیے اور دوسرا ہاتھ میری کمر میں ڈال کر مجھے اٹھایا اور کندھے پر ڈال لیا۔ اور پھر نہایت اطمینان سے بستر پر لا پٹخا۔

"اگر تم شرافت سے باز نہ آئے تو اب تمہارے ساتھ برا سلوک کیا جائے گا۔ تمہاری آنکھوں کے گڑھوں میں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ یہ میں جانتا ہوں اور اب بہتر یہی ہے کہ تم مجھ سے تعاون کرو اور اگر تم نے تعاون نہ کیا تو پھر یہی ہوگا کہ میں تمہیں کسی بھری پری بستی میں چھوڑ آوں گا۔ اور پھر تم ایک اندھے کی حیثیت سے بھیک مانگنے کے سوا کچھ نہیں کر سکو گے۔"

بوڑھے نے اس طرح میری جدوجہد کو ناکام بنا دیا تھا' اس سے یہ احساس تو یقین پا گیا تھا کہ اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ چنانچہ میرا دل چاہا کہ بے بسی سے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑوں کچھ ایسی ہی کیفیت محسوس کر رہا تھا میں لیکن یہ بہرحال شان مردانگی کے خلاف تھا۔ چنانچہ دل مسوس کر رہ گیا۔ چند ساعت خاموشی رہی۔ پھر شہباز کی آواز سنائی دی۔

"اگر تم نے فیصلہ اثبات میں کیا ہے تو مجھے بتا دو۔ اور اگر تم اب بھی کوئی غلط حرکت کرنا چاہتے ہو تو ظاہر ہے تمہاری جدوجہد تمہیں آنکھیں واپس نہیں دے سکے گی۔ سوائے اس کے کہ میں تمہیں عدم تعاون کرنے والوں میں شمار کروں گا۔" پھر دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ شاید وہ سب باہر چلے گئے تھے۔

کئی دن مزید گزر گئے۔ اب یہاں رہنا میں نے اپنی عادت بنالی تھی۔ چہل قدمی بھی کر لیتا تھا۔ لیکن اس ویرانے سے باہر جانا میرے بس کی بات نہ تھی۔ آنکھیں کھونے کے تقریباً ایک ماہ بعد کی بات ہے کہ ایک شام میں عمارت کے ایک حصے میں ایک ابھرے ہوئے پتھر پر بیٹھا تھا۔ خاموش اور سوچ میں گم۔ میری زندگی

میں جو ویرانے در آئے تھے ان سے بغاوت تو اس زندگی میں ممکن نہیں تھی۔ موت چونکہ میرا مقدر بن چکی تھی اور میں تقدیر کے خلاف زندگی کی طرف دوڑ پڑا تھا۔ اس لیے مجھے اس دوڑ کی سزا مل رہی تھی۔ دفعتاً مجھے اپنی پشت پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور میں چونک پڑا۔ ہوگا کوئی' میں نے بے پروائی سے سوچا اور پھر مجھے اپنے قریب وہی نسوانی آواز سنائی دی۔ جو میں پہلے بھی سن چکا تھا۔

"ارے تم یہیں موجود ہو؟" اس نے کہا اور پھر وہ شاید میرے لیے سامنے آگئی۔ دوسرے لمحے اس کے حلق سے ایک بے ساختہ چیخ نکل گئی"۔ نہیں۔ نہیں۔ آہ' نہیں۔" وہ شاید میرے لیے رو پڑی تھی۔" یہ نہیں ہو سکتا۔ آہ! یہ کیا ہو گیا۔ اس نے میرے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ کر میرا رخ اپنی جانب کر لیا اور پھر بے اختیار مجھے سینے سے بھینچ لیا۔ بڑی بے اختیارانہ کیفیت تھی۔ اس کے انداز میں' میں نے بھی تعرض نہ کیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رونے کے درمیان وہ کہتی جا رہی تھی۔ "کہا تھا میں تم سے بھاگ جاؤ۔ لیکن نہ سنی تم نے۔ پاگل سمجھا تھا نا۔ دوسروں کی مانند' کیوں نہیں گئے بتاؤ۔ کیوں نہیں چلے گئے یہاں سے؟۔" وہ روتی رہی۔

درحقیقت میرے ذہن میں اب اس کی باتیں آ رہی تھیں۔ بلاشبہ اس نے مجھ سے چلے جانے کے لیے کہا تھا۔ لیکن شہباز نے اسے پاگل قرار دے دیا تھا۔ اور اس وقت میں نے بھی اس بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا' اس نے شاید میرا چہرہ اپنے چہرے کے مقابل کیا۔ مجھے دیکھتی رہی۔ اور پھر غمزدہ لہجے میں بولی۔

"آہ۔ کس قدر بدنما کر دیا تمہارا چہرہ۔ کیسی حسین آنکھیں تھیں۔ لیکن اب کیا بھی کیا جا سکتا تھا۔ بتاؤ اب تمہارے لیے کیا کروں؟۔"

"شکریہ نیلم۔ تمہاری ہمدردی نے مجھے کافی سکون بخشا ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"نہیں ۔ لیکن میرا سکون ختم ہو گیا ہے ۔ پپا نے جو کچھ کیا ہے اور جو کچھ کرتے رہے ہیں وہ مجھے سب ناپسند تھا لیکن انہوں نے یہ جو کیا اس پر ۔ اس پر میں انہیں معاف نہیں کر سکتی ۔" اس نے مسلسل روتے ہوئے کہا۔

"تمہیں اس بارے میں کچھ معلوم ہے نیلم ؟۔"

"کس بارے میں ؟۔"

"جو کچھ تمہارے پپا کرتے ہیں ۔"

"ہاں ۔ مجھے معلوم ہے ۔"

"کیا تم نے کبھی ان سے اس بات پر اختلاف کیا ہے ؟۔"

"ہاں ۔ میں سخت احتجاج کرتی رہی ہوں ۔"

"ظاہر ہے شہباز نے تمہاری بات قبول نہیں کی ہو گی ۔"

"ہاں پپا بہت سنگدل ہیں ۔ لیکن انہوں نے تمہارے ساتھ جو کیا ہے ۔ اس پر میں انہیں معاف نہیں کروں گی ۔" وہ پھر رونے لگی اور میرے ذہن میں ایک نئے خیال نے جنم لیا ۔ میں نے سوچا کیوں نہ اس لڑکی کو آلۂ کار بنایا جائے اور اس سے شہباز کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کی جائیں ۔ میں شہباز سے انتقام لینا چاہتا تھا ۔ اس کم بخت نے میرے ساتھ جو سلوک کیا تھا وہ بے حد بھیانک تھا ۔ میں بے بس ہو کر رہ گیا تھا ۔ لیکن اب اگر یہ لڑکی مجھ سے تعاون پر آمادہ ہو جائے تو شاید اس بوڑھے خبیث کے خلاف کچھ کر سکوں ۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ متاثر ہے ورنہ کسی کے لیے آنکھوں میں آنسو کہاں آتے ہیں ۔؟

"نیلم ۔ تمہیں مجھ سے ہمدردی ہے نا؟۔"

"ہاں ۔ میں تم سے متاثر ہوں ۔ ان سارے دنوں میں مسلسل کوشش کرتی رہی کہ کسی طرح اگر مجھے قید سے رہائی مل جائے تو میں تم سے ملاقات کروں لیکن مشکل ہو گیا تھا ۔ آج بڑی مشکل سے ملازم کو دھوکا دے کر بھاگی ہوں ۔ اسے پتا بھی نہیں چل سکا ۔ کھانا دینے کے بعد اس نے میرے قید خانے کا دروازہ حسب

معمول بند کر دیا ۔ یہ معلوم کیے بغیر کہ میں چپ چاپ دروازے سے باہر نکل آئی ہوں ۔ اس کے بعد تمہیں تلاش کرتی رہی ۔ اور بڑی دیر سے تلاش کر رہی ہوں ۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہارے ساتھ یہ سب کچھ ہو چکا ہے ۔" اس نے پھر ایک سسکی لی اور میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تو کیا تمہیں قید رکھا جاتا ہے ؟"۔

"ہاں"۔

"کیوں ؟۔"

"اس لیے کہ مجھے پپا کے کام سے اختلاف ہے ۔ میں نے ان سے کھل کر کہہ دیا تھا کہ میں یہ سب کچھ نہیں ہونے دوں گی ۔ اس پر انہوں نے مجھے پاگل قرار دے کر قید کر دیا۔"

"اوہ ۔ تو شہباز بے حد سنگدل ہے ۔" میں نے کہا۔

"تو پپا کے چنگل میں کیسے پھنس گئے تھے ؟۔" اس نے پوچھا اور میں نے مختصراً اپنی کہانی سنا دی ۔

"اوہ ۔ تو پپا اتنے دن تک جو غائب رہے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ حکومت کی قید میں تھے لیکن ان کے بارے میں لوگوں کو معلومات نہیں ہو سکی ہوں گی کہ وہ کون ہیں ورنہ اس حادثے کی نوعیت بدلی ہوئی ہوتی ۔"

"لیکن میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی ۔ شہباز نے اپنی آنکھیں کیوں گنوا دیں ۔"

" پپا بے حد جذباتی انسان ہیں ۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ وہ اپنے کام میں مخلص ہیں لیکن ان کی یہ جذباتیت شدت پسندی کی حدود میں داخل ہو گئی ہے ۔ تم غور کرو کہ اگر وہ اپنے تجربے میں کامیاب ہیں تو دنیا کو کیا مل جائے گا ۔ کیا ساری دنیا سے اندھوں کا وجود نہیں ختم ہو جائے گا ۔ وہ لوگ جو کائنات میں رہ کر حسین کائنات کی دید سے محروم ہیں' کیا وہ خود کو ایک نئی دنیا میں نہیں محسوس کریں گے ۔ اس کے بعد ان کے دلوں میں پپا کی کیا حیثیت ہو گی' کیا احترام ہو گا ۔ اس کا

اندازہ تم خود کر سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے مجھے اعتراف ہے لیکن بات ان کی آنکھوں کی تھی۔"

جب انہیں کوئی نہ ملا تو انہوں نے خود اپنی آنکھیں اپنے تجربے کی نذر کر دیں۔ یہ ان کے اس جذبے کی انتہا ہے کیا تم اس کا اعتراف نہیں کرو گے؟۔"

"میں اسے دیوانگی قرار دیتا ہوں۔"

"نہیں ڈیئر۔ تم اسے دیوانگی نہیں کہہ سکتے۔ دنیا کے ہر بڑے آدمی کو دیوانہ ہی قرار دیا گیا ہے۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ پپا کا مقصد کیا ہے۔ بے نور دنیا کو روشنی دینے کے لیے انہوں نے اپنی دنیا تاریک کر لی ہے۔ یہ جذبے انہی دیوانوں کے ہوتے ہیں' جنہوں نے دنیا کو لاتعداد سہولتیں فراہم کیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہر جذبے کی تکمیل کے لیے بعض اوقات مجرمانہ حیثیت اختیار کرنا پڑتی ہے۔ میں تمہیں ایسی بے شمار مثالیں دے سکتی ہوں۔"

"میں تم سے متفق نہیں ہوں نیلم۔ بے شک کسی نیک جذبے کی تکمیل کے لیے کام کیا جاتا ہے۔ لیکن وہ جو خوشی سے اس کام کے لیے آمادہ نہیں ہوتے انہیں کیوں مجبور کیا جاتا ہے' میں جو کچھ بھی تھا' جیسی بھی زندگی گزار رہا تھا۔ کم از کم اس دنیا سے شناسائی تو تھی۔ کم از کم اپنی زندگی تو جی رہا تھا۔ میری دنیا تاریک کر کے اس دیوانے وحشی نے میرے ساتھ بہت ظلم کیا ہے۔ کاش میں اس سے انتقام لے سکتا۔" نیلم خاموش رہی۔ اور اس کے بعد اس نے کہا۔

"میں خود بھی تمہارے لیے غمزدہ ہوں۔ تم تھوڑا سا توقف کرو۔ میں دیکھوں گی کہ میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں۔ ویسے میں ایک بات کہے بغیر نہ رہ سکوں گی۔ پپا اپنے جذبات میں صادق ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ انہوں نے عالم جنون میں غلط راستے اختیار کر لیے ہیں۔ دعا کرو کہ پپا اپنے تجربے میں کامیاب ہو جائیں۔ اور دنیا ان کی یہ برتری تسلیم کر لے۔ آج کچھ چراغ گل ہوئے ہیں لیکن آنے والی کل لاکھوں چراغ روشن کر دے گی۔ اور اس کے بعد لوگ پپا کے مجسمے بنائیں گے۔ ان کی پوجا کریں گے۔ انہیں دنیا کا عظیم محقق قرار دیں گے۔ شہر کے

حصول' نیک نامی کی طلب ہر دل میں ہوتی ہے۔ ہر انسان اپنے لیے ایک منفرد مقام چاہتا ہے۔ لیکن صرف اپنے آپ کے لیے سب کچھ کر لینا۔ کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر کوئی دنیا کو کچھ دے جائے تو اس کے بارے میں سوچو بیشک تمہیں ذہنی اذیت سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ میں خود بھی تمہارے لیے غمزدہ ہوں۔ لیکن ایک دن پپا کی برتری ضرور تسلیم کی جائے گی اور اس وقت ان کی تمام مجرمانہ کاروائیوں کو نیک نیتی سمجھا جائے گا۔ اس دنیا کا یہی اصول ہے۔ لوگ لینا پسند کرتے ہیں کوئی دینا نہیں چاہتا۔ سب اپنے لیے جی رہے ہیں۔ دوسروں کے لیے جینے کی باتیں صرف کتابوں اور اخبارات کے لیے محدود ہیں۔"

"تم مجھے جاہلانہ انداز میں قائل کرنے کی کوشش مت کرو۔ میرا کیا قصور تھا' جیسے بھی جیتا یا مرجاتا لیکن میری زندگی اس طرح تاریک تو نہ ہوتی۔ میں اب اندھوں کی طرح اس دنیا میں بھٹکتا رہوں گا۔ آہ' اس سے تو موت ہی بہتر تھی۔ میری آواز گلوگیر ہو گئی۔ اس کے بعد مجھے نیلم کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور پھر وہ شاید چلی گئی۔ میں اندھوں کی طرح ٹٹولتا ہوا ایک مسہری پر آبیٹھا۔ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ان حالات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جیل میں بسر ہو رہے تھے۔ قید پوری ہو جاتی' زندگی ختم ہو جاتی تو زیادہ بہتر تھا۔ سزائے موت دی جاتی مجھے۔ میں نے خود بھی تو کچھ انسانوں کو زندگی سے محروم کر دیا تھا۔ لیکن وہ ایک الگ جذبہ تھا۔ موت آ جاتی تو کم از کم زندگی کی یہ تاریکیاں تو چھٹ جاتیں۔ غور کیا تو اندازہ ہوا کہ ایک طرح سے اس شخص کا کہنا درست ہی ہے۔ سزائے موت کا قیدی تھا میں۔ جیل نہ ٹوٹتی اور وہ مجھے لے کر فرار نہ ہوتا تو ظاہر ہے موت میرا استقبال کرتی۔ وہ موت بہتر تھی یا یہ تاریک زندگی' کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا میں نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر سمجھا لیا کہ زندگی بہرحال جو فیصلے کرتی ہے وہ تقدیر کے فیصلے ہی ہوتے ہیں۔ تقدیر میں یہ تاریک زندگی لکھی تھی تو اب کیا جا سکتا ہے' اسے اپنانا ہی پڑے گا۔ چنانچہ تن بہ تقدیر ہو گیا۔ میری آنکھیں نکال لی گئی تھیں لیکن میری بقیہ زندگی کو سنبھالنے کے دعوے کیے گئے تھے۔ پتا نہیں ان

دعووں میں کیا حقیقت ہے ۔ اسی دن اس کم بخت سے ملاقات ہوئی ۔ چہکتی ہوئی آواز میں بولا ۔

"ہیلو ۔ کیسے حال ہیں تمہارے ؟۔"

"تم نے جو احسان مجھ پر کیا ہے بس اس کی اذیت کا شکار ہوں ۔"

"بار بار ایک جملہ دہراتے ہوئے مجھے خود بھی افسوس ہوتا ہے ۔ تم اس وقت کا انتظار کیوں نہیں کرتے جب ہم اس دنیا کے سامنے آئیں گے ۔ اپنی ان کوششوں کا اعلان کریں گے ۔ اور اس وقت اگر ہم دنیا کو یہ بھی بتائیں گے کہ ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے جیل میں بغاوت کرا کر جیل توڑی تھی ۔ اور وہاں سے نکل بھاگے تھے ۔ تو لوگ ہمارے اس اقدام کو جائز قرار دیں گے ۔ تم یہ کیوں نہیں سمجھتے میرے دوست کہ یہ دنیا بہت خود غرض ہے ۔ اور اس سے کچھ لو تو یوں سمجھ لو کہ تمہیں کچھ نہیں دے گی لیکن اگر اس کے سامنے کچھ پیش کر دو تو یہ تمہارے قدموں کی دھول بننا پسند کرے گی ۔ میں دکھی انسانیت کی خدمت کرنا چاہتا ہوں ۔ اپنے اس تجربے کے بارے میں تمہیں تفصیل سے بتا چکا ہوں ۔ دراصل میں کوشش کر رہا ہوں کہ ہر قسم کے نابینا انسانوں کو بینائی دوں ۔ انہیں زندگی کے اندھیروں سے باہر نکال لوں ۔ میری اس ایجاد سے پیدائشی اندھے بھی درست ہو سکتے ہیں اور تم خود سوچو کہ اس کے بعد کیا ہو گا ۔ دنیا ہماری پوجا کرے گی ۔ وہ جنہوں نے اس دنیا میں آنے کے بعد اس دنیا کا ایک رنگ بھی نہیں دیکھا' اپنی آنکھوں سے اس کائنات کو دیکھیں گے تو سرشار ہو جائیں گے ۔ تمہاری تھوڑی سی تکلیف کتنے لوگوں کو زندگی کی لطافتوں سے ہمکنار کرے گی ۔ اگر تو اسی جذبے کو اپنے سینے میں بسا لو تو امر ہو جاؤ گے ۔" میں ڈاکٹر شہباز کی باتیں سنتا رہا ۔ ان باتوں میں بڑی مٹھاس تھی ۔ بڑی سچائی تھی ۔ لیکن اس بڑی سچائی کو میں کیسے نظرانداز کرتا جو میری اپنی دنیا میں تاریکی بن کر پھیل گئی تھی ۔ ڈاکٹر شہباز نے کہا ۔

"تمہاری آنکھوں کو میں نے استعمال کر لیا ہے لیکن بدنصیبی ہے میری کہ میں تھوڑا سا پیچھے رہ گیا ہوں ۔ بہت تھوڑا سا ۔ بس آخری تجربہ رہ گیا میرا ۔ آخری

تجربہ اور اس کے بعد میں دعوے سے کہتا ہوں کہ میں اپنے اس تجربے کی تکمیل کر لوں گا ۔ اور میرے دوست ایک بات کا وعدہ میں تم سے کرتا ہوں کہ سب سے پہلی بینائی میں تمہیں دوں گا ۔ سمجھے تمہاری آنکھیں اس طرح ہوں جائیں گی جیسے نوزائیدہ بچہ پہلی بار اس دنیا کو دیکھتا ہے ۔ اور اس کے بعد تم مجھ سے اپنی تمام نفرت بھول جاؤ گے ۔ بس تھوڑا سا موقع مجھے اور دے دو ۔ بہت تھوڑا سا ۔ میں خاموشی سے ڈاکٹر شہباز کی باتیں سنتا رہا ۔ پھر میں نے کہا ۔

"تو اس کے لیے تم کسی اور انسان کو روشنی سے محروم کرو گے ؟۔"

"میرے اس نیک جزبوں کے جواب میں اتنا تلخ جملہ مت استعمال کرو ۔ بہرٔ حال مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ تم میرے بارے میں کس انداز سے سوچ رہے ہو ۔ ہاں ایک اور انسان کو تاریکیوں کی ضرورت ہے تاکہ اس کے بعد تاریکیوں کا وجود ہی ختم ہو جائے ۔ میں تم سے صرف ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں ۔ وہ یہ کہ خاموشی اور سکون سے یہاں زندگی بسر کرنا ۔ یہاں سے نکلنے کی ہر کوشش بے مقصد ثابت ہو گی ۔ میں نے آنکھوں سے محروم ہونے کے بعد اس دنیا کو زیادہ قریب سے پہچانا ہے اور تم نے دیکھا کہ میں لاکھوں بیناؤں سے زیادہ بہتر ہوں ۔ میرا تجربہ مکمل ہو جائے اس کے بعد میں تم سب کا قرض واپس کر دوں گا ۔ میں جا رہا ہوں لیکن اس امید کے ساتھ کہ تم مجھ سے تعاون کرو گے ۔" میں نے کوئی جواب نہ دیا ۔ ڈاکٹر شہباز چلا گیا ۔ اور وقت گزرنے لگا ۔

میں نے دنیا کے بارے میں بہت کچھ سوچا تھا ۔ نہ جانے کیا کیا' اس دوران مجھے یہ احساس بھی ہوا تھا کہ زندگی بڑی بے وقعت شے ہے ۔ معاف کر دینے میں جو لذت ہے وہ انتقام لینے میں نہیں لیکن انسان دیر سے سوچنے کا عادی ہوتا ہے ۔

کسی کے قدموں کی چاپ سن کر میں چونک پڑا ۔" کون ہے ؟" ۔ میں نے پکارا ۔

"میں ۔" آواز نیلم کی تھی ۔

"اوہ نیلم ۔ کہاں تھیں تم ؟۔"

"مجھے یاد کر رہے تھے ؟۔"

"ہاں۔"

"کیوں ؟۔"

"پتا نہیں ۔ اپنی اس بے نور زندگی میں تمہاری روشنی کا تصوّر کر لیتا ہوں تو۔" میری آواز رندھ گئی۔

"آو۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کہاں ؟ ۔" میں نے پوچھا۔

"آؤ چہل قدمی کرتے ہیں ۔" وہ آگے بڑھتی ہوئی بولی ۔ اور میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ دیر تک وہ مجھے سہارا دیئے سیر کراتی رہی پھر ایک دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی ۔ "کافی پیو گے ؟۔" اس نے پوچھا۔

"پلا دو" میں نے کہا اور وہ اٹھ کر چلی گئی ۔ کئی منٹ کے بعد وہ کافی کی سوندھی سوندھی خوشبو کے ساتھ واپس آگئی ۔ اس نے ایک پیالی میرے سامنے رکھ دی ۔ ہم دونوں خاموشی سے کافی پیتے رہے ۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا۔

"تم نے دنیا میں کسی کو چاہا ہے ؟۔"

"میں نے ؟۔"

"ہاں۔"

"زندگی نے مجھے ۔ مجھے ۔" میری زبان لڑکھڑا گئی ۔ سر میں چکر سا آگیا تھا۔

"خاموش کیوں ہو گئے ؟۔"

"نہ جانے کیا۔ نہ ۔ جانے کیا ۔" میں نے کہا لیکن زبان ساتھ نہ دے سکی۔ ہوش و حواس گم ہوتے جا رہے تھے ۔ اس کے بعد ۔ اس کے بعد کوئی احساس نہ رہا، کچھ یاد نہ رہا ۔ پھر نہ جانے کیا کیا ہوتا رہا ۔ نہ جانے کیا کیا ۔ میں ایک سحر کے سے عالم میں ڈوبا رہا ۔ کبھی ہوش آتا تو عجیب سا محسوس ہوتا لیکن پھر بے ہوشی ۔ مکمل بے ہوشی ۔

پھر ایک دن، کسی نے مجھے آواز دی ۔ حواس جاگ رہے تھے ۔ اعصاب

قابو میں تھے ۔

"کون ہے ؟۔"

"میں نیلم ہوں۔"

"نیلم ۔۔"

"ہاں ۔" اس نے جواب دیا اور میں اپنی کیفیت کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر پیشانی پر ایک دباؤ کا احساس ہوا اور میرے دونوں ہاتھ اس دباو کو ٹٹولنے لگے ۔

"یہ کیا ہے نیلم ؟۔"

"اسے نہ چھیڑو ۔ آج میں تمہاری پٹی کھولنے جا رہی ہوں ۔"

"پٹی ؟ ۔"

"ہاں ۔ میرے لیے دعا کرو یہ میری زندگی کی پہلی کوشش ہے ۔"

"میں کچھ سمجھ نہیں سکا نیلم ۔"

"میں نے ۔ میں نے تمہیں تمہاری آنکھیں واپس کرنے کی کوشش کی ہے ۔ میں نے آپریشن کر کے تمہاری آنکھیں دوبارہ تمہارے حلقوں میں فٹ کر دی ہیں ۔ آہ کاش ۔ آہ کاش، مجھے کامیابی حاصل ہو جائے ۔"

"نیلم ۔" میں نے بھینچی بھینچی آواز میں کہا۔

"ہاں میرے ساتھی میرے دوست قادر، شاید میں تم سے محبت کرنے لگی وں ۔ مجھ سے تمہاری یہ بے بسی نہیں دیکھی گئی ۔ میں آئی سرجن کی بیٹی ہوں ۔ ں نے ہمیشہ اپنے پاپا کے ساتھ کام کیا ہے ۔ ایسے آپریشن میرے لیے کوئی حیثیت ین رکھتے ۔ میں نے ان سے اختلاف کیا تو انہوں نے مجھ پر پابندی لگا دی ۔ اور ں ان کے کام سے الگ ہٹ گئی ۔ لیکن تمہارے لیے ۔ تمہارے لیے ۔"

"نیلم ۔"

"دعا کرو قادر میری کوشش کامیاب ہو جائے ۔ دعا کرو ۔" اس نے مجھے یک کرسی پر بٹھا دیا ۔ اور پھر میری پٹی کھولنے لگی ۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا ا ۔ بری طرح ۔ پٹی کھل گئی ۔ اور پھر میں نے پلکیں جھپکائیں ۔ بے نور خلا میں

آنکھیں واپس آگئی تھیں۔ اور پھر نیلم کا چہرہ۔ ہاں میری دنیا پھر روشن ہو گئی تھی۔ میرے حلق سے چیخ نکل گئی۔

"نہیں۔ خدا کے لیے جذباتی مت بنو۔ وہ دونوں یہاں موجود ہیں۔" نیلم نے خوفزدگی سے کہا۔

"نیلم۔ میں دیکھ سکتا ہوں۔" میں نے مسرت کے لہجے میں کہا اور وہ مسکرا دی۔

"میرے دوست، میرے محبوب، اسے میری محبت کا تحفہ سمجھو۔" اس نے کہا اور میں نے اسے بے اختیار سینے سے بھینچ لیا۔ نیلم بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

"پپا ابھی واپس نہیں آئے۔ انہیں دو آنکھوں کی تلاش ہے۔ میں نے تمہاری آنکھیں ان کی تجربہ گاہ سے چرائی تھیں۔ ان کی جگہ میں نے دو ناکارہ آنکھیں محلول میں ڈبو دی تھیں۔ اسی لیے وہ آخری تجربہ مکمل نہ کر سکے۔ میں نے انہیں دھوکا دیا تھا قادر۔"

"اب کیا ہو گا؟۔"

"کچھ نہیں تمہارے لیے میں سب کچھ چھوڑ دوں گی۔ سب کچھ، سنو قادر، پپا اگر آ بھی جائیں تو تم خود کو اندھا ظاہر کرو گے۔ اسی طرح عمل کرو گے جس طرح کرتے رہو۔ پھر ہم۔ پھر ہم موقع پا کر یہاں سے نکل جائیں گے۔ یہاں سے نکل جائیں گے ہم۔"

نیلم میرے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی۔ اتفاق سے اس دن ڈاکٹر شہباز واپس آگیا۔ وہ افسردہ اور ملول تھا۔ رات کے کھانے پر وہ مجھ سے ملا۔

"میں ناکام رہا ہوں۔ کوئی نہیں مل سکا مجھے آہ، کوئی نہیں مل سکا۔ بس دو آنکھوں کی ضرورت ہے صرف دو آنکھوں کی۔ نور اس کے بعد۔ اس کے بعد۔ مگر کیا کروں۔ میں کیا کروں۔ یہ دنیا بہت خود غرضی ہے۔ وسیع تر انسانی قدرت کے لیے کوئی خود کو پیش نہیں کرتا۔ لیکن۔ لیکن۔" وہ خاموش ہو گیا۔

دوسری صبح نیلم نے کہا۔ پپا شاید پھر کسی کی تلاش میں جانے والے ہیں۔

قادر ہمیں فیصلہ کرنا ہو گا۔ ہم یہاں سے نکل چلیں گے قادر۔ بولو، کیا تم مجھے اپنی زندگی میں قبول کر لو گے؟۔"

"تمہارے سوا اب اس کائنات میں میرا کوئی نہیں ہے نیلم، میری باقی زندگی تمہاری ہے۔"

"پپا کو میرے چلے جانے کا بہت دکھ ہو گا۔"

"ہمیں فیصلہ کرنا ہو گا نیلم۔"

"میں فیصلہ کر چکی ہوں۔ بس پپا کے جانے کا انتظار ہے۔" ہم دونوں پروگرام بناتے رہے۔ میری دنیا پھر سے جگمگا اٹھی تھی۔ گو باہر کی دنیا میرے لیے خطرناک تھی لیکن نیلم جیسی شریک زندگی کے ساتھ کسی گمنام گوشے میں بسر کرنا مشکل نہ ہو گا۔

میں بوڑھے شہباز کے جانے کا انتظار کرتا رہا۔ اسے میں نے ایک بار بھی شبہ نہ ہونے دیا کہ میری آنکھیں مجھے واپس مل چکی ہیں۔ اس دن نیلم کچھ مصروف تھی اس لیے پھر میری اس سے ملاقات نہ ہوئی رات کو بھی وہ نہیں آئی تھی۔ میں ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ جب وہ ناشتے پر بھی نہ ملی میں خود اس کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ وہ کمرے میں موجود تھی۔ بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔

"خیریت نیلم۔ کچھ بیمار"۔ میری آواز حلق میں اٹک گئی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ہاں میری منحوس آنکھوں نے جو کچھ دیکھا تھا۔ وہ ناقابل یقین تھا۔ آہ۔ نیلم کے خوبصورت چہرے پر آنکھوں کی جگہ دو غار نظر آ رہے تھے۔ دو غار۔ ڈاکٹر شہباز نے اسے بھی اپنے جنون کی نذر کر دیا تھا۔

"ڈاکٹر۔ ڈاکٹر کتے۔ پاگل۔ دیوانے تو نے مردود۔ تو نے میری نیلم کو بھی نہ چھوڑا۔ تو نے جنونی کتے۔ میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔" میں پاگل کی طرح چیختا ہوا باہر نکل آیا۔ لوہے کی ایک وزنی راڈ مجھے مل گئی۔ میں نے اسے دونوں ہاتھوں میں پکڑا اور لیبارٹری میں گھس گیا۔ ڈاکٹر شہباز وہاں موجود تھا۔

"کون ہے؟۔ کون چیخ رہا ہے؟۔" "تو نے نیلم کی آنکھیں نکال لیں ڈاکٹر۔ تو نے۔" میں نے لوہے کی راڈ پوری قوت سے اس کے سر پر دے ماری۔

خون کا فورا بلند ہو گیا۔ "تو نے کتے۔ تو نے اسے۔" مجھ پر جنون سوار تھا۔ لوہے کی راڈ سے میں نے اسکا بھیجہ باہر نکال دیا۔ اس کے دونوں ساتھیوں نے مجھے پکڑنا چاہا۔ لیکن مجھے نہ سنبھال سکے۔ وہ دونوں بھی بری طرح زخمی ہو گئے تھے۔ مجھ پر خون سوار تھا۔ پھر میں نے راڈ پھینک دی۔

"نیلم دروازے میں کھڑی تھی۔

"نیلم۔ نیلم۔ تم اندھی ہو گئیں نیلم۔ آہ۔ میں تو تمہیں تمہاری آنکھیں بھی نہیں دے سکتا۔"

"تم نے۔ تم نے پپا کو مار ڈالا قادر؟۔"

"ہاں نیلم۔ میں نے یہ کیا ہے۔ میں اس کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔ نیلم' میری زندگی میری روح۔ کاش۔ کاش۔" میں رو پڑا۔

نیلم کھڑی رہی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

" پپا کا مشن عظیم تھا قادر۔ لیکن وہ اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے جنونی ہو گئے تھے۔ یہ ہونا تھا۔ یہ ضرور ہونا تھا۔ اب تم یہاں سے چلے جاؤ۔ جاؤ قادر۔ تمہاری دنیا تمہیں مبارک۔"

"تمہارے بغیر نیلم۔ تمہارے بغیر۔"

"نہیں قادر۔ تم میرے اندھے وجود کو کہاں گھسیٹتے پھرو گے۔ پہلے دوسری بات تھی۔ جاؤ پلیز۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ پپا کی موت کا ماتم کروں یا۔ ۔" وہ سسک پڑی۔

"نہیں نیلم۔ میں تمہارے بغیر جینا نہیں چاہتا۔ اگر تم نے میرا ساتھ نہ دیا میں۔ میں ہاں نیلم میں سزائے موت کا مجرم ہوں۔ میں خود کو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ میں اکیلا نہیں جی سکتا۔ جیوں گا تو تمہارے ساتھ ورنہ موت سے بہتر اور کوئی شے نہیں ہے میرے لیے۔ آؤ نیلم مجھے زندگی کی طرف لے چلو۔ آؤ ہم اپنے لیے ایک دنیا تلاش کریں۔"

میں نے نیلم کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ آہستہ قدموں سے میرے ساتھ چل پڑی۔

پراسرار گڑیا

تنہا زندگی کے کیا فوائد ہیں اور کیا نقصانات۔ اس کے بارے میں اس نے بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ طویل عرصہ سے تنہا تھا۔ زندگی میں کوئی خاص گہما گہمی نہیں تھی۔ بس سیدھا سیدھا وقت گزار رہا تھا۔ ایک چھوٹی سی فرم تھی جو اس کے باپ نے مرنے سے پہلے اپنی بیوی یعنی اس کی ماں کے نام کر دی تھی۔ اور ماں کی موت کے بعد وہ اس کے ورثے میں آ گئی تھی۔ فرم کے ملازمین وہی پرانے لوگ تھے اور فرم کے معاملات کے بارے میں وہ محسن سے کہیں زیادہ جانتے تھے چنانچہ اس نے کبھی ان کے معاملات میں دخل نہیں دیا۔ بوڑھے منیجر صاحب کی عمر تقریبا پینسٹھ سال ہو چکی تھی۔ اس فرم کے کرتا دھرتا تھے بس محسن کو اس کی ضرورت کے مطابق اخراجات مل جاتے تھے۔ فرم خسارے میں ہے یا منافع میں ہے ملازمین کی تنخواہیں نکل رہی ہیں کاروبار چل رہا ہے یا نہیں یہ سارے معاملات منیجر صاحب ہی جانتے تھے۔ محسن نے کبھی ان سے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ضرورت بھی نہیں تھی۔ اسے کوئی دقت ہوتی تو وہ کبھی اس معاملے میں دلچسپی لیتا۔ ذہنی طور پر وہ آزاد انسان تھا اور آزاد ہی رہنا چاہتا تھا اسے کیا ضرورت پڑتی تھی کہ جھگڑے کا شکار ہوتا اس کی زندگی تو ایک معمول پر چل رہی تھی اور اس معمول میں وہ کسی تبدیلی کا خواہشمند نہیں تھا۔ دن میں تقریبا گیارہ بجے یا ساڑھے گیارہ بجے سو کر اٹھتا تھا۔ غسل کرنے کے بعد ناشتہ کرتا۔ ظاہر ہے اسکے بعد کھانے کی کیا ضرورت رہتی۔ ناشتہ کے بعد ایک چکر فرم کا لگاتا تھا اور منیجر صاحب کی طویل گفتگو سننا اس کے معمولات میں شامل تھا اس پر توجہ نہ دینا بھی اس کے معمولات ہی میں ہی تھا۔ شام کے چار بجے وہاں سے اٹھتا۔ گھر آ جاتا۔ پھر دو تین گھنٹے آرام۔ اصل زندگی تو چھ بجے کے بعد شروع ہوتی تھی۔ وہ نہا دھو کر اپنا لباس تبدیل کر کے اپنی چھوٹی سی خوبصورت گاڑی میں باہر نکل آتا اور پھر فیروزن کلب یا پھر کوئی اور تفریح گاہ پہنچ جاتا۔

کلب میں بے شمار لڑکیاں اس کی شناسا تھیں لیکن صرف شناسا۔ محسن ان لڑکیوں کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ ان میں زیادہ تر شکاری لڑکیاں تھیں اور کسی نہ کسی کو دام فریب میں پھانس کر زندگی کی دلچسپیاں حاصل کرنا ان کا مقصد ہوتا تھا۔ لیکن محسن ایسی لڑکیوں کی قربت کا قائل نہیں تھا۔ وہ ان لڑکیوں کو خون چوسنے والی جونک سے تشبیہ دیتا تھا اور کہتا تھا کہ جونکیں مجھے بالکل پسند نہیں ہاں اگر کوئی ایسی لڑکی مل جاتی جو یا تو صرف اپنے مقصد سے مقصد رکھتی فضول باتوں سے گریز کرتی۔ پھر ذہنی طور پر وہ اس قدر چالاک اور فریبی نہ ہوتی۔ ایسی کئی لڑکیاں محسن کی دوست رہ چکی تھیں۔ بہرصورت محسن ان سے اس قدر مطمئن نہیں ہوا تھا۔ البتہ آجکل اس کی زندگی میں ایک لڑکی نے خاصا مقام حاصل کر لیا تھا وہ ریتا تھی۔ ریتا کرسچن نہیں تھی۔ لیکن انداز انہی کے اپنائے ہوئے تھے۔ پہلی نگاہ میں تو وہ محسن کو پسند نہیں آئی لیکن جب وقت گزاری کے لئے اس نے اس سے شناسائی کر لی تو ریتا کی فطرت اس کے سامنے کھلنے لگی اور اس نے سوچا کہ ریتا بلاشبہ عام لڑکیوں سے مختلف ہے۔ وہ فطرتاً ان کی طرح بری نہیں ہے نہ لالچی ہے نہ دنیا کی باتوں سے اتنی زیادہ دلچسپی رکھتی ہے کہ ناگواری کا احساس ہونے لگے۔

محسن نے اس سے بہت سی باتیں کی تھیں اور ریتا کے خیالات اسے بیحد پسند آئے تھے۔ ریتا زندگی کو سرسری نگاہ سے دیکھنے کی عادی تھی۔ اس کی گہرائیوں میں پڑ کر وقت کی دلچسپیوں کو ختم کرنے کی شائق نہیں تھی اور محسن کو اس کی یہی باتیں پسند تھیں۔

آج صبح ہی سے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ساڑھے گیارہ بجے جب وہ سو کر اٹھا تو دھوپ کا نام و نشان نہیں تھا۔ باہر کا موسم بڑا ہی خوشگوار تھا اور خوشگوار موسم ہر جوان ذہن میں عجیب بے کلی پیدا کر دیتا ہے۔ دوپہر کو اس نے سوچا کہ آج تمام مصروفیات ترک کر دی جائیں اور موسم کا لطف اٹھایا جائے لیکن کس طرح۔ تنہا تو وقت گزارنا مشکل ہے۔ ریتا شام ہی کو دستیاب ہو سکے گی۔ حالانکہ محسن کو

لیکن ریتا نے اس سے درخواست کی تھی کہ مکان پر اس کی حیثیت ذرا مختلف ہے وہ اس لئے وہاں اس سے رابطہ نہ قائم کیا جائے۔ حسب معمول محسن نے اس بات کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ ظاہر ہے یہ ریتا کی الجھن تھی اس کے بارے میں تفصیل پوچھنے سے کیا فائدہ۔ چنانچہ وہ کبھی ریتا کے گھر نہیں گیا تھا اور اپنے اس اصول کو آج بھی نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ ناشتہ وغیرہ کرنے کے بعد وہ اداسیوں کا شکار ہو گیا جب کوئی بات سمجھ میں نہ آئی تو اس نے معمولات میں تبدیلی پسند نہ کی اور دفتر چلا گیا۔ وقت گزارنا بے حد مشکل تھا۔ موسم تھا کہ زیادہ سے زیادہ گلابی ہوتا جا رہا تھا۔ بمشکل تمام چھ بجے تھے کہ وہ گھر واپس لوٹ آیا۔ پھر اس نے تیاریاں کیں اور فیروزن کلب کی جانب نکل کھڑا ہوا۔

اندازے کے مطابق فیروزن کی رونقیں شباب پر تھیں موسم سے لطف اندوز ہونے والے نہ جانے کب یہاں پہنچ گئے تھے۔ وہ اپنی میز پر جا بیٹھا اور ریتا کا انتظار کرنے لگا۔ ریتا ضرور آتی تھی۔ محسن نے اپنی پسند کی شراب طلب کر لی اور اس کی ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگا۔ وہ ایک مخصوص حد تک پینے کا عادی تھا تاکہ ذہن بھٹکنے نہ پائے لیکن نہ جانے کیوں ریتا ابھی تک نہ آئی۔ وقت ہو چکا تھا اور اسے پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اس کے انداز میں بے کلی پیدا ہو گئی۔ شراب اس کا ساتھ ضرور دے رہی تھی کہ لیکن ریتا کے بغیر نشہ مکمل نہیں ہو رہا تھا۔

پھر جب حد سے زیادہ وقت گزر گیا تو محسن کے ذہن میں پریشانیاں ابھر آئیں کیوں نہیں آئی اور اب کیا کیا جائے یوں تو نگاہوں کی منتظر بے شمار لڑکیاں ہال میں موجود تھیں لیکن ان سب کے ساتھ دل نہیں لگتا تھا اور پھر ایسے موسم میں تو نہیں برداشت کرنا اور بھی مشکل تھا اس موسم میں تو ریتا کی حسین ادائیں ہی ضروری تھیں تاکہ موسم کا لطف دوبالا ہو جائے اور اب ریتا کی غیر موجودگی اس کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی وہ پہلے کبھی ریتا کے مکان پر نہیں گیا تھا لیکن آج اس نے فیصلہ کر لیا کہ کسی بھی قیمت پر ریتا کو حاصل کیا جائے۔ چنانچہ تھوڑی دیر تک پینے کے بعد وہ کلب سے اٹھ گیا۔ باہر کھڑی گاڑی اسٹارٹ کی اور چل پڑا۔ ننھی

ننھی بوندیں اسکرین کو دھندلا کر رہی تھیں۔ اس نے واپر چلا دیئے اور ست رفتاری سے سفر کرنے لگا۔

ریتا کا مکان شہر کے آخری سرے پر ایک چھوٹی سی آبادی میں تھا۔ یہ آبادی متوسط طبقے کے لوگوں کی تھی اور یہیں کہیں کسی بلڈنگ میں اس کا قیام تھا۔ وہ سنسان سڑکوں سے گزرتا رہا بارش کی وجہ سے سڑکیں بالکل ہی سنسان ہو گئی تھیں۔ یوں بھی خاصا وقت ہو گیا تھا۔ اور سڑکیں تو بالکل ہی تاریک ہو گئی تھیں۔ غالباً یہاں اسٹریٹ لائٹیں خراب ہو گئی تھیں۔ دفعتاً اسے ایک بدن نظر آیا۔ یقینی طور پر کوئی انسانی بدن تھا اور اس کا پاؤں خود بخود بریک پر جا پڑا۔ گاڑی کی رفتار ہلکی ہو گئی تھی۔

بے ضمیر لوگوں کی دنیا میں کمی نہیں ہوتی۔ لوگ سنسان سڑکوں پر حادثے کرتے ہیں اور اس طرح زخمیوں کو چھوڑ کر فرار ہو جاتے ہیں جیسے انسانیت سے ان کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ اپنی تھوڑی سی مصیبت بچانے کے لئے ایک آدمی کی زندگی خطرے میں پڑ رہی ہے۔ بہت سے ایسے واقعات محسن کو یاد آئے۔ بلاشبہ ایسے کسی حادثے میں ملوث ہونے سے الجھنوں میں اضافہ ہو جاتا تھا اور بہت ساری مشکلات پیش آ سکتی تھیں لیکن اس کے باوجود انسانی ہمدردی اس کے ذہن پر اثر کرنے لگی اور اگر ایسا حادثہ ہوا ہے تو وہ اسے نظر انداز نہیں کرے گا جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا۔ چنانچہ وہ برق رفتاری سے آگے بڑھا اور اس بدن کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس نے گاڑی اتنے فاصلے پر کھڑی کی تھی کہ انسانی جسم روشنیوں کے درمیان رہے۔ چنانچہ وہ گاڑی سے اتر کے جلدی سے اس شخص کے قریب پہنچ گیا۔ زمین پر پڑا ہوا درمیانی عمر کا شخص آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ ویسے نہ قرب و جوار میں خون کے دھبے نظر آ رہے تھے اور نہ ہی کوئی ایسی چیز جس سے یہ اندازہ ہوتا کہ وہ کسی ایسے حادثے کا شکار ہوا ہے۔ محسن اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے بوڑھے کے سینے پر ہاتھ رکھا اور اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ پھر اس نے

بنی انداز میں محسن کا بازو پکڑ لیا۔

"مجھے! مجھے! اس سامنے والے مکان کی طرف لے چلو۔ وہ جس کی بالائی زل میں روشنی نظر آ رہی ہے۔" اس نے آہستہ آہستہ بمشکل تمام یہ الفاظ ادا کئے ور محسن نے گردن گھما کر اس جانب دیکھا۔ جس عمارت کی جانب بوڑھے نے شارہ کیا تھا۔ وہ تقریباً دو تین فرلانگ ضرور تھی۔ بہر صورت یہ شکر تھا کہ بوڑھا ت زیادہ بری حالت میں نہیں تھا۔ چنانچہ محسن نے اسے سہارا دیکر اٹھایا اور اپنی ار کی طرف لے آیا۔ کار کی پچھلی سیٹ پر بوڑھے کو لٹا دیا اور پھر مناسب رفتار سے اس عمارت کی جانب چل پڑا۔ ایک ذیلی سڑک عمارت کے نزدیک جاتی تھی۔ وشنما عمارت تھی جس میں نچلے پورے حصے میں تاریکی نظر آ رہی تھی۔ البتہ بالائی منزل پر روشنی تھی۔ محسن نے چند بار عمارت کے دروازے پر لگی ہوئی بیل بجائی اندر بیل بجنے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ لیکن کوئی دروازہ کھولنے نہیں آیا تھا۔ تب وہ بوڑھے کے نزدیک پہنچ گیا۔ بوڑھا نیم بیہوشی کی کیفیت میں تھا۔ اس نے بوڑھے کو نکالا اور دروازے کی طرف چل پڑا۔ بوڑھے کا وزن اس نے باآسانی اٹھا لیا تھا۔ کیونکہ وہ بظاہر ایک طویل جثہ نوجوان تھا۔ اندر داخل ہو کر اس نے بوڑھے کو سہارا دیکر نیچے اتارا۔ پھر بوڑھا ہوش میں آ گیا تھا۔ چنانچہ وہ کمزور آواز میں بولا۔

"چابی میری جیب میں ہے۔"

"اوہ اس عمارت میں اور کوئی نہیں ہے۔" محسن نے سوال کیا۔

"نہیں اور کوئی بھی نہیں ہے میں یہاں تنہا ہوں۔" بوڑھے نے کہا اور محسن نے اس کی جیب سے چابی نکال لی پھر دروازہ کھولا اور بوڑھے کو سہارا دے کر اندر لے گیا۔ اندر تاریکی تھی۔ بوڑھے کی ہدایت پر اس نے روشنی کر دی اور پھر وہ ایک خوابگاہ کے بستر پر بوڑھے کو لٹانے کے بعد اس نے چاروں طرف دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بوڑھے کی مدد کس طرف کرے۔ بہر صورت وہ

بوڑھے لو لٹا کر باہر نکل آیا۔ پھر وہ پانی لے کر بوڑھے کے نزدیک پہنچ گیا اور اسے سہارا دیکر پانی پلایا۔ پانی پینے سے بوڑھے کی حالت اعتدال پر آنے لگی تھی۔ وہ بستر پر پڑا گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ پھر اس نے بمشکل تمام کہا۔

"میری حالت اب پہلے سے کافی بہتر ہے۔ دل کا مریض ہوں دورہ پڑ گیا تھا۔"

"اوہ"۔ محسن نے افسوس زدہ لہجے میں گردن ہلائی اور پھر بولا "کیا آپ کا کوئی مخصوص ڈاکٹر ہے۔ میں اسے بلا کر لاؤں۔"

"نہیں بیٹے کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔ وہ برابر والا کمرہ میرا مقصد ہے اس کمرے کے برابر جو کمرہ ہے اس میں ایک کارنر پر دواؤں کی شیشیاں رکھی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک دوا لا کر مجھے پلا دو۔ پھر میری حالت کافی بہتر ہو جائے گی۔"

محسن نے گردن ہلائی اور باہر نکل آیا۔ اس کے ذہن سے ریتا محو ہو گئی تھی۔ غالباً اس کے بدن میں انسانیت کی دبی ہوئی چنگاری موجود تھی۔ جس نے اسے وقتی طور پر اپنی مصروفیات سے دور کر دیا تھا اور ایک انسانی ہمدردی اس کے رگوں میں سرائیت کر گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دوسرے کمرے میں پہنچ گیا۔ جس کارنس کے بارے میں بوڑھے نے بتایا تھا وہاں شیشیاں اور گلاس وغیرہ رکھے تھے۔ اس نے ان میں سے بوڑھے کی بتائی ہوئی دوا کی شیشی اٹھائی اور باہر نکل آیا۔

دوسرے کمرے میں آ کر اس نے بوڑھے کو شیشی کی دوا نکال کر اس کی ہدایت کے مطابق پلائی اور اس کے نزدیک ہی ایک اسٹول کھینچ کر بیٹھ گیا۔ میں اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔

بظاہر بوڑھے کے خدوخال بہت ہی اچھے تھے' وہ شکل سے ایک پر رعب شخص معلوم ہوتا تھا لیکن جس گھر میں اور جس حالت میں وہ نظر آ رہا تھا اس سے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی مالی حالت بیحد خراب ہے اور وہ بہت ہی مشکل زدہ زندگی گزار رہا تھا۔

کمرے میں نہایت مختصر سا سامان تھا اور کوئی بھی چیز ایسی نہیں تھی جسے

طمینان بخش کہا جا سکے۔ دیواروں پر جابجا گرد جمی ہوئی تھی اور گندے نشانات نظر آ رہے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ بوڑھا کتنی بدحال زندگی سے دوچار ہے۔

اسے بوڑھے سے نجانے کیوں بہت زیادہ ہمدردی محسوس ہوئی' ریتا کا نیال اب اس کے ذہن سے قطعی طور پر نکل چکا تھا' فطری طور پر وہ ایک ہمدرد نسان تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ حالات نے اسے غلط راستوں کا راہی بنا دیا۔ اور وہ س انداز میں زندگی نہیں گزار سکا تھا۔ جو اس کی فطرت سے مطابقت رکھتا تھا۔ چنانچہ اس وقت اس کی انسانی ہمدردی پوری طرح بیدار ہو گئی تھی۔

دوا پینے کے بعد بوڑھے کے چہرے پر سکون کے آثار نظر آنے لگے۔ اس نے ادھ کھلی آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا اور پھر محبت بھرے لہجے میں بولا۔

"تم جیسے لوگوں کو دیکھ کر ہی بیٹے یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ دنیا ابھی انسانیت کے ہمدردوں سے خالی نہیں ہے۔"

"اتنا تو کرنا ہی چاہیے بابا۔ میں نے آپ کے ساتھ کوئی خاص احسان نہیں کیا' آپ سڑک کے درمیان پڑے ہوئے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس تاریک رات میں بھی میری نگاہ آپ پر پڑ گئی۔ اگر کوئی تیز رفتار گاڑی گزرتی' تو وہ شاید آپ کو زخمی کر دیتی۔"

"اس کے باوجود تم کہتے ہو بیٹے کہ تم نے میرے اوپر کوئی احسان نہیں کیا۔""؟

"ہاں بابا۔ براہ کرم اس کا ذکر کر کے مجھے شرمندہ نہ کریں' میں نے آپ کو دیکھ کر یہی سوچا تھا کہ ممکن ہے کوئی حادثہ ہو گیا ہو اور آپ کو زخمی کرنے والا اسی لرح چھوڑ کر فرار ہو گیا ہو۔ اکثر ہمارے ہاں اس قسم کے واقعات ہوتے رہتے ہیں با' انسانی زندگی کی ان لوگوں کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں ہے۔ سب کے سب اپنے اپ میں مگن رہتے ہیں اور یہ بڑی دردناک بات ہے۔" اس نے کہا۔

"ہاں بیٹے۔" بابا نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "اخلاقی اصول تو تقریباً اس

دنیا سے ختم ہی ہو گئے ہیں' میں تمہارا بیحد شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھ سے اتنی ہمدردی کی گفتگو کی اور میرے کام آئے۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں بیٹے اور مجھے یقین ہے کہ دس پندرہ دن تک میں بالکل ٹھیک رہوں گا۔ حالانکہ دل کے دورے جان لیوا ہوتے ہیں اور انسان بمشکل ہی ان سے زندگی پاتا ہے' لیکن میں جانتا ہوں کہ مجھے موت بھی نہیں آئے گی' ہاں میری تقدیر سے موت بھی چھین لی گئی ہے۔"
بوڑھے کا لہجہ بڑا ہی دردناک ہو گیا اور محسن اس کی شکل دیکھنے لگا۔

پھر اس نے کلائی میں بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا' خاصی رات گزر چکی تھی اور اب وہ وقت تو نہیں تھا کہ وہ ریتا کے مکان پر جاتا وہ بھی پہلی بار' چنانچہ اب تو یہ رات تنہا ہی گزارنی تھی' تو کیوں نا اس بوڑھے کے ساتھ ہی تھوڑا سا وقت گزارا جائے۔ اس نے سوچا۔ اور بوڑھے کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

"آپ کے الفاظ میں بڑی بے بسی ہے بابا' کیا آپ بتانا پسند کریں گے۔"
اس نے سوال کیا اور بوڑھے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"انسان کی فطرت میں تجسس لازمی ہے" تمہیں یقیناً میرے بارے میں جاننے کی خواہش ہو گی۔ حالانکہ بڑی عام سی بات ہے' ایک مفلوک الحال شخص کی کہانی میں کوئی ندرت نہیں ہو سکتی' پھر تمہیں مجھ سے کیا دلچسپی ہے۔" اس نے محسن سے سوال کیا۔

"آپ کے الفاظ میرے تجسس کو ابھار رہے ہیں بابا۔"

"ہاں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ میں کچھ ایسی باتیں کہہ گیا ہوں جو انسان کو تجسس کا شکار کر سکتی ہیں۔ لیکن تمہارا وقت ضائع ہو گا بیٹے۔" بوڑھے نے بے بسی سے کہا۔

"میرا خیال ہے بابا اگر آپ پسند کریں تو مجھے اپنے بارے میں ضرور بتائیں ورنہ میں آپ کو مجبور بھی نہیں کروں گا' میں نے آپ کا ایک چھوٹا سا کام کیا ہے تو اس کے بعد یہ ضروری نہیں ہے کہ میں آپ کا اچھا وقت بھی لوں۔"

"نہیں بیٹے نہیں۔ اگر تمہیں میری ذات سے کچھ دلچسپی محسوس ہوئی ہے تو تمہیں اپنے بارے میں ضرور بتاؤں گا۔ دراصل میں صرف یہ سوچتا ہوں کہ میری کہانی کسی کے لئے زیادہ دلچسپی کا باعث نہیں ہو سکتی اور جس شخص نے اس میں دلچسپی لی وہ میری طرح ہی مصیبتوں کا شکار ہو سکتا ہے۔"

"یہ بات بھی میرے تجسس کو ابھارتی ہے۔" محسن نے مسکراتے ہوئے کہا اور بوڑھے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"افسوس میں اس وقت تمہیں چائے یا کافی بھی نہیں پلا سکتا' بڑا قلاش آدمی ہوں بیٹے' تمہارا نام کیا ہے۔"

"محسن۔" محسن نے جواب دیا۔

"تو محسن یہاں میرے حالات بڑے ہی خراب ہیں' اتنے خراب کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"آپ نے کھانا کھایا بابا۔" محسن نے جلدی سے سوال کیا۔" ارے نہیں بیٹے' نہیں میرے بچے' اس حد تک بھی گیا گزرا نہیں ہوں' کھانا میں نے کھا لیا تھا۔ کیا تم بھوکے ہو۔"

"نہیں بابا۔ میں کھانا کھا چکا ہوں۔"

"ہوں۔" بوڑھے نے ایک گہری سانس لی اور دیر تک کسی خیال میں ڈوبا رہا' پھر محسن کی جانب دیکھ کر بولا۔

"وہ سامنے ایک چھوٹی سی الماری دیکھ رہے ہو نا۔" بوڑھے نے ایک طرف اشارہ کیا اور محسن نے اس طرف دیکھا۔ سامنے ہی ایک لکڑی کی الماری نظر آ رہی تھی جس کے پٹ بند تھے۔

"ہاں بابا۔"

"یہ چابی لو اور ذرا اسے کھول دو۔" بوڑھے نے اپنے لباس سے ایک زنگ آلود چابی نکال کر محسن کے ہاتھ میں دی' اور محسن اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"بوڑھے کی ذات میں دلچسپی اور یہاں وقت گزارنے کا فیصلہ کرنے کے بعد اسے کوئی الجھن محسوس نہیں ہو رہی تھی اور وہ پوری دلچسپی سے بوڑھے کی شخصیت کا جائزہ لے رہا تھا۔ چنانچہ وہ چابی لے کر الماری کے نزدیک پہنچ گیا اور پھر اس نے الماری کا تالا کھول دیا۔

"جونہی اس نے الماری کے پٹ کھولے' روشنی کا ایک طوفان باہر رینگ آیا اور محسن چونک کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے تعجب سے اس روشن چیز کو دیکھا۔ یہ تقریباً پانچ انچ کی ایک چھوٹی سی گڑیا تھی۔ ایک عجیب و غریب گڑیا جو کسی ناچتی ہوئی عورت کی تھی۔ ایک مکمل اور بھرپور بدن والی عورت۔ لیکن وہ کسی ایسی دھات کی بنی ہوئی تھی جو بے پناہ چمکدار تھا اور اس سے روشنی پھوٹتی تھی۔

محسن نے حیرت سے اسے دیکھا' پھر اس نے جھک کر قریب سے اسے دیکھا' گڑیا تین حصوں میں تقسیم تھی اور تینوں حصے اس طرح آپس میں جوڑے گئے تھے کہ ایک ہی نظر آتے تھے۔

لیکن نجانے کیوں یہ اتنے چمکدار تھے' محسن اسے نہ سمجھ سکا۔ لیکن اس نے گڑیا کا اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا' پھر وہ بوڑھے کی جانب دیکھنے لگا جو مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"لے آو۔ نکال لاو اسے۔" بوڑھے کی آواز سنائی دی اور محسن نے ہاتھ بڑھا کر گڑیا اٹھالی۔

بہت زیادہ وزن بھی نہیں تھا' لیکن اس کی چمک' خدا کی پناہ' بے پناہ چمک تھی' محسن نے اس قدر چمکدار گڑیا پہلے نہیں دیکھی تھی۔ اٹھاتے ہوئے بھی یوں لگتا تھا جیسے ہاتھ جل جائے گا۔ لیکن ایسی کوئی بات نہ ہوئی وہ بالکل ٹھنڈی تھی۔ تب محسن گڑیا کو اٹھائے ہوئے بوڑھے کے پاس پہنچ گیا۔ اور بوڑھے نے اسے بیٹھنے کی پیش کش کی۔ محسن بیٹھ گیا تو بوڑھے نے بھاری لہجے میں کہا۔

"تم جانتے ہو یہ کیا ہے۔"

"نہیں۔" محسن نے جواب دیا۔

"میری مراد ہے کیا تم یہ اندازہ کر سکتے ہو کہ اسے کس چیز سے تراشا گیا ہے۔"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا' نہ ہی میری معلومات ہیں۔ کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گے کہ یہ اس قدر چمک کیوں رہی ہے۔"

"اس لئے کہ اس کی تعمیر میں تین عظیم ہیرے استعمال کئے گئے ہیں' اتنے ے ہیرے جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا' ایسے ہیرے دنیا میں چند ہی پائے گئے ں اور وہ ایسے لوگوں کے پاس ہیں جن کی مالی حیثیت کا صحیح اندازہ بھی نہیں کیا جا تا۔" بوڑھے نے جواب دیا اور محسن کی آنکھیں تعجب سے پھیل گئیں۔

"تب تو یہ بیحد قیمتی گڑیا ہے۔"

"ہاں میرے دوست' کیا تم اسے حاصل کرنا پسند کرو گے۔" بوڑھے نے ال کیا اور محسن متحیرانہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

"میں نہیں سمجھا بابا۔"

"کیا یہ تمہیں اس قدر پسند ہے کہ اگر میں پیش کروں تو تم اسے قبول کر لو ے۔"

"میں واقعی حیرت کا شکار ہو گیا ہوں۔ بابا تمہاری ظاہری حیثیت سے یہ دازہ نہیں ہوتا کہ تم کوئی ایسے شخص ہو کہ جس کے پاس یہ انتہائی نایاب چیز موجود د اور پھر تم اسے مجھے پیش کرنے کی بات کرتے ہو۔"

"ہاں تم چاہو تو اسے لے لو۔" بوڑھے نے کہا اور پھر جیسے نیند سے بیدار گیا۔

"نہیں نہیں۔ میں یہ تمہیں نہیں دوں گا۔ تم نے میرے اوپر احسان کیا ہے۔" وہ عجیب سے انداز میں بولا اور میں اس کی صورت دیکھتا رہا۔ پھر اس نے لہا۔

"بس بابا بہت ہو چکی۔ میرا خیال ہے کہ خاصی تجسس کی فضا پیدا ہو گئی

ہے۔ اگر آپ مجھے اپنے بارے میں بتانا پسند کریں تو بتا دیں۔ ورنہ مجھے اجازت دیں۔"

"نہیں بیٹے! بخدا اگر تم چاہو تو اسے اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو لیکن اگر یہ تمہارے پاس رہی تو سوچ لو کہ تم خوفناک مصیبتوں کا شکار ہو جاؤ گے۔"

"کیا مطلب ہو۔"؟ "ہاں یہ قیمتی شے انتہائی منحوس ہے۔ یہ نحوست کی دیوی ہے اور جس شخص کے پاس یہ ہو تو یوں سمجھ لو کہ وہ اپنی زندگی کو گھن لگا بیٹھا ہے۔" "خوب۔" محسن نے دلچسپی سے کہا۔ لیکن اس کی کہانی ہے۔ بابا۔"؟

"اس کی کہانی اور میری کہانی ایک ہے۔ میرا نام شیراز ہے۔ ہندوستان کے ایک متمول گھرانے کا فرد ہوں۔ میرے آباد اجداد بڑی اچھی حیثیت کے مالک تھے۔ بیشمار زمین تھی۔ ہماری ُزر میں نے بچپن سے جوانی تک ایک مخصوص حد تک کا وقت سیر و شکار' تفریح' مہم جوئی' میں گذارا اسکے علاوہ کوئی کام نہیں تھا مجھے۔ چار بھائیوں میں سب سے چھوٹا بھائی تھا اور آخری۔ سبھی کی آنکھوں کا تارا سبھی مجھے چاہتے تھے۔ لیکن میری فطرت شروع ہی سے مجھے نحوست کی جانب دھکیل رہی تھی۔ مہم جوئی کی عادات میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کوئی پریشانی اور دقت تو تھی نہیں۔ ابتداء میں تو چھوٹے چھوٹے سیروشکار ہی کرتا رہا لیکن اس کے بعد لمبے سفر اختیار کرنا شروع کر دیئے۔ کچھ ہم خیال ساتھی بھی مل گئے تھے جو جو بعد میں میرے ساتھ رہا کرتے تھے اور ہم لوگ ملک سے باہر ایسے علاقوں میں بھی چلے جاتے تھے جو مہم جوئی کیلئے مناسب ہوں۔ ان دنوں ہم تبت میں تھے۔ تبت کی بلند ترین چوٹیاں ہمیں اپنی طرف کھینچ لائی تھیں۔ ہم نے ایک ناقابل تسخیر پہاڑ کا سفر کرنے کا ارادہ کر لیا اور اس کے لئے انتظامات کرنے لگے۔

تبت کے باشندے ہمارے رہبرو معاون تھے۔ چند افراد کو ہم نے اپنے ساتھ لے لیا اور اس بلند و بالا پہاڑ کو سر کرنے کیلئے چل پڑے۔ تمام ضروری انتظامات کر لئے گئے تھے۔ جو تبتی باشندے ہمارے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ انہوں

نے اپنا ایک سربراہ چن لیا تھا جس کا نام شکائی تھا۔ شکائی ایک نوجوان تندرست و توانا آدمی تھا اور بہت ہی نیک اور شریف طبیعت کا مالک' خاموش طبیعت رکھتا تھا اور کم گفتگو کرتا تھا۔ ویسے اس کارکردگی کی بناء پر میں نے اسے پسند کیا تھا۔

ہم بلند و بالا پہاڑ کے خطرناک راستے طے کرتے رہے اور آگے بڑھتے رہے اور کئی روز کے سفر کے بعد ہم لوگ درمیان میں پہنچ گئے۔ یہاں سے ایک آسان راستہ پہاڑ کی بلندیوں پر جانے کے لئے پگڈنڈیوں کی شکل میں نظر آیا تو میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ رک گیا۔

"واہ یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ راستہ باقاعدگی سے بنایا گیا ہے۔ میں نے کہا اور میرے ساتھی بھی اس پگڈنڈی کو دلچسپی کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ اگر اس پگڈنڈی کے ذریعہ سفر کیا جاتا تو پہاڑ کے ایک مخصوص حصہ تک پہنچنے میں کافی آسانیاں فراہم ہو سکتی ہیں جبکہ اس کے دوسری جانب سے یعنی اس راستے جس سے ہم ابتک سفر کرتے رہے تھے خاص مشکلات پیش آ سکتی تھیں۔ چنانچہ میں نے وہی روخ اختیار کیا لیکن اس وقت شکائی میرے پاس پہنچ گیا۔

"کچھ کہنا چاہتا ہوں جناب۔" اس نے سنجیدگی سے کہا اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"کیا بات ہے شکائی۔"؟

"یہ پگڈنڈی سفر کے لئے مناسب نہیں ہیں۔" شکائی نے کہا۔

"کیوں"؟ میں نے متحیرانہ لہجہ میں کہا۔

"بس جناب! میں پہلے بھی اس طرف آ چکا ہوں۔ یہ راستے منحوس راستے کہلاتے ہیں آپ کو اس طرف سے سفر نہیں کرنا چاہیئے۔ تھوڑی سی مشکلات ضرور پیش آئیں گی لیکن سفر کا وہی راستہ مناسب ہے۔"

"منحوس راستے۔" میں ہنس پڑا۔

"تم ان راستوں سے سفر کر چکے ہو شکائی۔" میں نے پوچھا۔ "جی ہاں جناب' دوبار' لیکن درمیان ہی سے لوٹ آنا پڑا ہے۔"

"کیا نحوست ہے ان میں۔" میں نے ہنستے ہوئے سوال کیا۔

"میں نہیں جانتا جناب! لیکن میں جن سیاحوں کے ساتھ یہاں تک آیا ہوں ان میں سے بہت سے ایسے تھے۔ جنہوں نے ان روایات کا مذاق اڑایا تھا اور پھر اس کے بعد انہیں ان راستوں سے واپس ہی لوٹنا پڑا۔ نہ جانے کیوں لاماوں میں اور تبت کے باشندوں میں یہ بات مشہور ہے کہ یہ پگڈنڈیاں بہت منحوس ہیں۔"

اگر یہ بات ہے شکائی تو ٹھیک ہے ہم صرف تفریحی مقصد کے تحت پہاڑ کی چوٹی پر جا رہے ہیں اور ہمیں کوئی قیمتی شے حاصل کرنا مقصود نہیں ہے۔ چنانچہ یہ روایت تو ہمارے لئے کافی دلکش ہو سکتی ہے۔"

"بالکل ٹھیک ہے جناب! ظاہر ہے میں آپ کو روکنے کی جرات تو نہیں کر سکتا لیکن چند مشکلات ضرور پیش آئیں گی۔"

"وہ کیا۔"؟ میں نے سوال کیا۔

"ممکن ہے ہمارے ساتھی مزدوران راستوں پر سفر کرنا پسند نہ کریں۔"

"اوہ۔ ہاں یہ مشکل تو ہے لیکن کیا تم انھیں سمجھا نہیں سکتے۔" میں نے پوچھا۔

"میں۔"؟ شکائی ہچکچائے ہوئے انداز میں بولا۔

"کیا۔ تم ان راستوں سے ڈرتے ہو۔""؟

"جی ہاں جناب! ان دیکھے حادثے انسان کو خوفزدہ کر ہی دیتے ہیں۔"

"سامنے سے کوئی مصیبت آئے تو اس سے نمٹنے کا بندوبست بھی کیا جا سکتا ہے لیکن اگر فضا میں خاموش بلائیں گردش کر رہی ہوں تو آدمی کیا کر سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے جناب! ان خاموش بلاوں کو بھی دیکھیں آخر یہ ہیں کیا۔""؟ میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور شکائی پریشانی سے گردن ہلانے لگا۔

"ٹھیک ہے جناب! اگر آپ کی یہ ہی مرضی ہے تو میں آپ کا ساتھ دوں گا لیکن مزدوروں میں سے اگر کچھ لوگ واپس جانا چاہیں تو براہ کرم آپ انھیں ضرور اجازت دیدیں۔ ہم ان کی زندگی خطرہ میں نہیں ڈال سکتے۔"

"ٹھیک ہے شکائی! اگر ایسی بات ہے تو تم یہ اختیار رکھتے ہو کہ جس کو چاہو واپس کر دو۔" میں نے کہا اور شکائی گردن ہلا کر چلا گیا۔

" اور اس کا کہنا سچ ہی نکلا۔ تقریباً آٹھ مزدور واپس چلے گئے میں نے انھیں معاوضہ کی ادائیگی کر دی تھی جس کا میں نے ان سے وعدہ کیا تھا۔ باقی چند مزدور ہمارے ساتھ رہ گئے تھے جو باہمت اور نوجوان تھے۔ میرے ساتھی بھی اس سفر کے سلسلے میں خاصے متجسس نظر آ رہے تھے۔ اور ان میں سے کوئی خوفزدہ نہیں تھا۔ ہم نے ان پگڈنڈیوں پر سفر شروع کر دیا اور بڑے تعجب کی بات تھی کہ تھوڑے سفر کے بعد شکائی کے چہرے سے بھی خوف دور ہونے لگا۔ اس نے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔

"نہ جانے کیوں ان پگڈنڈیوں کو منحوس قرار دے دیا گیا ہے۔ بظاہر تو کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی جسے خطرہ کا باعث کہا جائے۔"

ہم آگے بڑھتے رہے اور پہاڑیوں کی بلندیاں طے ہوتی رہیں۔ ہمیں ایک ایسا پہاڑ نظر آیا جس میں ایک غار کا دہانہ تھا۔ یہ غار انتہائی عجیب و غریب محسوس ہو رہا تھا کیونکہ دہانہ کی شکل انسانی شکل سے مشابہ تھی۔ عجیب و غریب صورت حال تھی اور یہی چیز تعجب کا باعث بن گئی۔ ورنہ غار تو راستہ میں بہت سے پڑے تھے۔

غار سے پھوٹنے والی روشنی نے مجھے متحیر کر دیا۔ میں سوچنے لگا کہ یہاں اس خطرناک جگہ کون رہتا ہے۔ انسان کا گزر تو یہاں مشکل سے ہی ہوتا ہے لیکن یہ تبت کا علاقہ تھا۔ تبت کے راہب اپنے مذہب کی پیروی کرتے ہوئے تارک الدنیا ہو جاتے تھے ممکن ہے کہ یہاں بھی کوئی ایسا ہی راہب زندگی کے دن گزار رہا ہو۔ بات مہم جوئی کی تھی اور دلچسپ چیزوں کو دیکھنے کا تجسس میرے ذہن میں ضرورت سے زیادہ تھا چنانچہ فیصلہ کر لیا کہ غار کے اندر جا کر دیکھوں گا پھر جب میں آگے بڑھا تو دفعتہ" ہمارے رہبر شکائی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"نہیں نہیں۔ میرے محترم دوست اس غار میں نہ جاو۔" وہ مضطربانہ انداز میں بولا۔ اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"کیوں شکائی! کیا بات ہے۔"؟

"میرے عظیم دوست! میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ غار اچھے نہیں ہیں اور ان میں داخل ہونے سے ہم کسی بھی مصیبت کا شکار ہو سکتے ہیں۔"

"اس احساس کی کوئی خاص وجہ ہے تمہارے ذہن میں۔" میں نے سوال کیا۔

"نہیں۔ لیکن لوگوں کا خیال ہے کہ پہاڑوں پر سفر کرنے والے آفات کی نشاندہی کے سلسلہ میں ضرورت سے زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ ہمارے ذہن ہمیں برفانی طوفانوں سے قبل از وقت آگاہ کر دیتے ہیں۔ چلتے چلتے ہمیں یہ احساس ہو جاتا ہے کہ آگے یقیناً کوئی ایسا گڑھا موجود ہے جو ہم سے ہماری زندگیاں چھین سکتا ہے اور ہم سب وہ راستے ترک کر دیتے ہیں۔ میرے محترم دوست اور میرے آقا! اس وقت بھی میرا ذہن یہی بتا رہا ہے کہ ضرور کسی نہ کسی جگہ ہم حادثہ کا شکار ہو جائیں گے۔"

"لیکن تمہاری بدقسمتی ہے شکائی کہ میرا تعلق ایک ایسے مذہب سے ہے جس میں توہمات کو اہمیت نہیں دیتے۔ نہ ہی میں تمہاری اس بات سے متفق ہوں۔ بہتر یہ ہے کہ سب باہر رکو میں تنہا اس غار میں جاؤں گا۔" میں نے کہا اور شکائی پریشانی سے مجھے دیکھنے لگا۔ شکائی کی باتوں سے میرے دوست ساتھی متاثر ہو گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بھی مجھے سمجھانے کی کوشش کی لیکن میں نے ان کی بات ٹال دی اور ان سے کہا۔

"دوستو! میں تمہیں اپنے ساتھ جانے پر مجبور نہیں کروں گا۔ میرا ان پہاڑوں پر آنے کا مقصد ہی یہی ہے کہ میں مکمل طور سے یہاں کی سیر و سیاحت کروں مجھے یقین ہے کہ غار کو اندر سے دیکھنے کے بعد بخیریت واپس آ جاؤں گا۔ چنانچہ تم کسی قسم کا تردد نہ کرو ان لوگوں کے سمجھانے کے باوجود میں نے ان میں سے کسی کی بات نہیں مانی اور میں اس غار کے دہانہ سے اندر داخل ہو گیا۔ وہ سب کئی کئی قدم پیچھے ہٹ گئے تھے۔ جیسے ان کا خیال ہو کہ جیسے ہی میں غار میں داخل

ہوں گا غار کے دہانے میں شعلے بھڑک اٹھیں گے لیکن مجھے کسی بات کی پرواہ نہیں تھی۔ روشن غار سے اندر داخل ہو کر میں نے چاروں طرف دیکھا غار زیادہ کشادہ نہیں تھا۔ لیکن اس کے آخری سرے پر ایک اور گول سوراخ نظر آ رہا تھا۔ روشنی دیوروں میں نصب مشعلوں کی تھی جو جل رہی تھی اور حیرت کی بات تھی کہ ان کے شعلے لرزاں نہیں تھے نہ جانے کس چیز سے بنائی گئی تھیں۔ اس چھوٹے سے غار میں ان شعلوں کے علاوہ اور کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ چنانچہ یہاں داخل ہونے سے اس غار کے بارے میں کچھ معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔ اور میں نے اس دوسرے سوراخ کی جانب رخ کیا اور جب اس دوسرے سوراخ سے اندر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ غار کا یہ دوسرا حصہ انتہائی وسیع و عریض ہے۔ اس کی قدرتی چھت تھی جو بیحد بلند تھی اور اس غار کی دیواروں میں بھی مشعلیں نصب تھی۔ غار کے عین درمیان سنگ موسیٰ سے بنا ہوا ایک مہیب مجسمہ تھا اور مجسمہ کے سینے کے عین درمیان کوئی چیز بجلی کے بلب کی طرف چمک رہی تھی۔ مجسمہ کا قد و قامت اور اس کی تراش بیحد حسین تھی۔ سوائے اس کے چہرے کے یہ چہرہ یقیناً خوفناک تھا اور مشعلوں کی روشنی میں ایسا ہی محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی عفریت منہ کھولے کھڑا ہو۔

لیکن سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ تھی کہ غار میں کوئی انسانی وجود موجود نہیں تھا۔ حالانکہ یہ مشعلیں کسی نہ کسی نے تو روشن کی ہوں گی۔ وہ کہاں ہے جو اس غار کا مکین ہے۔ میں غار کے ایک سرے سے دوسرے تک دیواروں کے کنارے کنارے چکر لگا آیا لیکن اس مجسمہ کے سوا اور کوئی چیز ان دونوں غاروں میں موجود نہیں تھی پھر میں نے ہمت کر کے مجسمہ کو قریب سے دیکھنے کا فیصلہ کیا اور اس کے سامنے پہنچ گیا۔

بلند و بالا مجسمہ کے قدموں میں تین سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ بلاشبہ اسے سنگ تراش کا ایک نایاب شاہکار کہا جا سکتا تھا۔ میں نے گلے میں لٹکا ہو کیمرہ اتارا اور اس کی کئی تصویریں لے ڈالیں۔

ہر رخ سے تصویریں لینے کے بعد میرا تجسس مجھے اسی کے نزدیک لے گیا۔

اب میں اس کے سینے میں چمکتی ہوئی روشنی دیکھنے کا خواہشمند تھا۔ اور جب آخری سیڑھی پر پہنچکر میں نے اسے قریب سے دیکھا تو میری آنکھیں چکا چوند ہو کر رہ گئیں۔ ایک حسین گڑیا اس مجسمہ کے سینے میں موجود تھی۔ میری جہاندیدہ نگاہیں اس بات کا بخوبی اندازہ لگا سکتی تھیں کہ یہ تین تراشے ہوئے ہیرے ہیں جنہیں جوڑ کر گڑیا کی شکل دی گئی ہے۔ اتنے بڑے بڑے ہیرے حاصل کرنے کا تصور بے حد مسرور انگیز تھا۔ میں نے اپنے طور پر ان کی قیمت کا تعین بھی کر لیا تھا۔

بلاشبہ میں ایک صاحب حیثیت آدمی تھا۔ زمیندار کا بیٹا۔شاید دولت کی ہوس کبھی پوری نہیں ہوتی۔ حالانکہ میری مہم جوئی کا شوق صرف تفریح کی حد تک تھا۔ میں نے دوسرے سیاحوں کی مانند خزانے حاصل کرنے کے خواب نہیں دیکھے تھے لیکن اگر خزانے خود چل کر کسی انسان تک پہنچ جائیں تو شاید چند ہی ایسے درویش صفت انسان ہوں گے جو انہیں نظرانداز کر دیں۔

چند لمحات کے لئے میں اس غار کے ماحول کو بھول گیا تھا اور میری نگاہوں میں صرف تین ہیرے تھے جنہیں خوبصورتی سے تراشا گیا تھا۔

گڑیا سیاہ مجسمہ کے سینے میں اس طرح رکھی ہوئی تھی جیسے کسی طاق میں کوئی چیز رکھدی جائے۔ میرا لرزتا ہوا ہاتھ اس کی جانب بڑھا۔ یہ میری پہنچ سے دور نہیں تھی اور میں نے گڑیا پتھر کے سینے سے نکال لی۔

ایک لمحہ کے لئے مجھے یوں لگا۔ جیسے پورے غار میں گڑگڑاہٹ ہونے لگی ہو۔ عجیب سی آوازیں میرے کانوں سے ٹکرائیں اور میرے قدم لرزنے لگے۔ میں سیڑھی سے گرتے گرتے بچا تھا۔ میں نے خود کو سنبھالا اور حیرت سے چاروں طرف دیکھا تب مجھے احساس ہوا کہ یہ صرف میرا وہم ہے۔

میں نے اس قیمتی گڑیا کو اپنے لباس کے اندرونی حصہ میں پوشیدہ کر لیا۔ میرا چہرہ فرط مسرت سے سرخ ہو رہا تھا۔ اتنی قیمتی اور نایاب شے میں یہاں سے لے جا رہا تھا' اس بات کا احساس میرے بدن کی لرزش بن گیا تھا۔

غار کا ماحول اب بھی اسی طرح پرسکون تھا۔ لیکن جوں جوں میں واپسی کے

ے قدم بڑھاتا گیا میں نے محسوس کیا کہ میرے عقب میں مشعلیں بجھ رہی ہیں اور
ب میں نے غار کے دہانے سے دوسری جانب قدم رکھا تو میرے عقب میں روشن
تاریک ہو گیا تھا۔ البتہ دوسرا حصہ بدستور روشن تھا۔ انتہائی حیرت کی بات یہ
ں کہ جوں جوں میرے قدم آگے بڑھ رہے تھے یہ مشعلیں خود بخود بجھتی جا رہی
یں۔

ایک لمحے کے لئے میرے ذہن پر خوف کا ہلکا سا تاثر ابھرا لیکن اس چھوٹے
ہانے کا فاصلہ طے کر کے میں غار کے بیرونی دہانہ سے باہر نکل آیا جہاں میرے
اتھی میرے منتظر تھے۔ مجھے مسرت کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ خاص طور سے شکائی
یرے نزدیک پہنچ گیا اور اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"آہ۔ میرے آقا۔ میرے دوست! تم خیریت سے ہونا۔"

"ہاں شکائی میں نے تم سے کہا تھا ناکہ میرا تعلق ایک ایسے مذہب سے ہے
توہم پر یقین نہیں رکھتا اور اس کے علاوہ غار میں کچھ بھی نہیں سوائے ایک سنگل
سمہ کے جو دیو قامت ہے البتہ چند چیزیں ایسی ہیں جو حیران کن رہیں۔"

"وہ کیا۔" میرے ایک ساتھی نے پوچھا۔

"غار میں مشعلیں روشن تھیں لیکن ان مشعلوں کو روشن کرنے والا کوئی
ظر نہیں آیا اور جب میں وہاں سے واپس پلٹا تو یہ مشعلیں خود بخود بجھ گئیں۔ تم دیکھ
و غار کا دہانہ تاریک ہو چکا ہے۔"

"ہاں۔ ہم نے دیکھا تھا اور ڈر گئے تھے۔ ہم تو تمہاری خیریت کی دعا مانگنے
لگے تھے کہ نہ جانے یہ کیا ہو گیا۔" میرے ساتھیوں نے کہا اور پھر شکائی نے آگے
بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"بس میرے آقا! اب یہاں سے آگے بڑھیں۔ نہ جانے کیوں مجھے اس
مقام سے وحشت ہو رہی ہے۔"

میں نے شکائی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ویسے بھی اب یہاں رکنا بے
مقصد تھا۔ چنانچہ ہم نے آگے کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ بلاشبہ مجھے قیمتی چیز حاصل

ہو چکی تھی۔ یہ میرے لئے اتنی زبردست اہمیت نہیں رکھتی تھی کہ میں فوری واپسی کا فیصلہ کر لیتا۔ ہم پہاڑ کی چوٹی تک پہنچے اور وہاں ہم نے اپنے نشانات چھوڑے میرے ساتھی اور میں بہت خوش تھا اور شکائی بھی بڑی حد تک مطمئن نظر آنے لگا تھا۔ حالانکہ اس کی اطلاع کے مطابق سیاح یا مہم جو اس راستے سے اوپر نہیں پہنچ سکے تھے اور انہیں درمیان ہی سے واپس جانا پڑا تھا لیکن ہم نے کامیابی سے اپنی منزل طے کی تھی۔ چند روز ہم یہاں رکے بے شمار تصاویر بنائی گئی تھیں اور اس کے بعد واپسی کا سفر بھی طے ہو گیا۔ میں نے واپسی کے لئے بھی اسی راستے کی تجویز پیش کی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں میرے ساتھی متفق نہ ہوئے اور ہم نے کسی حد تک دشوار گزار راستہ اختیار کیا گو مجھے اس راستے سے اختلاف تھا لیکن میں نے سوچا کہ کوئی حرج نہیں ہے اگر یہ لوگ اس راستے سے سفر کرنے پر بضد ہیں تو میں بھی ان کے ساتھ ہی چلوں گا اور اب ہم پہاڑ کی بلندیوں سے نیچے اتر رہے تھے۔

ہماری واپسی کے سفر کا تیسرا دن تھا۔ شام سے آسمان ابر آلود ہو گیا تھا اور شکائی نے آسمان کو دیکھتے ہوئے پیش گوئی کی تھی کہ شاید برفباری ہو جائے۔ اس نے کہا کہ اس علاقہ میں برفباری اس موسم میں نہیں ہوتی لیکن بے موسم اگر برفباری شروع ہو جائے تو پھر وہ بڑی تباہ کن ہوتی ہے اور کافی شدید بھی۔

شکائی کی بات کو ہم نے نظر انداز نہیں کیا اور برفباری سے بچنے کے انتظامات کرنے لگے لیکن برفباری سے پہلے جب تیز ہواؤں کے جھکڑوں نے ہمارا استقبال کیا تو ہم میں سے ہر شخص پریشان ہو گیا۔ جو بلندیاں ہم اتر رہے تھے ان میں سے بعض کے راستے اتنے خطرناک تھے کہ ہواؤں کے تیز جھکڑوں سے ہمارے قدم ذرا بھی لڑکھڑا جائیں تو زندگی کا تصور بھی محال ہو جائے۔ اس صورتحال سے ہم کافی خوفزدہ ہو گئے تھے اور جہاں تھے وہیں دبک کر رہ گئے تھے۔ بڑی بڑی چٹانیں موجود تھیں اور کہیں پر اگر مضبوطی سے جمے رہا جائے تو یہ سخت موسم ٹل سکتا تھا۔ چنانچہ چند لمحات میں یہ فیصلہ کر لیا گیا اور ہم نے وہیں پڑاؤ ڈال دیا۔ لیکن وہاں خیمے لگانے کا موقع کہاں تھا۔ ہوائیں تیز سے تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ اور تاریکی چھاتی گئی۔ پھر

ہواؤں کا زور ٹوٹا اور برفباری شروع ہو گئی۔ برفباری تھی کہ برف کا قہر، اتنی شدید برفباری کہ تصور بھی محال ہوا۔ برف کے انبار جگہ جگہ جمع ہوتے جا رہے تھے بہرصورت چونکہ ہوائیں چلنا تیز ہو گئی تھیں اس لئے کسی حد تک سکون تھا اور ہنگامی طور پر یہی طے کیا گیا کہ اس جگہ کو چھوڑ کر کسی ایسی مسطح چٹان کو تلاش کیا جائے جہاں خیمے نصب ہو سکیں ورنہ اس برف میں تو زندہ رہنا ممکن نہیں تھا۔

پوری پوری ہمت کرنے کے بعد ہم لوگ نیچے اترنے لگے لیکن شدید برفباری اور تاریکی کی بنا پر یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ کون کس جانب جا رہا ہے تاہم کسی مناسب جگہ کی تلاش بھی ضروری تھی۔ ورنہ موت تو دونوں ہی شکل میں نزدیک سے نزدیک تر نظر آ رہی تھی۔

میں جس جگہ سے نیچے اتر رہا تھا۔ وہ گھومتی ہوئی ایک چٹان کے گرد سے نیچے جا رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میرے ساتھی بھی میرے پیچھے پیچھے ہی ہوں گے یا اگر دوسری جانب سے بھی کوئی اگر نیچے اتر رہا ہے تو بہرصورت ہمارا فاصلہ زیادہ نہیں ہو گا۔ چنانچہ میں خاموشی سے اترتا رہا اور ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جو کافی وسیع تھی اور جہاں چار چھ خیمے لگائے جا سکتے تھے اتنی ہی جگہ درکار تھی کیونکہ صرف وقت گزارنے کا مسئلہ تھا۔ میں نے پلٹ کر اپنے ساتھیوں کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ تب میں نے حلق پھاڑ پھاڑ کر انہیں آوازیں دیں لیکن مجھے خود بھی احساس تھا کہ میری یہ آوازیں چند فٹ سے زیادہ دور نہیں جا رہی ہوں گی۔ برفباری کا شور اتنا زیادہ تھا کہ آواز ہی گھٹ رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس چٹان پر میرے سوا اور کوئی موجود نہ ہو۔ وہ لوگ نہ جانے کس طرف اتر گئے تھے۔ کہیں ان میں سے کچھ حادثہ کا شکار نہ ہو جائیں لیکن بھلا اس موسم میں میں ان کے لئے کیا کر سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ ان کی زندگی کی دعا کروں اور اپنی زندگی کی دعا کروں اور اپنی زندگی بچانے کی فکر۔

چنانچہ ایک محفوظ سی جگہ میں نے اپنا خیمہ لگایا اور میں دبک گیا۔ میں سخت پریشان تھا۔ ویسے میں نے لیمپ جلا کر نیچے دروازے کے سامنے رکھدی تھی تاکہ

دوسرا کوئی شخص وہاں پہنچے تو اس روشنی کی مدد سے کوئی سمت اختیار کرے۔

برفباری بدستور جاری تھی۔ میں انتظار کرتا رہا کہ میرا کوئی ساتھی وہاں پہنچ جائے لیکن بے سود۔ اس طرف کوئی نہیں آیا البتہ تقریباً دو گھنٹوں کے بعد میں نے ویسی ہی روشنی تھوڑی دور دیکھی جیسی میں نے اپنے خیمے میں روشن کی تھی۔ اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اس کا مقصد ہے کہ کوئی یہاں تک پہنچ گیا۔ نہ جانے کیوں اس نے میری جانب آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ممکن ہے وہ بہت زیادہ خوفزدہ ہو۔ چنانچہ میں خود ہی اسکی طرف بڑھ گیا۔

برفباری میں سمت اور راستہ کا تعین خاصا مشکل کام تھا لیکن میں گیس سے ٹٹولتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور چند ساعتوں کے بعد اس بوسیدہ سے خیمہ کے قریب پہنچ گیا جس سے روشنی باہر آ رہی تھی لیکن دوسرے لمحے مجھے احساس ہوا کہ یہ خیمہ میرے کسی ساتھی کا نہیں ہے کیونکہ میں ان خیموں کو باآسانی پہچان سکتا تھا جو ہم لوگ اپنے ساتھ لائے تھے۔

بڑا ہی تعجب ہوا تھا۔ کیونکہ اس سفر کے دوران ہم نے کسی اور مہم جو یا سیاح کو نہیں دیکھا تھا اور سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی اور بھی پہاڑوں کی بلندیاں طے کر رہا ہے۔ بہرحال جو کوئی بھی تھا انسان تو ہے اور پھر وہ کس طرح یہاں تک آیا۔ یہ تجسس مجھے خیمے میں داخل ہونے سے نہ روک سکا۔ میں اندر پہنچا تو میری نگاہ ایک شخص پر پڑی جو کسی جانور کی کھال بچھائے۔ پالتی مارے ہاتھ جوڑے بیٹھا تھا اوپری برہنہ بدن اور گنجے سر سے مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ کوئی بدھ بھکشو ہے۔ کوئی ایسا تارک الدنیا جس نے شاید دنیا کو چھوڑ کر یہ ویران پہاڑی آباد کر لی ہے سکی آنکھیں بند تھیں اور خیمے میں جلتی ہوئی روشنی میں وہ نمایاں نظر آ رہا تھا۔ وکھا ہوا بدن جس کی ایک ایک پسلی گنی جا سکتی تھی گلے میں پڑی ہوئی بڑے بڑے منکوں کی مالا۔ بڑی بڑی جٹائیں عجیب سا چہرہ تھا۔

میں دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا اور اب میں سوچ رہا تھا کہ میں اسے کس طرح مخاطب کروں۔ تھوڑی دیر اسی طرح گزر گئی۔ میں نے گہری سانس لی اور چند

قدم آگے بڑھ گیا۔ پھر میں زور سے کھنکارا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ عجیب آنکھیں تھیں۔ اس کی۔ ویران اور بھیانک۔ وہ مجھے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہوس۔" وہ کھرکھراتی ہوئی آواز میں بولا۔

"کون ہو تم۔"؟ میں نے سوال کیا۔

"روشنی۔"!

"بدھ مذہب سے تعلق رکھتے ہو۔"؟

"ہاں۔" وہ انسان تھا۔ اس نے انگلی اٹھا کر کہا۔

"یہاں کیا کر رہے ہو۔"؟

"روشنی جلائے بیٹھا ہوں۔ جانے کسے راستہ دکھانے کی ضرورت پیش آ جائے۔" وہ درویشانہ انداز میں بولا۔

"دن کے وقت کیا کرتے ہو۔"؟

"روشنی دکھاتا ہوں۔"

"تمہاری باتیں اپنی سمجھ میں نہیں آتیں۔ میں جا رہا ہوں۔ میں تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ ممکن ہے میرا کوئی ساتھی۔"

"رک جاؤ۔ میں تمہارا ساتھی ہوں۔"

"تب صاف زبان میں گفتگو کرو مجھے بتاؤ تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ اور کب سے یہاں ہو۔"

"صاف زبان میں سننا چاہتے ہو تو تمہارے کام کی ایک ہی بات بتاؤں گا۔"

"چلو وہی بتاؤ۔"

"کسی کی چیز ہر ایک کے لئے نہیں ہوتی۔"

"کیا مطلب۔"؟

"تم نے جرم کیا ہے۔"

"خوب۔ کونسا جرم۔"؟

"ستیانا نے عظیم تپسیا کی تھی تب اس کی ہیروں جیسی محبوبہ مجسم ہو کر اس کے پاس پہنچ گئی اور اس نے اسے سینے میں سجا لیا۔ اس نے دعا کی تھی کہ وہ ہوس کا پجاری نہیں ہے۔ بس اتنا موقع مل جائے کہ وہ اپنی محبوبہ کو دل میں سمو لے۔ تب اس سے یہ پوچھا گیا کہ یہ کیسے ممکن ہے اور وہ کیا چاہتا ہے تو اس نے اپنا مقصد بتا دیا اور مورنا اس کے سینے میں سما گئی۔ ہاں وہ جو تمہارے لباس میں پوشیدہ ہے کسی کا دل ہے۔"

"کہاں کی اڑا رہے ہو۔" میں نے پریشان ہو کر کہا۔

"میری آنکھیں تمہارے اندر جھانک رہی ہیں۔"

"لیکن تمہاری بکواس میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

"وہ جو تم نے سیاہ مجسمے کے سینے سے نکالا ہے تمہاری ملکیت نہیں ہے۔ ستیانا کی کہانی طویل ہے مختصر سن لو۔ اس نے ساری زندگی مورنا کو چاہا لیکن ہیروں جیسی مورنا سیاہ ستیانا کے لئے نہیں تھی۔ کسی نے اسے پسند نہیں کیا لیکن وہ جو اس کے لئے آہیں بھرتے بھرتے جوان ہوا اس کے حصول کے لئے سب کچھ چھوڑنے کو تیار تھا۔ سو اس نے دعا کی کہ مورنا اسے مل جائے فوری اس سے زندگی چھین لی جائے ہیروں جیسی مورنا اسے مل گئی۔ لیکن وہ سنگ میں بدل گیا تھا اور مورنا وہ بھی اس میں سما گئی تھی۔ تم نے ستیانا کی زندگی چرائی ہے۔ نوجوان۔"

"اوہ۔ تمہاری آنکھیں بہت دور تک دیکھتی ہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں۔ میری آنکھیں بہت دور تک دیکھ رہی ہیں۔ میری مانو تو اسے واپس ستیانا کے سینے میں سجا دو۔"

"فضول بکواس ہے۔"

"میں کمزور ہوں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ کر بھی نہیں سکتا۔ لیکن تمہیں مشورہ ضرور دوں گا۔"

"دو۔"! میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ستیانا کی امانت اسے واپس کر دو۔ ستیانا نحوستوں کا بت ہے۔ تم اگر اس کا دل نکال لے گئے تو وہ تمہیں چین سے نہ رہنے دیگا یہ ہیرے کی گڑیا تمہارے لئے نحوست کی دیوی بن جائے گی۔ ستیانا کے علاوہ یہ جس کے پاس ہو گی وہ سکون سے نہ رہ سکے گا۔ اس لئے اسے واپس کر دو۔ اسے واپس کر دو۔"

"مجھے حیرت تو ہوئی تھی۔ اس بوڑھے تبتی کو اس بارے میں کس طرح معلوم ہوا۔ جبکہ اس بارے میں کسی کو نہیں معلوم تھا۔ لیکن میں اتنے کچے ذہن کا مالک نہیں تھا کہ ان توہمات کی باتوں سے متاثر ہو جاؤں' جو چیز مجھے مل گئی تھی۔ وہ بیحد قیمتی تھی اور میں کسی قیمت پر اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ باقی رہی ستیانا وغیرہ کی بات' تو وہ پتھر کا مجسمہ میرا کیا بگاڑ سکتا ہے' میں نے سوچا اور پھر میں اس بوڑھے راہب کے پاس سے واپس چلا آیا' چلتے چلتے اس کی آواز میرے کانوں میں گونجی تھی۔

"نحوست کی دیوی ستیانا کے علاوہ جس کے پاس رہے گی اس پر نحوستیں نازل ہوتی رہیں گی۔ اس بات کو یاد رکھنا۔ لیکن میں نے کوئی بات یاد رکھنا پسند نہیں کی اور واپس اپنے خیمے میں آ گیا۔ اب مجھے اپنے ساتھیوں کی فکر تھی۔ نجانے وہ لوگ کہاں کہاں بھٹک رہے ہوں گے اور برف کے اس طوفان نے نجانے ان کے ساتھ کیا حشر کیا ہو۔ بہرصورت یہ رات تو گزارنا ہی تھی۔

میں کافی رات تک سو نہیں سکا' رات کے نجانے کونسے حصے میں نیند آئی اور میں سو گیا۔ جب جاگا تو برف باری رک چکی تھی اور مطلع صاف تھا۔ مجھے سب سے پہلے اپنے ساتھیوں کی تلاش ہوئی میں نے جلدی سے خیمہ وغیرہ لپٹا فولڈنگ خیمہ تھا' بالکل جدید طرز کا بنا ہوا' میں نے اسے اپنی پشت پر باندھا اور پھر اطمینان کے ساتھ چٹان کے اس سرے تک آ گیا یہاں سے نیچے اترا جا سکتا تھا۔

"وہ پوری دن مجھے تنہا نیچے اترنے میں گزارنا پڑا۔ پھر رات ہو گئی لیکن پورا دن گزرنے کے بعد بھی میرے کسی ساتھی کا پتہ نہیں تھا۔ البتہ دوسرے دن صبح جب میں نیچے اتر رہا تھا تو میں نے اپنے سے کچھ فاصلے پر چند افراد کو نیچے اترتے

ہوئے دیکھا یہ میرے ساتھی ہی تھے۔ اس وقت انہیں مخاطب کرنا مناسب نہیں تھا۔ ہاں جس سمت ہم سب جا رہے تھے' وہاں ایک جگہ ایسی تھی جہاں ہم سب جمع ہو سکتے تھے اور وہاں پہنچکر میں رک گیا۔ میرے ساتھی مجھ سے پیچھے رہ گئے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی یہاں تک پہنچ گئے اور مجھے دیکھ کر بیحد خوش ہوئے۔

ہم لوگ ایک دوسرے کا حال دریافت کرتے رہے' میرے ساتھیوں کو بھی برف باری میں خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ بہرحال ان میں سے کوئی زخمی یا ہلاک نہیں ہوا تھا اور یہ خوشی کی بات تھی۔

ہیروں کی یہ قیمتی گڑیا میرے پاس تھی اور میں نے سوچا تھا کہ اسے اپنے نوادرات میں شامل کر لوں گا۔ ظاہر ہے اسے فروخت کر کے دولت حاصل کرنے کی خواہش تو میرے ذہن کے کسی گوشے میں نہیں تھی' کبھی کبھی بوڑھے راہب کی خوفناک باتوں کا خیال بھی آ جاتا تھا لیکن ان باتوں کی پرواہ کون کرتا' میں نے ان پر توجہ نہیں دی تھی۔

ایک طویل عرصے کے بعد میں اپنے وطن میں داخل ہوا' میرا علاقہ ایک مخصوص حد سے شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ جب میں اس کی سرحد تک پہنچا تو میری ملاقات چند افراد سے ہوئی اور یہ لوگ میرے ہی خواہ تھے۔

میرا ایک دوست سردار تارا سنگھ میرے نزدیک پہنچ گیا اور اس نے افسوسناک انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "آہ کیا تمہیں کچھ بھی نہیں معلوم۔"

"کیسے ہو تارا سنگھ' کیا حال چال ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"میرے دوست میرے حال چال تو ٹھیک ہیں' لیکن تم۔ تم ایک طویل عرصہ کے بعد وطن واپس آئے ہو نا۔"

"ہاں کیوں کیا بات ہے۔"

"افسوس میں بدنصیب ہی تمہیں یہ اطلاع دینے کو رہ گیا تھا' کیا تمہیں معلوم ہے۔"

"ہاں کچھ سنا تھا' مگر میں ایسی باتوں پر توجہ کہاں دیتا ہوں۔" "افسوس وہ

تنازعہ ایک بھیانک شکل اختیار کر گیا۔ تارا سنگھ نے کہا اور میں نے اس کا شانہ جھنجھوڑ دیا۔

"کیا کہہ رہے ہو تارا سنگھ' جلدی سے کہو' تم صاف صاف کیوں نہیں کہتے۔"

"میرے دوست' گلاب خان اور اس کے ساتھیوں نے تمہاری حویلی پر حملہ کیا تھا۔ انتہائی خونریز تصادم ہوا' گلاب خان کے دو بھائی مارے گئے اور تمہارے تینوں بھائی بھی ہلاک ہو گئے۔ حویلی حکومت کی تحویل میں چلی گئی ہے۔ بہت عرصے سے تمہاری تلاش کی جا رہی تھی لیکن تمہارے بارے میں کوئی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی۔ گلاب خان غصے سے دیوانہ ہو گیا ہے اور اب وہ تمہاری تلاش میں ہے۔"

"اوہ کیا بکواس کر رہے ہو تارا سنگھ۔"

"میں نے کہا نا میں ہی بدنصیب تمہیں یہ کہانی سنانے کو رہ گیا تھا۔" تارا سنگھ نے غمزدہ لہجے میں کہا۔

میں نے آج تک گھریلو امور پر کوئی توجہ نہیں دی تھی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ مجھے اپنے بھائیوں سے محبت ہی نہیں تھی۔

تارا سنگھ نے جو کچھ بتایا اس نے میری دنیا اندھیر کر دی۔ میرا بھرا گھر مٹ گیا تھا اور اب میں اپنے ہی وطن میں اجنبی بن گیا تھا۔ تارا سنگھ نے مجھے بہت تسلیاں دیں اور مشورہ دیا کہ میں ابھی اپنے گھر جانے کی کوشش نہ کروں۔ سب کچھ تباہ ہو گیا تھا۔ میرا دل ٹوٹ گیا تھا۔ یوں بھی میں لڑنے بھڑنے والا جذباتی آدمی نہیں تھا۔ میں گلاب خان کے خلاف کیا کاروائی کرتا۔

چنانچہ بددل ہو کر میں نے وہ علاقہ چھوڑ دیا۔ اور ایک دوسرے شہر آ گیا۔ میری مالی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ جگہ جگہ مارے مارے پھرنے کے بعد میری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہ رہی۔ کسی کام دھندے کی عادت ہی نہیں تھی۔ کیا کرتا فاقوں تک نوبت پہنچ گئی۔

تب ایک دن اس قیمتی گڑیا کا خیال آیا۔ سوچا تھا اسے اپنے نوادرات میں

شامل کروں گا لیکن اب تو کچھ بھی نہیں رہا تھا اب اس کا بھی کیا کروں گا۔ لیکن اس دن پہلی بار ایک اور خیال میرے ذہن میں آیا اور یہ خیال بوڑھے راہب کی پیشن گوئی تھی۔

اس کی پیشن گوئی کے مطابق یہ گڑیا نحوست کی دیوی تھی اور میرا خاندان تباہ ہو چکا تھا۔

کیا یہ اس کی نحوست ہے۔؟ اور میرے ذہن میں خوف ابھر آیا۔ اگر یہ بات ہے تو مجھے اس سے پیچھا چھڑانا چاہیئے اور بہتر یہ ہے کہ میں اسے فروخت کر دوں۔ چنانچہ میں نے نوادرات کی ایک دوکان کا رخ کیا۔ دوکان کا مالک ایک خبیث سی شخصیت کا مالک تھا۔

"تمہارے پاس یہ کہاں سے آئی۔"؟ اس نے میری ظاہری حالت دیکھتے ہوئے کہا۔

"کہیں سے بھی آئی ہو۔"

"اوہ۔ ممکن ہے یہ چوری کی ہو۔ ہم ایسے خطرے مول نہیں لیتے اگر تم اس کی رسید اس کی تاریخ بتا دو تو میں تمہیں اس کے تین لاکھ روپے ادا کر سکتا ہوں۔ دوسری صورت میں اگر اسے خریدنے کا خطرہ مول لینا بھی پڑا تو میں تمہیں صرف پچاس ہزار روپے دوں گا۔"

"مجھے منظور ہے۔" میں نے کہا اور اس نے مجھے پچاس ہزار روپے ادا کر دایئے۔ اس بڑی رقم نے میری حالت سنوار دی تھی۔ میں نے رہنے کے لئے یہ چھوٹا سا مکان بھی خرید لیا اور چھوٹے سے کاروبار کی بنیاد بھی ڈال دی۔

اور یہ اس کے بعد چھ ماہ کے عرصہ کی بات ہے۔ ایک دن ایک فقیر میری دوکان پر آیا اور اس نے میرے آگے ہاتھ پھیلا دیا۔ میں نے اسے منع کیا کہ اچانک اس نے لپک کر میرا گریبان پکڑ لیا۔

"تو۔ تجھے تو میں ماروں گا۔ میں تجھے ختم کر دوں گا۔ بمشکل میں نے اس سے پیچھا چھڑایا۔ اور اسے پہچان لیا۔ نوادرات کی دوکان کا مالک وہی شخص تھا جسے

میں نے گڑیا فروخت کی تھی۔

گڑیا نکال کر اس نے میرے منہ پر دے ماری۔ میرے پاس اب اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جس دن سے یہ تم نے مجھے دی ہے میری زندگی برباد ہو گئی۔ میرا کاروبار تباہ ہوا۔ گھر میں آگ لگ گئی میں ایک رات بھی سکون سے نہیں سو سکا۔ ایک آواز میرے کانوں میں گونجتی رہتی تھی۔

"یہ ستیانا کی امانت ہے۔ اسے ستیانا کو واپس کر دو۔ اب میں کیا جانوں کون ستیانا ہے۔ میں نے کئی بار اسے گڑ میں ڈالا سمندر میں پھینکا لیکن اس نے میرا پیچھا نہ چھوڑا یہ ہر رات میرے سرہانے ملتی تھی۔ پھر میں نے تمہاری تلاش میں زمین و آسمان ایک کر دیئے۔ یہاں تک کہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گیا اور بھیک مانگنے تک نوبت آگئی۔ یہ گڑیا لے لو۔ میری رقم واپس کر دو۔ ورنہ میں۔ میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔"

میری دوکان جم چکی تھی۔ پندرہ ہزار روپے میرے پاس موجود تھے۔ چنانچہ دوکان اور نقد رقم دیکر میں نے اس سے جان چھڑائی لیکن منحوس گڑیا اب میرے پاس تھی۔ اور میری زندگی میں پھر خوف پیدا ہو گیا تھا۔

اور۔ آج تک میں اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکا۔ اب میں دل کا مریض بن گیا ہوں اور میری زندگی جو ہے تمہارے سامنے ہے۔"

محسن تعجب بھری نگاہوں سے بوڑھے کو دیکھ رہا تھا۔ یہ عجیب و غریب کہانی اس کو ہضم نہیں ہوئی تھی۔

"تو تمہاری الجھنوں کیوجہ یہ گڑیا ہے۔"؟

"ہاں میرے دوست۔"!

"تم نے اسے ضائع کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"کئی بار۔"

"اور یہ ہمیشہ تمہارے پاس پہنچ گئی۔"

"ہاں۔ کاش کوئی مجھے اس سے بچالے۔"

"تمہاری مالی حالت بھی خراب ہوگی۔"؟

"ہاں۔ میں انتہائی تکلیف کی زندگی گزار رہا ہوں۔"

"تب تم یہ گڑیا میرے ہاتھ فروخت کر دو۔ میں خود بھی اس کی نحوست سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔"

"آہ نہیں۔ اس طرح نہ سوچو۔ میری طرف سے تم اسے یونہی لے جاؤ۔ لیکن تم اس کی نحوستوں سے آگاہ ہو۔" بوڑھے نے کہا۔

"تمہاری اجازت سے' محسن نے گڑیا اپنی جیب میں رکھ لی اور پھر اس نے ساری جیبیں بوڑھے کے سامنے خالی کر دیں۔ جو کچھ تھا اسے پیش کر دیا اور کہا کہ اگر یہ کم ہو تو وہ کچھ اور رقم بھجوا دے گا۔"

"نہیں میرے دوست' مجھ پر سے بس اس کی نحوست ختم ہو جائے۔ اس کے بعد میں خود بہتر زندگی گزار سکتا ہوں۔" بوڑھے نے کہا اور محسن اس سے رخصت ہو کر اپنے گھر چلا آیا۔

"ریتا کا تصور تو اب ذہن سے نکل ہی گیا تھا' رات اتنی گزر چکی تھی کہ اب کسی شریف آدمی کے ہاں جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی رہائش گاہ کا رخ کیا اور دیر تک اس گڑیا کے بارے میں سوچتا ہوا سو گیا۔

گڑیا اس نے حاصل تو کر لی تھی لیکن اس نے ذہن میں کوئی پروگرام نہیں تھا کہ اس کا کیا کرے گا' ہاں یہ طے شدہ بات تھی کہ وہ ایک قیمتی چیز تھی اور اگر صحیح معنوں میں اس کی قیمت وصول کی جائے تو ایک اچھی خاصی رقم مل سکتی تھی۔

دوسرے دن صبح جاگنے کے بعد بھی وہ دیر تک گڑیا کے بارے میں سوچتا رہا اور پھر اس کے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔

یہ گڑیا بقول بوڑھے کے کسی ستیانا کا دل ہے اور اس کی محبوبہ ہے' لیکن اگر اس محبوبہ کو ہی فنا کر دیا جائے تو کیا حرج ہے' کیوں نہ یہ تینوں ھیرے الگ الگ کر دیئے جائیں۔ جو نہ جانے کس مصالحے سے جوڑے گئے ہیں۔ اس طرح اس کی نحوست کا اثر ہی ختم ہو جائے گا۔"

دل ہی دل میں یہ سوچ کر وہ مسکرا پڑا۔ ابھی اسے ناشتہ کئے ہوئے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ریتا اس کے پاس پہنچ گئی۔

ریتا پہلی بار محسن کے گھر آئی تھی' محسن اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

"او ہو ریتا تم۔"

"ہاں محسن۔ بس دل چاہا تھا کہ تم سے ملاقات کر لی جائے' کل بھی میں تم سے نہ مل سکی۔"

"ہاں۔ اور کل کا دن میرے لئے خوشی کا دن رہا۔"

"کیوں۔"؟

"تمہارے نہ ملنے کی بناء پر"۔ محسن نے جواب دیا۔

"اوہ۔ ریتا مسکرا پڑی بہر صورت میں آ گئی ہوں' اب بتاؤ پروگرام کیا ہے۔"؟

"بس پروگرام یہ ہے دن بھر ساتھ رہیں گے۔ اور پورا دن سیر و تفریح میں گزار دیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" ریتا نے جواب دیا۔

ایک لمحے کے لئے محسن کے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ کیوں نا ریتا کو اس گڑیا کے بارے میں بتا دیا جائے۔ لیکن ریتا عورت تھی' ممکن ہے یہ بات دوسرے لوگوں میں بھی پھیل جائے اور محسن خواہ مخواہ الجھنوں کا شکار ہو جائے' اس نے گڑیا کے بارے میں سوچتے ہوئے بہت ساری باتیں سوچی تھیں۔ یہ بھی خیال اس کے ذہن میں تھا کہ اگر ان ھیروں کو الگ الگ کر کے مختلف جگہوں پر فروخت کر دیا جائے تو ان کی اتنی رقم مل سکتی ہے کہ اس کی مالی حالت بہتر ہو جائے' چنانچہ ریتا کو اس بارے میں بتانا غیر مناسب ہی تھا۔

تیار ہونے کے بعد وہ باہر نکل آئے اور پھر شہر کے مختلف تفریحی مقامات کی سیر کرتے رہے' دوپہر کا کھانا انہوں نے ایک ہوٹل میں کھایا اور اس کے بعد شام ہو گئی۔

شام کو محسن دیر تک ریتا کے ساتھ رہا اور جب رات ہو گئی تو ان دونوں نے رخصت ہونے کا فیصلہ کیا۔

"تم مجھے میری رہائش گاہ پر چھوڑ دو محسن۔ کل ہماری ملاقات کس وقت ہوگی۔"؟

"جس وقت تم پسند کرو ریتا' ویسے میرا خیال ہے کہ کل شام کو فیروزن میں ہی ملیں گے۔"

"ٹھیک ہے' ریتا نے کہا اور محسن نے اپنی کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی' یہ وہ تیز رفتار ڈرائیونگ کا عادی نہیں تھا لیکن آج نجانے اس کے ذہن میں کیا سمائی کہ اس نے کار کی رفتار خاصی تیز کر دی ریتا نے ایک دو بار اسے ٹوکا بھی لیکن اسنے مسکراتے ہوئے گردن ہلا دی۔ گڑیا اس کے کوٹ کی جیب میں محفوظ تھی۔

ایک جگہ سامنے سے کراسنگ پر ایک ٹرک گزرتا ہوا نظر آیا اور محسن نے بریک پر پاؤں رکھ دیئے لیکن دوسرے لمحے اس کے بدن میں خون کی گرم لہر دوڑ گئی۔ بریک فیل ہو چکے تھے۔ محسن نے پوری قوت سے کار کو ایک طرف کاٹا اور کار ایک درخت سے جا ٹکرائی وہی سائڈ درخت سے ٹکرائی تھی جس طرف محسن بیٹھا ہوا تھا۔ ریتا کو بھی ہلکے ہلکے زخم آئے لیکن محسن کا بھیجہ پاش پاش ہو چکا تھا' محسن نے آخری ہچکی لی اور دم توڑ دیا۔ ریتا پوری طرح ہوش و حواس میں تھی لیکن اس کے اوسان خطا ہو رہے تھے' اس نے محسن کو دیکھا اور اسے چکر آگیا۔

مضبوط دل کی لڑکی تھی' بمشکل تمام باہر نکلی' لیکن دفعتاً اسے احساس ہوا کہ کار میں ایک روشنی سی پھیل گئی ہے اور اس نے اس روشن چیز کو دیکھا انوکھی گڑیا اس کے سامنے پڑی ہوئی تھی۔ جو محسن کی جیب سے نکل کر باہر گر پڑی تھی۔

ریتا نے صرف ایک لمحے کے لئے اسے دیکھا ریتا زمانہ شناس لڑکی تھی اور سوسائٹی میں کافی گھوم پھر چکی تھی' ایک دم اسے احساس ہوا کہ یہ انتہائی قیمتی چیز ہے۔ چنانچہ گڑیا دوسرے لمحے اس کے پرس میں چلی گئی۔

قرب و جوار کے لوگ اس طرف دوڑ چکے تھے' ان لوگوں نے محسن کو باہر نکالنے کی کوشش کی لیکن نہیں نکال سکے۔ اس دوران پولیس پہنچ گئی اور ضروری کاروائیاں ہونے لگیں۔ لیکن محسن اس نحوست کا شکار ہو گیا۔ بوڑھے کا انتباہ درست ثابت ہوا تھا۔!

پولیس ضروری کاروائی کر رہی تھی۔ ریتا کے بیانات لئے گئے گو ریتا بھی زخمی ہو گئی تھی لیکن اتنی نہیں کہ اسے ہسپتال میں رہنا پڑتا۔ اور پھر اس نے بھی ہسپتال سے نکل آنے ہیں عافیت سمجھی کیونکہ وہاں وہ گڑیا کو سنبھال نہیں سکتی تھی۔ وہ گھر آگئی لیکن ہیروں کا یہ قیمتی کھلونا اس کے لئے عذاب بن گیا تھا۔

میں اس کا کیا کروں۔ ایسی نایاب چیز میں کس طرح سنبھال سکتی ہوں۔ بہتر یہی ہے کہ میں اسے فروخت کر دوں۔ لیکن کہا اور ریتا خیالات میں ڈوبی رہی اس کے ذہن میں ایک حسین تصور ابھر آیا۔

لیکن وہ رات اس کے لئے ایک بھیانک رات ثابت ہوئی۔ آج آسمان ابر آلود تھا۔ رات کو بوندا باندی بھی شروع ہو گئی۔ ریتا کو بجلی کی چمک سے بچپن ہی سے خوف محسوس ہوتا تھا۔

اس وقت رات کے تقریباً دو بجے تھے خوفناک کڑک سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور کوئی اس کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

"کون ہے۔" ریتا نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"دروازہ کھولو مالکن۔ اس کی ملازمہ کی آواز ابھری اور ریتا نے سکون کی سانس لی۔ اس وقت ملازمہ کے آنے سے اسے سکون محسوس ہوا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

دوسرے لمحے اس کے منہ سے وحشت زدہ چیخ ابھری۔ وہ ملازمہ تو نہیں تھی۔ ایک بوڑھا آدمی تھا۔ ننگ دھڑنگ۔ نہایت مختصر لباس میں ملبوس اس کے گلے میں مالیں پڑی تھیں۔

وہ اطمینان سے ریتا کے سینہ پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے اسے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

"کون۔ کون ہو تم۔" نہ جانے یہ آواز اس کے حلق سے کیسے نکل گئی۔

"سنیاسی ہیں ہم دنیا کا روگ نہیں رکھتے۔ تم انجان ہو۔ اس لئے تمہیں کچھ بتانے آگئے ہیں۔" بوڑھے نے بھاری آواز میں کہا۔

"لیکن اس وقت تمہارا اس طرح یہاں آنا مجھے ۔ مجھے تمہاری نیت اچھی معلوم نہیں ہوتی۔" ریتا نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا اور بوڑھے نے پلٹ کر دروازہ بند کر لیا تھا۔

"ڈرو نہیں لڑکی! اگر تم انجان نہ ہوتیں' اور ناواقف نہ ہوتیں تو مجھے کیا پڑی تھی کہ تمہیں کچھ بتانے آ جاتا۔ میں تو ایک طویل سفر طے کر کے تمہارے پاس آیا ہوں اور جو کچھ تمہیں بتا رہا ہوں تمہارے بھلے کے لئے ہے۔ تفصیل میں نہ جاؤ۔ تم میری مانو۔ تمہارے اس شہر کے ایک محل میں ایک بوڑھا شخص رہتا ہے۔ میں تمہیں اس کے مکان کا پورا پتہ بتائے دیتا ہوں۔ وہ گڑیا جو تمہارے دوست سے ملی ہے لیکر اس بوڑھے کے پاس چلی جاؤ۔ اسے بتاؤ کہ وہ مر گیا جس کو اس نے یہ گڑیا دی تھی اور اس سے کہو کہ اسے آخری بار ہدایت کی جا رہی ہے کہ ستیانا کی امانت اس کے پاس پہنچا دے۔ اگر اس نے اب بھی ایسا نہ کیا تو پھر وہ اپنی زندگی کا بدترین عذاب اٹھانے کے لئے تیار ہو جائے۔

"کونسی امانت۔؟ کیسی گڑیا؟ تم کس کی بات کر رہے ہو۔" ریتا نے پریشان لہجہ میں کہا۔ ویسے دل ہی دل میں وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ کونسی گڑیا کی بات ہو رہی ہے۔

"وہی چمکدار اور ہیروں کی گڑیا۔ تم نہیں جانتی لڑکی کہ وہ درحقیقت کیا ہے۔ کیا تمہارا دوست محسن اس قابل تھا کہ اس کے پاس کوئی اتنی قیمتی شے ہوتی۔"

"تم یہ ساری باتیں کس طرح جانتے ہو۔"؟ ریتا نے متحیرانہ لہجے میں سوال کیا۔

"جو کچھ میں جانتا ہوں وہ میرے لئے بہت ضروری تھا اور جو تمہیں بتایا جا رہا ہے وہ تمہارے لئے بیحد ضروری ہے۔ اگر تم نے میری بات پر عمل نہ کیا تو پھر نتیجہ کی ذمہ دار خود ہوگی۔"

"کیسا نتیجہ؟ تم کیا بکواس کر رہے ہو' فوراً میرے کمرے سے نکل جاؤ ورنہ میں شور مچا دوں گی۔ میں پولیس کو بلا کر تمہیں اس کے حوالے کر دوں گی' تمہارا بہت برا حشر ہوگا' تم کیا سمجھتے ہو مجھے۔" ریتا بگڑ کر بولی اور بوڑھے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"وہ جو موت اور تباہی کو خود دعوت دیتے ہیں تمہاری مانند ہوتے ہیں میں تو صرف اس لئے آگیا تھا کہ تم انجان ہو تم آنے والے اس برے وقت سے ناواقف ہو جو اس گڑیا کی وجہ سے تمہاری تقدیر میں لکھا جا چکا ہے۔ ستیانا ان میں سے کسی کو نہ چھوڑے گا۔ جو اپنے قبضہ میں اسے رکھنے کی کوشش کریں گے۔ میں واپس جا رہا ہوں۔ اگر تم کوئی مصیبت محسوس کرو تو پھر میری ہدایت پر عمل کرنا۔ آگے تمہاری مرضی۔" بوڑھا واپس پلٹا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

ریتا کی حالت غیر ہو رہی تھی اس کی بدن پسینہ میں ڈوب گیا تھا۔ باہر بجلی کڑک رہی تھی اور بادلوں کی گرج سے کان پھٹے جا رہے تھے۔ چند ساعت تو ریتا اپنی جگہ کھڑی کانپتی رہی۔ اس کے بعد باہر نکل آئی۔ دور دور تک اس خبیث بوڑھے کا وجود نہیں تھا۔ وہ کس طرح اندر آیا کون تھا اور اسے ساری باتیں کیونکر معلوم تھیں۔ ان تمام سوالوں کا جواب ریتا کے پاس موجود نہیں تھا لیکن اس کے الفاظ ریتا کی ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ ضرور پیدا کر رہے تھے۔ آخر وہ کون تھا' صورت سے عجیب لگتا تھا۔ خدوخال بھی مقامی نہیں تھے یہ کہاں کا رہنے والا ہو سکتا ہے۔ ریتا سوچنے لگی اور اس کے ذہن میں ایک نام ابھر آیا۔ تبت ہاں اس طرف کے باشندے ہی ایسے چہروں والے ہوتے ہیں۔

گو ریتا کو ان لوگوں کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھی لیکن پھر بھی وہ اس شخص کے خدوخال سے پہچان گئی۔ گڑیا اس کی نگاہوں میں کچھ اور پراسرار ہو گئی تھی۔

اگر محسن اس کی وجہ سے مارا گیا ہے تو پھر یہ ایک خطرناک چیز ہے لیکن اس کے ساتھ قیمتی بھی۔ اس سلسلہ میں کیا کیا جائے کیا کسی کو راز دار بنایا جائے وہ سوچتی رہی تھوڑی دیر تک تو اس کے حواس قابو میں نہیں آئے تھے لیکن اس کے بعد وہ دروازہ بند کر کے پھر اپنی مسہری پر جا لیٹی۔

یہ تو بڑی مصیبت کی بات ہے۔ اگر یہ قیمتی شے اتنی پر اسرار ہے تو اس کی زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ پھر میں کیا کروں کیا۔ صبح اس شخص کو تلاش کر کے بوڑھے کی ہدایت کے مطابق یہ گڑیا اس کے حوالہ کر دوں۔ حالانکہ دل نہیں چاہتا تھا لیکن ریتا دیر تک کشمکش کا شکار رہی۔ نہیں، نہیں میں اسے کسی کو نہیں دوں گی جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا۔ وہ عجیب سے انداز میں بولی اور اسی وقت ایک گہری سانس کی آواز اس کے کانوں میں ابھری۔

"تم اسے اپنا نہیں سکتیں۔ یہ میرا دل ہے۔ یہ میری محبوب ہے۔ اگر تم نے اس کے بارے میں اس انداز میں سوچا تو کل صبح تم اس دنیا میں نہ رہو گی۔" یہ آواز بڑی غیر مانوس اور بگڑی بگڑی سی تھی۔ لہجہ گو ٹوٹا پھوٹا تھا لیکن زبان مقامی ہی تھی جسے ریتا بخوبی سمجھ سکتی تھی۔ وہ چیخ مار کر اٹھ گئی اور متوحش نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ تاریک سناٹوں کے علاوہ اور کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ تبھی اچانک اس کی مسہری کے نیچے سے وہی آواز پھر سے ابھری۔ صبح ہونے پر اسے بوڑھے کے حوالے کر آو۔ صبح ہونے پر اس بوڑھے کو واپس کر دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو کل رات اس دنیا میں نہ گزار سکو گی اور پھر یہ آوازیں ساری رات ریتا کے کانوں میں گونجتی رہیں۔ وہ پاگل ہو جانے کی حد تک خوفزدہ ہو گئی تھی۔ سورج کی پہلی کرن نے اس کے حواس واپس کئے۔ اس وقت اس کی ملازمہ اس کے کمرہ میں آئی تھی۔

"ارے ریتا بی بی! یہ آپ کی کیا حالت ہو رہی تھی۔"؟ ملازمہ نے پوچھا اور اس نے خوفزدہ نگاہوں سے اسے دیکھا پھر گہری گہری سانسیں لینے لگی۔

"میرے لئے جلدی سے چائے بنا کر لاؤ۔" اس نے بھاری لہجے میں کہا۔

"ابھی لائی بی بی مگر یہ آپ کو ہوا کیا۔"؟

"میں کہتی ہوں چائے بنا کر لاؤ۔ فضول باتوں سے پرہیز کرو۔" ریتا بگڑے ہوئے لہجے میں بولی۔ اور ملازمہ جلدی سے باہر نکل گئی۔

ریتا کی حالت اب بھی درست نہیں تھی۔ وہ اپنے حواس پر قابو پانے میں مصروف تھی۔ ویسے اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس منحوس چیز کو اپنے پاس نہیں رکھے گی چائے وغیرہ پینے کے بعد اس نے غسل کیا اور جلدی جلدی تیاریاں کرنے لگی۔

بعض اوقات قیمتی چیزیں کتنی بڑی مصیبت بن جاتی ہیں۔ وہ سوچ رہی تھی۔ بہرصورت اس کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ اب اس آواز کو اور اس بوڑھے کی آواز کو نظر انداز کر دے۔ یہ ایک رات تھی جو اس پر قیامت کی رات بنکر گزری تھی۔ اس مکان کو تلاش کرنے میں بھی اسے کوئی خاص وقت نہیں ہوئی جس کا پتہ لگانے میں مشکل پیش نہیں آئی کہ اس گڑیا کے پیچھے ضرور کوئی اسرار ہے ۔ تڑپتے دل کے ساتھ اس نے مکان کے دروازے پر دستک دی۔ جو شخص دروازہ کھول کر باہر آیا مقامی تھا ایک مفلوک الحال اور مدقوق سا بوڑھا آدمی۔ اس نے جھنجلائی ہوئی نگاہ سے ریتا کو دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر استقبالیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"آؤ بیٹی! کون ہو۔؟ مجھ سے کوئی کام ہے۔"؟ اس نے سوال کیا۔

"میں اندر آجاؤں۔"؟ ریتا نے پوچھا۔

"ہاں ہاں آؤ۔ آؤ کیا بات ہے۔"؟ بوڑھا پیچھے ہٹ کر بولا اور ریتا اندر داخل ہو گئی۔ اس نے خود ہی پلٹ کر دروازہ بند کر دیا تھا۔ بوڑھا حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا پھر جب وہ اس کی جانب پلٹی تو بوڑھے کے ہونٹوں پر پھر وہی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"آؤ بیٹی اندر آ جاؤ۔ کہو کیا بات ہے۔ میں تمہیں نہیں پہچانتا اور شاید پہلی بار میں نے تمہیں دیکھا ہے۔"

"ہاں میں بھی نہیں جانتی بابا لیکن ایک مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہوں۔" ریتا نے کہا۔

"کیسی مصیبت ۔ کیا ہوا تمہیں"؟ بوڑھے نے پوچھا۔

"آپ محسن نامی کسی شخص کو جانتے ہیں۔"

"محسن' ہاں میرے محسن نے اپنا نام شاید محسن ہی بتایا تھا۔ کیوں کیا ہوا اس کو۔"؟ بوڑھے نے سوال کیا اور ریتا نے گڑیا نکال کر اس کے سامنے کر دی۔ اس کا رد عمل حیرت ناک ہوا تھا۔ گڑیا پر نظر پڑتے ہی بوڑھا کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی آنکھیں فرط حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ اس کے دل میں خوف ابھر آیا۔ جسے ریتا نے صاف محسوس کیا۔ یہ بات بھی اس کے لئے پریشان کن تھی۔ بوڑھا دیر تک اس کیفیت کا شکار رہا پھر اس نے بھر آئی آواز میں پوچھا۔

"آہ ۔ یہ تمہارے پاس کہاں سے آگئی۔ بتاؤ یہ تمہیں کہاں سے ملی۔"؟

"کیا تم اسے پہچانتے ہو۔"؟ ریتا نے پوچھا۔

"ہاں تم پہچاننے کی بات کر رہی ہو۔ یہ میری زندگی کا سب سے بڑا عذاب ہے مجھے بتاؤ بیٹی کہ یہ تمہیں کہاں سے مل گئی۔"

"وہ شخص جس کے پاس یہ گڑیا تھی ایک حادثہ کا شکار ہو گیا ہے۔ اس کا نام محسن تھا اور وہ میرا دوست تھا۔ یہ گڑیا مجھے اسی کے لباس سے ملی۔" ریتا نے بتایا اور بوڑھے کی آنکھیں کچھ اور دھندلا گئیں۔

"میں نے اس سے کہا تھا کہ اسے نہ لے جائے مگر افسوس وہ نہیں مانا۔" حادثہ نے اسے کوئی خاص نقصان تو نہیں پہنچایا۔"

"میں نے کہا نہ بابا۔ وہ موت کا شکار ہو گیا۔" ریتا نے کہا اور بوڑھا رونے لگا۔

"'مر گیا' مر گیا نہ آخر' افسوس اس نے میری بات نہیں مانی لیکن اب تم میرے پاس کیوں آئی ہو۔"؟

"یہ گڑیا میرے پاس تھی لیکن رات کو میں بھی خوفناک حالات کا شکار رہی

ہوں۔ مجھ سے پراسرار آوازوں نے کہا کہ میں اسے تمہارے پاس پہنچا دوں۔ میں
ذ تمہارا پتہ بھی نہیں جانتی تھی اس سے پہلے میں نے تمہیں کبھی نہیں دیکھا نہ ہی
مجھے تمہارے بارے میں کچھ معلوم تھا۔ مجھے ہدایت دی گئی کہ میں اسے تمہارے
پاس لے آؤں اور میں اسے یہاں لے آئی۔ اب تم یہ سنبھالو' اور ریتا نے یہ گڑیا
س کے سامنے رکھ دی اور بوڑھا بلک بلک کر رونے لگا۔

"آہ! میری مصیبت' میری موت مجھ تک پہنچ گئی۔ کاش! میں اس سے پیچھا چھڑا سکتا۔"

"یہ کیا ہے بابا! مجھے اس کے بارے میں کچھ بتاؤ گے۔"

"جاؤ جاؤ لڑکی۔ پاگلوں جیسی گفتگو مت کرو۔ تم اس کے بارے میں جان کر
کروں گی۔ میں اب کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ جاؤ اسے میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ یہ
بت میں خود ہی لایا تھا اور اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ اسے واپس
ں تک پہنچاؤں۔ نہ ہی میری مالی حالت ایسی ہے اور نہ ہی میرے جسم میں اب
سکت ہے کہ میں پھر کوئی مہم لے کر پہاڑوں پر جاؤں۔ وہ جیسے خود سے بول رہا
اور پھر اس نے تیاریاں کیں اور دوسرے لمحے وہ اپنے مکان سے باہر تھا۔

پولیس افسر نے حیران کن نگاہوں سے اس بوڑھے شخص کو دیکھا اور پھر
ں نے اپنے سامنے میز پر رکھی ہوئی اس گڑیا کو جو بوڑھے کے بیان کے مطابق
نی ہیروں سے بنی ہوئی تھی چند ساعت وہ بوڑھے کو دیکھتا رہا۔ بوڑھا اپنی مختصری
انی سنا چکا تھا تب پھر پولیس افسر نے گڑیا اٹھا کر نزدیک سے اسے دیکھا اور اس کے
ں میں لالچ آگیا۔

"تو تم چاہتے ہو کہ اسے وہیں واپس پہنچا دیا جائے جہاں سے تم نے اسے
سل کیا تھا۔"

"ہاں میں یہی چاہتا ہوں۔" بوڑھا نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے لیکن سرکاری طور پر تمہیں اس سلسلہ میں خاصا دو چار ہونا
ے گا۔ میں ذمہ داری لیتا ہوں کہ میں اسے واپس اسی جگہ پہنچا دوں گا لیکن
ف ایک شرط پر اور شرط یہ ہے کہ تم اس کا تذکرہ کسی سے نہیں کرو گے۔

پولیس کے روزنامچہ میں اس کی تفصیل نہیں ہوگی۔ تمہارا مقصد تو پورا ہو جاتا ہے

بوڑھا چند ساعت سوچتا رہا اور پھر بولا۔ "لیکن اسے میرے پاس واپس نہیں آنا چاہیے۔"

"گویا تم اس بات سے خوفزدہ ہو کہ گڑیا حسب معمول تمہارے پاس واپس پہنچ جائے گی۔" پولیس افسر نے پوچھا۔

"ہاں میرے دوست! مجھے اس وقت تک اطمینان نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اسے اس غار میں واپس نہ پہنچا دوں تا پھر میں خود قبر کی گہرائیوں میں نہ اتر جاؤں۔" بوڑھے نے غمزدہ لہجے میں کہا۔

"بڑے میاں یہ میرا وعدہ ہے کہ گڑیا کسی قیمت پر تمہارے پاس نہیں پہنچے گی اور تمہیں قبر میں اترنے کی ضرورت نہیں ہے ویسے تم مرنا چاہتے ہو تو مرجاؤ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اس گڑیا کو میرے حوالے کرنے کے بعد تم نے اس کا تذکرہ کیا تو اچھا نہ ہوگا۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں کسی کو اس کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔" بوڑھے نے کہا۔

"بس ٹھیک ہے پھر تو اطمینان سے واپس جاؤ اور عیش کی زندگی گزارو۔ اور اگر تم اس مجسمہ سے خوفزدہ ہو تو اس کا ذمہ دار میں ہوں۔ یعنی یوں سمجھا جائے کہ اب یہ میری ملکیت ہے اور تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے میرا خیال ہے کہ یہ اس کے بعد تمہارے پاس نہیں پہنچے گی۔" پولیس افسر نے ہنس کر کہا۔ بوڑھا اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ حالانکہ اس کے دل کو اب بھی سکون نہیں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یقیناً ایک نہ ایک دن یہ گڑیا پھر اس کے پاس واپس پہنچ جائے گی۔ یہی آج تک ہوا تھا۔ بہرحال وہ وہاں سے چلا آیا۔

پولیس افسر کو اس کی قیمت کا اندازہ تھا۔ وہ توہم پرست انسان نہیں تھا نہ ہی اس مفلوک الحال بوڑھے کی مانند احمق جو اتنی قیمتی شے اس طرح اس

وہ نہایت احتیاط سے اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ لیکن اس کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔

آنکھوں میں مستقبل کے حسین خواب لہرانے لگے تھے۔ گڑیا کی قیمت اتنی مل سکتی ہے کہ وہ ایک حسین زندگی گزار سکتا۔ لیکن اسے یہاں فروخت کرنا حماقت تھی کسی دوسرے ملک میں اس کی قیمت مناسب مل سکتی تھی۔

مثلاً ہانگ کانگ۔ جہاں ایسی چیزوں کی خرید و فروخت میں آسانی ہوتی ہے اور اس کی زیادہ چھان بین بھی نہیں ہوتی چند لمحوں میں پولیس افسر ہانگ کانگ کا پروگرام بنا چکا تھا۔ اس کا پاسپورٹ وغیرہ تیار تھا اور اس نے چھٹی کی درخواست دی ہوئی تھی۔

لیکن اب صورت حال مختلف تھی اب تو اسے فوری کاروائی کرنی تھی۔ گڑیا اس نے نہایت احتیاط سے پوشیدہ کر دی تھی اور اپنی تیاریوں میں مصروف ہو گیا تھا۔ یہ تیاریاں اس نے نہایت تیزی سے مکمل کیں اور ہانگ کانگ روانہ ہو گیا۔ گڑیا کو نکال لے جانا ایک مجرمانہ کاروائی تھی۔ لیکن ایک پولیس افسر ہونے کی حیثیت سے وہ جانتا تھا کہ ایسے کام کس طرح کئے جاتے ہیں۔

چنانچہ وہ کامیابی سے ہانگ کانگ پہنچ گیا۔ ہانگ کانگ کے ایک خوبصورت ہوٹل میں قیام کرنے کے بعد اس نے ہانگ کانگ کی سیر شروع کر دی۔ لیکن اس وقت مسئلہ تفریح نہیں تھا۔ وہ گڑیا کی فروخت کے لئے کوئی مناسب پارٹی چاہتا تھا۔ بازار سے اس نے ایک کیمرہ خریدا اور واپس آ کر گڑیا کی کئی تصویریں بنائیں۔ اس کے بعد وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس نے ایک کام کے آدمی کا انتخاب کر لیا۔ اس کا نام اسفورا تھا۔ پہلے اس نے پوری طرح اسفورا کی شخصیت کا جائزہ لیا۔ تین چار ملاقاتوں کے بعد اس نے اپنے دل کی بات کہنے کا فیصلہ کر لیا۔

"میرا اندازہ غلط نہیں ہے اسفورا۔ تو تم اسمگلنگ کرتے ہو" ایک شام اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہاں تو ہر تیسرا آدمی اسمگلنگ کرتا ہے مسٹر۔" اسفورا نے بھی مسکراتے

"میں تم سے ایک خاص بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"کہو۔ کیا بات ہے۔"؟

"کیا یہاں ہیروں کی فروخت کا کوئی بڑا مرکز ہے۔"

"یہاں کیا نہیں ہے۔ لیکن..." اسفورا اسے غور سے دیکھتا ہوا بولا۔

"ہاں تمہارا خیال درست ہے۔ میرے پاس ایک نایاب چیز ہے اور اسے فروخت کرنا چاہتا ہوں۔

"کوئی ہیرا۔"

"ہاں یہی سمجھو۔"

"کتنی مالیت کا ہوگا۔"

"بے اندازہ۔ یہ اس کی تصویر ہے۔ دیکھو" پولیس افسر نے تصویر نکال کر اسفورا کے سامنے رکھدی۔

"اتنے بڑے بڑے ہیرے۔ لیکن کیا یہ جڑے ہوئے ہیں۔"

"ہاں۔"؟

"بے داغ ہیں۔"

"مکمل طور پر۔"

"قسم کیا ہے۔"

"اس بارے میں نہیں جانتا۔ لیکن اس کی قیمت سے واقف ہوں۔" پولیس افسر نے کہا۔

"کچھ اور اعتبار کر سکتے ہو۔"؟ اسفورا نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں نہیں سمجھا۔"؟

"مجھے دکھا دو۔ اور اعتبار کر میری ذات سے تمہیں نقصان نہیں پہنچے گا۔" اسفورا نے پر خلوص لہجے میں کہا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے اسفورا۔ لیکن تم اسے کیوں دیکھنا چاہتے ہو۔ کیا تصویر سے کام نہیں چل سکتا۔"؟ پولیس افسر نے کسی قدر ہچکچاہٹ سے کہا۔

"یہ بات نہیں ہے میرے دوست۔ لیکن میں پندرہ سال تک ہیروں کی رت کرتا رہا ہوں اور مجھے ان کی قیمت کا تعین کرنے میں دقت نہیں ہوتی۔"

"اوہ۔ یہ بات ہے۔"

"ہاں۔ مجھے وہ نایاب شے دکھاؤ۔"

"میں لاتا ہوں۔" پولیس افسر نے کہا اور پھر اس نے وہ گڑیا اپنے سامان ، نکال کر اسفورا کے سامنے رکھدی۔ اسفورا نے اسے ہاتھ میں اٹھا کر دیکھا اور راس کی آنکھیں متحیرانہ انداز میں پھیل گئیں۔

پولیس افسر غور سے اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ تب اسفورا نے گہری سانس لے کر اسے واپس کر دیا۔ "تم نے اس کی قیمت کا اندازہ لگایا۔"؟

"تمہارا کیا خیال ہے۔"؟ پولیس افسر نے پوچھا۔

"ایسے نہیں۔ ہمیں آپس میں سودا کرنا چاہیئے۔ اگر میں اسے تمہاری پسند لی قیمت پر فروخت کرا دوں تو مجھے کیا کمیشن دو گے۔"؟

"تم بتاؤ۔" پولیس افسر نے کہا۔

"دو فیصد۔ نہایت ایمانداری سے۔"

"منظور ہے۔"

"اگر تم اس کی قیمت کا تعین کر سکتے ہو تو بتاؤ۔"

"تمہارے خیال میں کیا قیمت مل جائے گی اس کی۔"؟

"میں تمہیں اس کے پانچ لاکھ پونڈ خود ادا کر سکتا ہوں۔ تین دن کے اندر ندر۔ لیکن اگر تمہیں یہ رقم منظور نہ ہو تو پھر ہمیں ایک سفر کرنا ہوگا۔"

"سفر۔؟ کہاں کا؟"

"مسٹرا نکلیس اس کی مناسب قیمت ادا کر سکیں گے۔ پوری دنیا میں ہیروں کا کاروبار ان سے بڑا کسی کا نہیں ہے۔"

"سکیانگ کے نواح میں ایک بستی ڈائمنڈ سٹی کے نام سے آباد ہے یہ بستی مسٹرا نکلیس نے بسائی ہے۔"

"اوہ۔ تو ہمیں سنکیانگ کا سفر کرنا ہوگا۔"

"ہاں۔"

"لیکن اس کا بندوبست۔"

"اسی دو پرسنٹ میں شامل ہوگا۔"

"تمہارے خیال میں اس کی کیا قیمت مل سکتی ہے۔"

"کم از کم تیس لاکھ پونڈ سے پچاس لاکھ پونڈ تک۔ اور دو فیصد کے لحاظ سے میرا کام بھی اچھا خاصا بن جاتا ہے۔"

"اوہ۔ اگر یہ بات ہے اسفورا تو میں تیار ہوں۔ تم تیاریاں کرو۔ اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ اسے بہترین قیمت پر فروخت کراؤ۔"

اور اسفورا سے بات مکمل ہو گئی۔ پولیس افسر کی خوشیوں کی انتہا نہیں رہی تھی۔ اس کے خیال میں اس کی تقدیر نے ایک خوشگوار کروٹ بدلی تھی۔ اور پوری زندگی کی سختیوں کا ازالہ ہونے والا تھا۔ گڑیا کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم سے وہ کسی بھی مغربی ملک میں جا کر نئی زندگی کا آغاز کر سکتا تھا۔

نہ جانے کیسے کیسے خواب اس کی آنکھوں میں لہرا رہے تھے ۔ اس کا دوست اسفورا اپنی تیاریوں میں مصروف تھا۔ تیسرے دن اس نے پولیس افسر سے ملاقات کی۔

"ہمیں یہاں سے کیسنگ جانا ہوگا۔ کیسنگ سے سجاو اور پھر ہم سنکیانگ میں داخل ہوں گے۔ میں نے سفر کے پورے انتظامات مکمل کر لئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے اسفورا۔ اب تو جو کچھ کرنا ہے تمہیں ہی کرنا ہے۔"

"میں بھی بے غرض انسان نہیں ہوں۔ اس قیمت کا دو فیصد بھی زندگی کا اہم اثاثہ بن سکتا ہے۔" اسفورا نے ہنس کر کہا۔

"کیوں نہیں۔ میں تمہیں تمہارا حق ادا کر کے مبارکباد بھی پیش کروں گا۔"

"جس کے لئے میں پیشگی شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

تیسرے دن انہوں نے اپنے سفر کا آغاز کر دیا ہانگ کانگ سے دریائے کیسنگ پار کر کے وہ سنکیانگ پہنچے اور سنکیانگ سے سجاو کا سفر شروع ہو گیا۔ سجاو میں تین دن تک قیام کرنا پڑے گا۔ پولیس افسر کسی اندرونی اضطراب کا شکار تھا۔

"یہاں قیام اتنا طویل کیوں ہو گیا اسفورا۔"

"ہمیں سنکیانگ جانے کی بجائے سیدھا ڈائمنڈ سٹی جانا ہے۔" اسفورا نے کہا۔

"ٹھیک ہے پھر۔"؟

"حکومت کی طرف سے ڈائمنڈ سٹی کے سفر پر کچھ پابندیاں ہیں۔ میں ان ذمہ داریوں سے بچنا چاہتا ہوں اور میں نے اس سفر کے لئے ہیلی کاپڑ کا بندوبست کیا ہے۔"

"اوہ۔ پولیس افسر نے گردن ہلائی۔ "تم کافی تگ و دو کر رہے ہو اور تمہارے ہاتھ بھی لمبے ہیں۔"

"میں اپنے پیشے سے مخلص ہوں مسٹر۔" اسفورا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ بہرحال یہاں سے سفر کی تیاریاں بھی مکمل ہو گئیں اور ایک ہیلی کاپڑ انہیں لے کر چل پڑا۔ ہیلی کاپڑ میں پائلٹ اسفورا اور پولیس افسر کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

تاحد نگاہ عظیم پہاڑی سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔ ایک مخصوص علاقے سے پرواز کرتے ہوئے اچانک اسفورا نے پستول نکال کر پولیس افسر کی کمر پر رکھ دیا۔

"بس مسٹر کھیل ختم ہو گیا۔ گڑیا نکالو۔ اور پولیس افسر کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔

"کک۔ کیا مطلب۔"؟

"میں نے کہا تھا نا کہ میں اپنے پیشے سے مخلص ہوں۔ اتنی قیمتی شے میں میں دوسرے کا حصہ پسند نہیں کرتا۔" اسفورا نے کہا۔

"گویا تم دھوکہ دہی کرنا چاہتے ہو۔"

"جلدی کرو۔ وقت کم ہے۔"

غلط فہمی کے شکار ہو اسفورا کیا تمہارے خیال میں' میں اتنا ہی کمزور ہوں۔ میرا تعلق پولیس سے ہے۔" پولیس افسر نے کہا اور پلٹ کر اسفورا کے پستول پر ہاتھ ڈال دیا۔ اسفورا اس سے لپٹ پڑا۔

اسفورا میری مدد کی ضرورت تو نہیں ہے۔" ہیلی کوپڑ کے پائلٹ نے گردن گھما کر پوچھا۔

"اوہ۔ نہیں۔ میں ابھی اسے ٹھیک کئے دیتا ہوں۔" اسفورا اس سے پستول والا ہاتھ چھڑانے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ لیکن پولیس افسر اس کی توقع سے زیادہ طاقتور تھا۔ وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔

اور اسی کشمکش میں اچانک گولی چل گئی۔ نشانہ پائلٹ بنا تھا اس کی طویل چیخ ہیلی کاپڑ میں گونج اٹھی۔ اور دونوں لڑنے والے ایک لمحے کے لئے سن ہو گئے! اچانک ہیلی کاپڑ کو ایک زبردست جھٹکا لگا اور دونوں لڑھک کر ایک طرف جا گرے۔ لیکن دونوں کی کشمکش اب بھی جاری تھی۔

"ہیلی کاپڑ تباہ ہونے والا ہے اپنی جان.." اسفورا نے کہنا چاہا لیکن اسی وقت ایک خوفناک جھٹکا لگا اور اسفورا کی زبان کٹ کر باہر نکل آئی۔

اور چند ساعت کے بعد ہیلی کاپڑ ایک بلند پہاڑ سے جا ٹکرایا اور اس کے پرخچے اڑ گئے۔ اس کا ملبہ نیچے گرنے لگا۔ اور۔ جہاں پولیس افسر کی لاش گری تھی وہاں ایک غار کا دہانہ تھا۔ ایک ایسا غار جس کا دہانہ انسانی سر سے مشابہہ تھا۔ گڑیا اس کے کوٹ کی جیب سے نکل کر غار کے دہانے پر جا پڑی تھی۔

تب عجیب سی شکل و صورت والے راہب نے اسے اٹھایا اور غار کے اندر بنے ہوئے دوسرے غار کی جانب چل پڑا۔ سیاہ مجسمہ اپنی ہیبت ناک شکل صورت کے ساتھ موجود تھا۔ بوڑھے نے اس کی سیڑھیاں طے کیں اور مجسمہ ا کے سینے میں سجا دیا۔

"تیری محبت عظیم ہے ستیانا۔ فراق کی گھڑیاں محبوب کے وصال کی امید بڑھاتی ہیں۔ وہ واپس آ گئی۔ تو نے اس کے لئے زندگی تیاگ دی۔ بھلا کس کی مجا ہے کہ وہ اسے تجھ سے دور رکھ سکے۔!

بوڑھا آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترا۔ اور غار کے دہانے کے باہر نکل بجھی ہوئی مشعلیں پھر سے روشن ہو گئی تھیں۔